اجملِ اعظم

انتظار حسین

اجملِ اعظم

اِنتظار حسین

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

ترتیب

پیش لفظ

اس سرگزشت کی اپنی ایک سرگزشت ہے۔ جب حکیم محمد نبی خاں نے، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، مجھے ایک دن یاد کیا اور فرمائش کی کہ حکیم اجمل خاں کی سوانح مرتب کیجئے تو میں سخت سٹپٹایا۔

"ویسے میرے لیئے یہ بہت شرف کی بات ہے۔ مگر میں یہ کام کر بھی سکوں گا۔" میں نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"کیوں نہیں کر سکیں گے آپ"۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "اچھا میں تھوڑا اپنا جائزہ لے لوں کہ یہ کام میں انجام دے بھی سکتا ہوں۔"

"ہاں سوچ لیجئے۔ بہرحال یہ کام آپ کو کرنا ہے۔

میں دبدبے میں پڑ گیا۔ اسی رو میں میں مولانا ابوالخیر مودودی کی خدمت میں پہنچا اور ان سے فریادی لہجہ میں کہا کہ "حکیم صاحب نے تو مجھے بہت آزمائش میں ڈال دیا ہے۔"

"وہ کیا ہے۔"

"انہوں نے مجھ سے حکیم اجمل خاں کی سوانح مرتب کرنے کے لیئے کہا ہے۔ یہ کام تو کسی مورخ اور محقق کے کرنے کا تھا۔ تاریخ اور تحقیق میرا میدان نہیں ہے۔"

اصل میں میں مولانا کو اس راہ پر لانا چاہتا تھا کہ وہ حکیم صاحب کو سمجھائیں کہ یہ افسانہ لکھنے والا آدمی ہے۔ سوانح جس نوعیت کا کام ہے وہ اس کا اہل نہیں ہے۔"

مگر پتہ چلا کہ مولانا کو اس تجویز کا پہلے سے علم ہے اور وہ اس پر صاد کر چکے ہیں۔ یہاں شغف نظر آتا ہے۔ وہ تہذیب جس کا نمونہ دلی تھی۔"

"جی وہ تو ہے۔"

مولانا نے تامل کیا۔ پھر کہنے لگے کسی قدر افسوس کے لہجہ میں "اس تہذیب کے بارے میں اب کون قلم اٹھائے گا اور کون بتائے گا وہ تہذیب کیا تھی اور اس نے کیسی کیسی شخصیتیں پیدا کیں۔"

ان کے یہ کہنے سے میرے اندر ایک کوندا سا لپکا اور ایک رستہ دکھائی دیا۔ مجھے خیال آیا کہ حکیم صاحب کے سوانح نگاروں نے یا تو انہیں ایک بڑے حکیم کے طور پر پیش کیا ہے یا کانگریس اور خلافت کے ایک معتبر رہنما کے طور پر۔ اصلی اور بنیادی بات پر تو کسی نے دھیان ہی نہیں دیا۔ اصلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ یہ شخصیت ایک تہذیب کی پیداوار تھی اور شاید شخصیت کی حد تک اس تہذیب کا آخری بڑا مظہر۔ اب میرا جی چاہنے لگا کہ مجھے اس شخصیت کو اس پس منظر میں جاننے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ پھر بھی میں ڈانوا ڈول تھا۔ میں نے بالکل بچوں کی طرح مولانا سے پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے۔ میں یہ سوانح لکھ سکوں گا۔"

"آپ بالکل لکھ سکیں گے۔"

"آپ میری رہنمائی کی ذمہ داری لیتے ہیں۔"

مسکرائے۔ بولے "آپ شروع تو کیجئے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی مولانا ابوالخیر علم کا دریا تھے۔ اور پھر بزرگوں میں سے اب شاید وہی ایک رہ گئے تھے جن سے دلی کی تہذیب اور روایات کے بارے میں رجوع کیا جا سکتا تھا۔ ان کی طرف سے ہمت افزائی ہوئی تو مجھ میں حوصلہ پیدا ہوا۔ حکیم صاحب کی خدمت میں جا کر اپنے ارادے سے انہیں آگاہ کیا اور مطلوبہ مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔

مناسب مدت کے بعد جب حکیم صاحب نے خیریت پوچھی تو میں نے ان سے دو تقاضے کئے۔ ایک میں نے ان سے یہ گزارش کی کہ میں ابھی شاید تھوڑا وقت اور لوں گا۔ مجھے اس وقت کا انتظار ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آمدورفت کا

بند سلسلہ شروع ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ دلی جا کر چند دن میں بلی ماراں کی خاک چھانوں اور آپ کی شریف منزل میں جا کر مہمان رہوں۔ پھر دیکھوں کہ وہ در و دیوار اور وہ گلی کوچے مجھ سے کیا کہتے ہیں۔ مگر حکیم صاحب کو یقین نہیں تھا کہ آمدورفت کا سلسلہ جلدی شروع ہو جائے گا اور لمبا انتظار وہ کھینچنا نہیں چاہتے تھے۔

دوسری گزارش میں نے یہ کی کہ حکیم صاحب نے پیچھے جو رقعے پرزے روزنامچے، یادداشتیں جو کچھ بھی چھوڑا ہے اس کا تھوڑا دیدار کرائیے۔ پتہ چلا کہ ان میں سے زیادہ کاغذات جو سوانح کے سلسلہ میں کام آ سکتے تھے ضائع ہو گئے۔ کیسے ضائع ہو گئے۔ جو کہانی انہوں نے سنائی وہ افسوس ناک ہے۔ حکیم جمیل خاں مرحوم نے کاغذات کا ایک پورا پلندا قاضی عبدالغفار کے سپرد کر دیا تھا جو دلی میں بیٹھ کر سوانح قلم بند کرنے کا منصوبہ رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لیئے کرائے پر ایک مکان لے کر بھی انہیں دیا گیا تھا کہ وہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنا کام کریں۔ قاضی صاحب کی اسی دوران حیدر آباد میں ایک مصروفیت نکل آئی۔ مکان کو تالا لگا کر وہ حیدر آباد چلے گئے۔ پیچھے برسات آئی۔ اس میں یہ مکان ڈھے گیا اور سارے کاغذات غارت ہو گئے۔

اَب میں نے تیسری صورت سامنے رکھی کہ خاندانِ شریفی کی بڑی بوڑھیوں سے میری ملاقات کا بندوبست کرائیے۔ خود حکیم نبی خاں سے لمبی لمبی ملاقاتیں کر کے حکیم صاحب کے طور اطوار کے بارے میں پوچھا گچھا۔ ان سے پتہ حاصل کر کے اور سفارش لے کر کراچی پہنچا۔ میں بیٹھک میں بیٹھا۔ پردے کے ادھر بڑی بی بیٹھیں۔ میں نے پوچھا۔ انہوں نے حکیم صاحب کے اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے کے بارے میں، عزیز و اقربا کے ساتھ سلوک کی بارے میں باتیں بتائیں۔ اصل میں میں تو اس طریقہ سے سوچ رہا تھا کہ حکیم اجمل خان صرف وہ تو نہیں تھے جو شریفی مسند پہ بیٹھے مطب کر رہے تھے نہ صرف اتنے تھے جتنے خلافت تحریک میں اور کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسوں میں نظر آتے تھے یا جامعہ ملیہ اور طبیہ کالج میں دیکھے جاتے تھے۔ اپنی نجی زندگی میں گھر کے اندر خاندان کے بیچ اس شخص کا طور کیا تھا، اس کا تو پتہ چلنا چاہیئے۔ وہ باتیں بظاہر چھوٹی موٹی اور بے وقعت سہی مگر اصلی آدمی کا پتہ بسا اوقات ایسی باتوں سے بھی چلتا ہے۔

میں نے دادا کو نہیں، پوتے کو البتہ دیکھا۔ زیادہ نہیں تھوڑا تھوڑا۔ مگر کیا پوتے کو دیکھ کر داد کا پتہ پایا جا سکتا ہے۔ اس باب میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ بہرحال ایک بات تو دادا پوتے میں مشترک نکلی۔ حکیم محمد نبی خاں بھی اپنے رنگ میں دلی کی تہذیب کو اپنے اندر سمیٹے بیٹھے تھے۔ وہ جو ایک وضعداری کی لٹک دِلی سے منسوب چلی آتی ہے اس کی ایک مثال یہاں میں نے بھی دیکھ لی۔ حکیم اجمل خاں کی سوانح کے سلسلہ میں وہ لمبے انتظار کے لیئے تیار نہیں تھے۔ میری حد تک انہیں لمبا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ لیکن جب کتابت کا مرحلہ آیا، تو ان کی وضعداری نے انہیں بہت لمبا انتظار کرنے پر مجبور کیا۔ ایک وضع یہ چلی آتی تھی کہ جو لکھوانا ہے اسی خوش نویس سے لکھوانا ہے جس کا خط کسی بھلے وقت میں ان کے جی میں کھب گیا تھا۔

خوش نویس صاحب جدہ چلے گئے۔ یہاں پاس وضع یہ کہ ان کے ہوتے ہوئے دوسرے سے کیسے کتابت کرائی جائے۔ جدہ چلے گئے ہیں تو کیا ہوا اور مشغلہ کوئی دوسرا اختیار کر لیا ہے تو پھر بھی کیا ہوا۔ جب وقت ملے ہمارے مسودے کی کتابت کریں۔ تو حکیم صاحب نے یہ طور اختیار کیا کہ مسودے کا ایک باب فوٹو سٹیٹ کرایا اور خوش نویس صاحب کو بھیج دیا۔ خوش نویس صاحب کو سال چھ مہینے لگ گئے۔ کبھی سال سے اوپر بھی ہو گیا۔ یوں دس بارہ برس گزر گئے اور کتابت ہے کہ جاری ہے۔ میں سال چھ مہینے کے بعد خیریت معلوم کرتا وہ نہایت احتیاط سے رکھے ہوئے کتابت شدہ ابواب بستے سے کھول میرے سامنے پھیلا دیتے کہ کیا خوب کتابت ہوئی ہے جیسے موتی جڑے گئے ہیں۔ پھر وہ کاغذ کے نمونے نکال کر دکھاتے جو خاص طور پر اس کتاب کے لیئے تیار کرایا جا رہا تھا۔

ادھر خوش نویس صاحب کا خوش رقم قلم بیربہوٹی کی چال چل رہا تھا ادھر کاتب قضا نے حکیم صاحب کے ورقِ حیات پر تمت بالخیر لکھا اور فرصت پائی۔ اب جب پسماندگان نے حکیم صاحب کے کاغذات کو سمیٹا تو دیکھا کہ اجمل خاں کی سوانح کے چند ابواب کا مسودہ اور ان کی کتابت سنگھوائی ہوئی رکھی ہے باقی ابواب غائب ہیں۔ بہت ڈھونڈنے پر ایک دو باب اور برآمد ہوئے۔ باقیوں کا پتہ نہ چلا۔

جب میرے مشفق دیرینہ ڈاکٹر نعیم الدین خاں تلاش سے تھک ہار کر بیٹھ گئے

تو میں نے ان سے عرض کیا کہ کسی وقت یکسو ہو کر بیٹھوں گا اور انشاء اللہ یہ کام مکمل کروں گا۔ اور ڈاکٹر نعیم الدین خاں کا حوالہ آیا ہے تو سن لیجئے کہ اس گھرانے سے میرا تعارف کیسے ہوا۔ میں نے خاندان شریفی کو اس وقت دیکھا جب وہ دلی سے اکھڑ کر لاہور آن بسا تھا۔ وہاں خاندان شریف منزل میں اکٹھا تھا۔ لاہور پہنچتے پہنچتے موتیوں کی لڑی بکھر گئی۔ میں نے جس موتی کو سب سے پہلے دیکھا وہ حکیم حبیب اشعر تھے۔ بس دیکھتے ہی ان کا گرویدہ اور ان کی حکمت کا قائل ہو گیا۔ انہی کے واسطے سے ڈاکٹر نعیم سے جو حکیم محمد نبی خاں کے بہنوئی ہیں یعنی حکیم اجمل خاں کے پوت داماد تعارف ہوا۔ پھر حکیم حبیب اشعر نے ایک دن کہا کہ چلو میں تمہیں حکیم اجمل خاں کے پوتے سے ملاتا ہوں۔ یوں حکیم محمد نبی خاں سے تعارف ہوا۔

اب میرا معاملہ خاندانِ شریفی کی گیارھویں نسل اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی چوتھی نسل سے ہے۔ ان کے پڑپوتے جواں سال منیر نبی خاں ایک روز ڈھونڈتے ڈھونڈتے غریب خانے پر آئے۔ کہا کہ آپ کے گیٹ پر آپ کے نام کی تختی نہیں ہے۔ پہلی دفعہ آنے والوں کو وقت پیش آتی ہو گی۔ دوسری مرتبہ آئے تو میرے نام کی لکھی ہوئی تختی ساتھ لائے۔ ان کے ڈرائیور اور انہوں نے مل کر ٹھوک پیٹ کی۔ تختی لگائی اور چلے گئے۔ بس میں نے بھی جلدی ہی اپنے آپ کو اکٹھا کیا۔ قلم اٹھایا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ اس عرصے میں دلی دو تین مرتبہ آنا جانا ہوا تھا۔ نئی نئی چھپی ہوئی چند ایسی کتابیں ہاتھ آئیں جو دلی اور حکیم صاحب کے متعلق کچھ نئے اشارے کرتی دکھائی دیں۔ مگر ان سے استفادہ میں بس انہیں ابواب کی حد تک کر سکتا تھا جو اب دوبارہ لکھ رہا تھا۔ سو اس طرح یہ کتاب مکمل ہوئی یوں حکیم اجمل خاں کے سوانح نگاروں میں پانچواں سوار بن کر میں شامل ہو گیا۔

حکیم اجمل خاں کے پچھلے سوانح نگار ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے انہیں اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ ان سے انہیں قرب حاصل تھا۔ اس عہد کی سیاست کے بھی وہ عینی شاہد تھے۔ کوئی کوئی اس سیاست میں کسی حد تک شامل بھی تھا۔ اس حوالے سے یہ سوانح نگار ایک اعتبار سے میرے مقابلہ میں بہت خوش قسمت تھے مگر شاید ایک اعتبار سے میں بہتر پوزیشن میں ہوں۔ بہت قریب ہونے کی وجہ سے وہ سوانح نگار مسیح

الملک کے سحر میں تھے اور اس عہد کی سیاست کے سلسلہ میں ان کی جانبداریاں تھیں۔ ایک شخصیت کو اور ایک دور کو دیکھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ فاصلہ پر کھڑا ہو کر دیکھا جائے۔ میں فاصلہ پر کھڑا ہوں۔ اس باعث میرے لیئے معروضی رویہ اختیار کرنا ممکن ہے جو شاید قاضی عبدالغفار کے لیئے ممکن نہیں تھا۔ مثلاً میرے لیئے یہ کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے مولانا محمد علی اور مہاتما گاندھی کو مسٹر محمد علی اور مسٹر گاندھی کیوں کہا اور کیوں تحریک خلافت سے اختلاف کیا۔ اس تحریک میں میری کوئی جذباتی شمولیت نہیں ہے۔ میرے لیئے وہ تاریخ کا ایک باب ہے۔ لیکن کس قیامت کا باب ہے۔ یہیں سے ہندوستان کی تاریخ نے ایک موڑ کاٹا اور پھر کن بلاخیز رستوں پر چل پڑی کہ بالآخر ۱۹۴۷ء میں تقسیم پر آ کر دم لیا۔ جیسے جھٹ پٹے میں دو وقت دم بھر کے لیئے ملتے ہیں اور جدا ہوتے ہیں بس ویسے ہی تاریخ کے اس جھٹ پٹے میں ہندو اور مسلمان ملے اور جدا ہو گئے۔ اصل میں اس اتحاد ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ اس اتحاد نے دو گروہوں کو بیک وقت خوفزدہ کیا۔ انگریزوں کو تو اس اتحاد سے خوفزدہ ہونا ہی تھا اور اس کا کوئی مستقل بندوبست بھی کرنا تھا مگر خود ہندوؤں میں ایک بڑا گروہ اس اتحاد سے خائف ہو گیا۔ اصل میں ان کے لیئے ترکی اور افغانستان کے حوالے پریشان کن تھے۔ خلافتیوں کے منصوبے تھے کہ ترکی اور افغانستان کی مدد سے ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔ مگر یہ تو وہ علاقے تھے جہاں سے مہم جو چلتے تھے اور ہندوستان پر حملہ آور ہوتے تھے۔ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی، بس اس گروہ کا یہ وسوسہ اس اتحاد کو کھا گیا۔ پھر وسوسے اور اندیشے دونوں طرف بڑھتے ہی چلے گئے اور دل پھٹتے چلے گئے۔

دلوں کے پھٹنے پر تو خیر سب جگہ وہی ہوا جو دلوں کے پھٹنے کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔ مگر دلوں کے ملنے کے ہنگام جو دلی میں ہوا وہ اسی شہر میں ہو سکتا تھا۔ پنڈت اور مہاتما مسجدوں میں پہنچ کر نمازیوں سے خطاب کریں اور مسلمان گائے کا گوشت ہی سرے سے کھانا چھوڑ دیں، یہ اسی شہر میں ممکن تھا۔ دلی کے تہذیبی چلن میں اس طرز عمل کی گنجائش تھی۔ یہی تہذیبی چلن حکیم اجمل خاں کی ذات میں مشخص ہو گیا تھا۔ مولانا حالی نے یہ غالب کے لیئے اس کے مرنے پر کہا تھا کہ

اس کے مرنے سے مر گئی دلی

تہذیبی شہر اپنے عمل میں کسی کسی موڑ پر پہنچ کر ایسی شخصیت کو جنم دیتے ہیں جس میں وہ شہر اپنے پورے مزاج اپنے پورے تہذیبی چلن کے ساتھ سما جاتا ہے۔ حکیم اجمل خاں ایسی ہی تہذیبی شخصیت تھے۔ سمجھ لو کہ اپنی ذات میں وہ چلتی پھرتی دلی تھے۔ سو خواجہ حسن نظامی نے ٹھیک کہا کہ دلی کی سیر کو آنے والے جب قطب مینار اور لال قلعہ کو دیکھ چکیں تو پھر بلیماراں جا کر حکیم اجمل خاں کو بھی دیکھیں۔ اور میرے لیئے ساری مشکل یہیں سے پیدا ہوئی۔ پہلے اس تہذیب کو سمجھو، پھر وہ شخصیت سمجھ میں آئے گی۔ یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اس شخصیت کے واسطے سے آپ اس تہذیب کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دونوں صورتوں میں کام ٹیڑھا ہے۔ بہرحال جتنا کچھ بن سکا پیش خدمت ہے۔

انتظار حسین

ایک شہر ایک تہذیب

"دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب۔" پس منظر میں صدیوں کا تخلیقی عمل تھا۔ وہ جگ صدیاں ہوئیں بیت چکا تھا جب قدیم آریاؤں نے اِس دھرتی کو اپنی دیو مالائی بصیرت سے ایک قالب میں ڈھالا تھا۔ اندر پرستھ کہانی بن چکا تھا۔ اس کے بسانے والے مقدس شخصیتوں کا رُوپ دھار چکے تھے۔ لوگ ایک عقیدت کے ساتھ اِس شبھ سمے کو یاد کرتے جب پانڈ و سورماؤں نے جمنا کنارے کورو کشیتر کے بیچ کھانڈو بن کو پاک صاف کر کے ایک سندر نگر آباد کیا تھا کہ دیوی دیوتاؤں کی نگری مہندر پوری سے مقابلہ کرتا تھا۔ چاروں طرف فصیل کے باہر کھائیاں، کھائیوں میں موتی سا پانی چھلکتا ہوا، کھائیوں سے پرے باغ بغیچے، موروں کی جھنکار اور کوئلوں کی کوک سے گونجتے ہوئے، فصیل کے اندر محل محلات، بیچ میں یدھشٹر کا محل جس کی دُھوم ہستنا پور تک گئی کہ وہاں سے دریودھن اسے دیکھنے آیا اور خجل ہو کر واپس گیا۔ یہ ساری بہار پانڈوؤں کے دم سے تھی۔ وہ گئے تو اِس نگر کی رونق بھی چلی گئی۔ اندر پرستھ ویران ہو گیا۔

صدیوں بعد جب تواریوں کا زمانہ آیا تو اندر پرستھ مٹ چکا تھا۔ اب وہاں انگ پال کی بسائی ہوئی دلی اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ اول توار، پیچھے چوہان۔ دونوں گھرانوں کے زمانے میں دِلی کا ایک ہی تہذیبی نقشہ رہا۔ نگر کے گردا گرد گرڑ دیوتا کی مورتیاں نصب تھیں۔ بیچ نگر میں لوہے کی لاٹ کھڑی تھی۔ چوہان گئے تو یہ دِلی بھی کہانی بن گئی۔ گرڑ دیوتا کی مورتیاں غائب تھیں، بس لوہے کی لاٹ کھڑی رہ گئی۔ یہ جانے کب کھڑی کی گئی تھی، مگر ہندو خلقت کہتی تھی کہ یہ تو وہ کیلی ہے جو مہاراج پرتھی راج نے راجہ باسک کے پھن میں گاڑی تھی۔ جوتشیوں نے پرتھی راج کو خبر دی کہ مہاراج

راجدھانی کی دھرتی تلے راجہ باسک براجے ہیں۔ انہیں باندھ سکتے ہو تو باندھ لو۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر چوہانوں کا راج سدا قائم رہے گا۔ پرتھی راج نے باندھنے کی ترکیب پوچھی تو جوتشیوں نے کہا کہ کیلی بنوا کر راجہ جی کے پھن میں ٹھونک دو۔ پھر دھرتی کا راجہ آپ کی دھرتی کے ساتھ بندھ جائے گا۔ پرتھی راج نے لوہے کی ایک لمبی موٹی کیلی بنوائی اور جوتشیوں کی بتائی ہوئی جگہ پر ٹھونک دی۔ جوتشی مطمئن ہو گئے مگر پرتھی راج کو اطمینان نہ ہوا۔ سوچا کیلی اکھڑوا کے دیکھو کیا واقعی وہ راجہ کے سر میں گڑی ہے۔ جوتشیوں نے بہت منع کیا مگر پرتھی راج نہ مانا۔ کیلی اکھڑوائی گئی۔ دیکھا کہ وہ ہاتھ بھر خون میں تربتر ہے۔ ترت کے ترت اسے اُسی جگہ ٹھونک دیا مگر جوتشیوں نے سرپیٹ لیا۔ کہا کہ اب کیلی کے گاڑنے کا کیا فائدہ، پاتال کا راجہ اِتنی دیر میں بل کھا کر کہیں سے کہیں پہنچا۔ (1)

راجہ باسک لہر کھا کر نکل گیا۔ وقت گزر گیا۔ راجہ باسک اور وقت پرانی دانش کو جل دے گئے۔ وقت کی لہراب نئے قافلوں اور نئی دانش کے ساتھ چل رہی تھی۔ مسلمان لشکروں کی یلغار اپنی جگہ مگر ایک عمل اور بھی جاری تھا۔ مسلمان اہل دانش اور اہل ہنر دُور دُور کی زمینوں سے چل کر اِس دیس میں پہنچ رہے تھے اور فاتحین سے الگ ایک دوسری سطح پر سرزمین ہند سے اپنا رشتہ جوڑ رہے تھے۔ علماء فضلا صوفیا، شعرا ہرج مرج کھینچتے، رنج سفر اُٹھاتے یہاں پہنچتے۔ کوئی دربار سے وابستہ ہو جاتا، کوئی دربار سے بے تعلق ہو کر اپنے جوہر کے واسطے سے اس دھرتی سے ناتا قائم کرتا۔ مزاحمت و قبولیت اور جذب و مدافعت کا دو طرفہ عمل چپکے چپکے جاری تھا۔ نئی زمین ان کے تخلیقی جوہر کو ایک نئی توانائی عطا کر رہی تھی۔ ان کا تخلیقی جوہر اس پرانی زمین کو نئے معنی عطا کر رہا تھا۔ رزمیاؤں کا زمانہ گزر چکا تھا۔ دِلی کے کوچوں میں ایک نیا شاعر گھومتا پھرتا کہہ مکرنیاں سناتا، انمل جوڑتا نظر آرہا تھا۔ ایک نئی شاعرانہ بصیرت ظہور کر رہی تھی۔ ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی ۔۔۔ ہند اسلامی تہذیب۔

نئی تہذیب پھل پھُول رہی تھی اور دلی کی شکل بدلتی چلی جا رہی تھی۔ اب نہ وہاں گرڑ دیوتا کی مورتیاں تھیں نہ مندروں کا وہ جھمکڑا جس کے بیچ لاٹ کھڑی تھی۔ لے دیکے لاٹ اُجڑی پجڑی کھڑی رہ گئی تھی۔ اب یہاں ایک اور بھی لاٹ نمودار ہو

چکی تھی کہ اپنی بلندی میں آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ قطب کی لاٹ تھی۔ اس کے سائے میں مسجد قوۃ الاسلام کھڑی تھی۔ سلطان قطب الدین ایبک دِلی کا پہلا مسلمان حکمران تھا۔ اسی کی بدولت دِلی کی یہ کایا کلپ ہوئی تھی۔ اس کے بعد سلاطین آتے رہے اور دِلی کو اپنے اپنے حساب سے اجاڑتے بساتے چلے گئے۔ سلاطین و فاتحین نے بار بار اس شہر کو اجاڑا اور بار بار بسایا۔ بار بار نئے سرے سے تعمیر کیا اور نئے کوٹ اور قلعے کھڑے کیئے۔ ان کے طفیل دلی سات دفعہ اُجڑی اور سات دفعہ بسی۔ ساتویں دِلی شاہجہاں کی تھی۔ اِس بادشاہ نے بارہ سال باپ دادا کی پیروی میں اکبر آباد میں گزارے۔ پھر وہاں سے جی اُچاٹ ہوا۔ دِلی کا رُخ کیا۔ تب اِس اُجڑی بستی میں ایک نئی بستی کا نقشہ جما اور نئے قلعہ کا ڈول پڑا۔ نوسال میں قلعہ تعمیر ہوا۔ لال قلعہ کے نام سے مشہور ہوا۔ شہر کا نام شاہجہاں آباد رکھا گیا کہ پھر اسے جہاں آباد کہنے لگے۔ ۱۶۴۸ء میں شاہجہاں نے دِلی آ کر اپنے نئے قلعہ میں پہلا دربار کیا۔ یہ دربار کیا تھا، جہان آباد کی افتتاحی تقریب تھی۔

جہان آباد ساتویں دِلی تھی۔ اور ہند اسلامی تہذیب کی نکھری ہوئی شکل۔ روایتوں اور اداروں کی تشکیل ہو چکی تھی۔ ریت رسمیں، طور طریقے، ادب آداب بن سنور چکے تھے۔ جمنا کنارے جنم لینے والی یہ نئی بستی اپنے اس نئے معاشرتی تانے بانے کے ساتھ ہند اسلامی تہذیب کی نمائندہ شکل بن گئی۔ اس کے بعد سلطنت مغلیہ بے شک بکھرتی چلی گئی مگر ہند اسلامی تہذیب کا جو نقشہ جم گیا تھا وہ جما رہا۔ بہادر شاہ ظفر کے وقت میں لال قلعہ کا بس نام رہ گیا تھا۔ اِقتدار کی عمارت بیٹھ چکی تھی مگر تہذیب کی عمارت قائم تھی۔ حکم احکام کمپنی بہادر کے، چلن دِلی والوں کا۔

شہر کا نقشہ ان دِنوں یہ تھا کہ گرداگرد فصیل، فصیل میں تیرہ دروازے اور سولہ کھڑکیاں۔ شہر فصیل کے اندر سمٹا ہوا تھا۔ فصیل سے باہر کچے پکے راستے پھیلے تھے اور جہاں تہاں کھنڈر کھڑے تھے۔ دریا کی برابر برابر گھنا جنگل چلا گیا تھا جو بیلہ کہلاتا تھا۔ شہر کے دروازے دن میں کھلے رہتے اور لوگ آتے جاتے رہتے۔ رات کو بند ہو جاتے۔ پھر باہر کا آدمی باہر اور اندر کا آدمی اندر۔ وہ کالی راتوں کا زمانہ تھا۔ شام ڈھلے فصیل کے باہر ہی نہیں فصیل کے اندر بھی اندھیرے کا ڈیرا ہوتا۔ اندھیری گلیاں بھائیں

بھائیں کرتیں۔ کسی کسی چوک میں مشعل جلتی نظر آتی۔ آگے پھر اندھیرا۔ رات کو لوگ گھروں سے کم نکلتے۔ شرفاء میں سے کسی کی سواری رات کو نکلتی تو مشعلچی مشعل، لے کر آگے آگے چلتا۔

صبح دم، نور کے تڑکے نوبت بجتی، شہنائی کی میٹھی آواز سنائی دیتی۔ تب شہر کے دروازے کھلتے اور جمنا پر جمگھٹے ہوتے۔ مہین ساڑھیوں میں لپٹے چاند کے ٹکڑے پانی میں اُترتے، اشنان کرتے۔

شام پڑے سیلانی گھرون سے نکل چوک کی راہ لیتے۔ جامع مسجد کی مشرقی رُخ کی سیڑھیاں اور ان کے اوپر کھلی جگہ چوک کہلاتی تھی۔ یہاں دن ڈھلے گزری بازار لگتا۔ بزاز رنگ رنگ کے کپڑے بیچتے۔ تیتربٹیر، لال پدڑی اور کبوتر بکتے نظر آتے۔ ایک طرف گھوڑے والے گھوڑے لیئے کھڑے رہتے۔ گھوڑوں کے خریدار جوق در جوق آتے۔ جنوبی دروازے کے رُخ سیڑھیوں پر فالودہ، شربت اور کباب کی دکانیں بہار دکھاتیں اور چٹوروں کو للچاتیں۔ مرغ بیچنے والے مرغ بیچتے۔ دل لگی باز انڈے لڑاتے اس طرح کہ مٹھی میں انڈا داب کر فریق مخالف کے انڈے سے آہستہ آہستہ ٹکراتے۔ جس کا انڈا ٹوٹ گیا وہ ہار گیا۔ اب شمالی دروازے کی طرف آیئے۔ یہاں سیڑھیوں پر قصہ خواں بیٹھے قصہ خوانی کرتے ہیں۔ کوئی قصہ حاتم طائی سناتا ہے۔ کوئی مونڈھے پہ بیٹھا داستان امیر حمزہ بیان کرتا ہے۔ ایک طرف مداری نے مجمع جمع کر رکھا ہے۔ بوڑھے کو جوان، جوان کو بوڑھا دکھاتا ہے۔ مسجد کے عقب میں دال دلیا اور اناج کی دکانیں۔ دکانوں سے آگے چاوڑی بازار۔

چاوڑی بازار، واہ واہ، سبحان اللہ۔ گاہکوں کے قدم زمین پر، نظریں بالا خانوں پر

چاوڑی قاف ہے یا خلد بریں ہے راسخ
جمگھٹے حوروں کے پریوں کے پرے رہتے ہیں

یار اہلے گہلے پھرتے ہیں۔ کہیں خالی نگاہ بازی اور فقرہ بازی، کہیں من لگاؤ چناؤ اور دِلوں کا بھاؤ تاؤ۔ بیچ بازار میں نہر بہتی ہے جو گھوم پھر کر چاندنی چوک کی نہر سے جا ملتی ہے۔

چاندنی چوک شہزادی جہاں آرا سے یادگار ہے جو شاہجہاں کی اس لاڈلی بیٹی نے

۱۶۵۰ء میں لال قلعہ کے لاہوری دروازے کے سامنے بنوایا تھا۔ بازار میں پانچ پانچ سو گز کے فاصلہ سے دو چوک بنے۔ دوسرا چوک چاندنی چوک کہلایا، بازار کا نام لاہوری بازار پڑا۔ بعد میں پورا بازار ہی چاندنی چوک کہلانے لگا۔ چوک کے شمال میں شہزادی کی ہدایت پر باغ لگا اور سرائے بنی۔ چاندنی چوک بھی باغ سے کیا کم تھا۔ بیچوں بیچ نہر بہتی تھی۔ دو رویہ ہرے بھرے درخت۔ آم، جامن، نیم، پیپل، گولر، مولسری اور سب پیڑوں کا بزرگ برگد۔ ان کے سائے میں رنگ رنگ کی سواری مثل بادِ بہاری، پالکیاں، نالکیاں اور رتھیں۔ رتھوں کے بیلوں کے سینگوں پر سنہری سنگوٹیاں چڑھی ہوئیں۔ گلوں میں پیتل کی گھنٹیاں بجتی ہوئیں۔ کبھی کبھی اِس راہ سے شاہی سواری کے ہاتھی گزرتے، پشت پر سنہری ہودے سجے ہوئے، زربفت اور بانات کی جھولیں پڑی ہوئیں۔ گزرگاہ کے دائیں بائیں دکانوں کی قطاریں تھیں۔ دکانیں صاف شفاف، صراف کے مقابل صراف۔ ہزاری بزاری۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ دم کے دم میں ہزاروں کا سودا ہوتا تھا۔ بزاری رنگ برنگی پوشاکیں زیب تن کیئے ہوئے۔ دکانوں کے آگے بانسوں پر رنگ برنگے پردے لہراتے ہوئے۔ سارا چاندنی چوک رنگین نظر آتا، رنگوں میں رنگا ہوا اور پھُولوں میں بسا ہوا۔ گل فروش پھُولوں سے بھری ٹوکریاں لیئے پھرتے۔ کٹورا بجتا رہتا، سقے دوڑتے رہتے۔ 'میاں! آبِ حیات پلاؤں' کی آواز مستقل سنائی دیتی رہتی۔

چوک سعداللہ میں رنگ رنگ کا آدمی، رنگ رنگ کا جناور۔ وعظ دیتے ہوئے علما، تیر بہدف علاج کرنے والے نیم حکیم، جھوٹی سچی دوائیں بیچنے والے عطائی، قسمت کا حال بتانے والے منجم اور رمال۔ سب اپنے اپنے کام میں مصروف۔ سب کے گرد خلقت کا ہجوم۔ بھانڈ اور بادہ فروش اپنے کام سے لگے ہوئے۔ دیسی بدیسی پھل۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔

چاندنی چوک، چوک سعداللہ، چاوڑی بازار، خانم کا بازار، اُردو بازار، بازار یہی چند ایک گنے چنے تھے۔ باقی اَن گنت گلیاں کہ شہر میں پیچ در پیچ پھیلی ہوئی تھیں۔ گلیوں کی زمین کہیں کچی، کہیں پہاڑی پتھر بچھے ہوئے۔ مکان ایک کے ساتھ ایک بھڑا ہوا۔ چھتیں آپس میں پیوست۔ ایک گھر کی کھڑکی دوسرے گھر میں، دوسرے گھر کی

کھڑکی تیسرے گھر میں۔ پتنگ لوٹنے والے بچے گلی کے نکڑ کی چھت سے روانہ ہوتے اور کودتے پھاندتے گلی کے آخر تک پہنچ جاتے۔ پردہ دار بیبیاں گھروں کے اندر اندر کھڑکیوں سے نکلتی نکلاتی پوری گلی کا پھیرا لگا لیتیں، اور یہ گھر کیسے تھے۔ ایک بیرونی حصہ، ایک اندرونی حصہ، بیرونی حصہ مردانہ، اندرونی حصہ زنانہ۔ بیرونی حصے میں ڈیوڑھی یا دیوان خانہ۔ اندرونی حصے میں دالان در دالان، بغلی کوٹھریاں۔ اس سے آگے ایک پکا چبوترہ، چبوترے سے آگے صحن، کچا مگر بڑا۔ صحن زیادہ بڑا ہوا تو چھوٹا سا غنچہ، غنچے کے بیچ میں حوض، حوض کے بیچ میں فوارہ۔ صاحب مکان کو غنچہ لگانے کی توفیق نہ ہوئی تو اکا دکا بیری یا انار کا درخت لگا لیا اور صحن کو آراستہ کر لیا۔ گھر کے اِسی نقشہ نے جب وُسعت پائی تو گھر حویلی بن گیا اور ایسی بڑی بڑی حویلیاں کہ ۱۸۵۷ء میں اُجڑنے کے بعد ایک ایک حویلی ایک ایک محلّہ بن گئی۔ جب یہ نقشہ صاحب مکان کی بساط کے حساب سے سکڑا تو دیوان خانہ غائب ہو گیا، خالی ڈیوڑھی رہ گئی کہ ڈیوڑھی بھی ہوتی اور دیوان خانے کا بھی کام دیتی۔ ان گھروں میں رہنے والیاں کھڑکی کھڑکی گلی کے سارے گھروں میں گھوم پھر لیتیں، مگر ڈیوڑھی سے قدم شاذو نادر ہی نکالتیں۔ ایسی پردے والیاں بھی تھیں کہ عمریں گزر گئیں اور ڈیوڑھی سے قدم نہیں نکلا۔ وہ بھی تھیں کہ ڈولے میں سوار ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں اور پھر تابوت ہی میں ڈیوڑھی سے باہر آئیں۔ مگر ان بیبیوں کی دُنیا میں گھٹن نہیں تھی۔ پردے کی دُنیا تنگ تھی مگر گھٹی ہوئی نہیں تھی۔ اندر باہر ایک گہما گہمی جو رہتی تھی۔ باہر گلی میں سودا بیچنے والوں کی آوازیں، اندر ریت رسموں کی رونق۔

شاہجہان نے اپنے وقت میں شاید پردے والیوں ہی کی خاطر یہ حکم جاری کیا تھا کہ سودا بیچنے والے گلیوں میں پھیرے لگا کر سودا بیچیں۔ یہ ریت اب تک قائم تھی۔ گلی گلی پھیری والے صدا لگاتے پھرتے۔ آم، جامن، ککڑی کچری، شکرقندی، بیر، کھرنی، فالسہ، امرود، ہر شے ہر میوے کے بیچنے والے آتے اور اپنی اپنی صدا لگاتے۔ سرولی آگئی ہے مہرولی کی۔ کالی بھونرالی جامنیں ہیں۔ لیلیٰ کی انگلیاں، مجنوں کی پسلیاں، شرط ہے میٹھی ملائم ککڑیاں۔ کالے پہاڑ کی مٹھائیاں سندھیاں، بیجوں سے میٹھیاں۔ بڑی کڑھائی کا حلوہ شکرقند۔ گھونگھٹ والی نے توڑے ہیں بیر۔ قطب والوں کی کھرنیاں لو، جھرنے والی

کھرنیاں لو۔ اودے اودے فالسے، شربت بنا لو۔ پیڑے الہ آباد کے بڑے میٹھے۔

یہ تو فصل کے پھل پھول کا احوال تھا۔ مگر صرف پھل پھول ہی گلیوں میں نہیں ملتے تھے، ہر مال ملتا تھا۔ سستا سماں تھا۔ گیہوں روپے من۔ گھی چار آنے سیر۔ (۲) گڑ شکر ٹکے سیر۔ نانبائی کو دو پیسے دو اور گھی کے تربتر پراٹھے اور گوشت کے چٹ پٹے سالن سے پیٹ بھر لو۔ پردے والیاں ڈیوڑھی لانگھے بغیر دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر بیٹیوں کا پورا پورا جہیز خرید لیتیں۔

گھروں کی رونق ہنگامہ پہ موقوف تھی۔ آج شادی بیاہ کا ہنگامہ کل تیج تیوہار کی چہل پہل۔ ریت رسم کا زور تھا۔ خوشی کی تقریبیں نکلتی رہتیں اور رسمیں ہوتی رہتیں۔ شادی کی رسموں سے فراغت پائی تو بہو کا پاؤں بھاری ہو گیا۔ لیجئے پھر رسموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دائی نے لڑکے کی خوشخبری سنائی۔ مبارک سلامت کا غل ہوا۔ دعائیں دی جانے لگیں۔ بلائیں لی جانے لگیں۔ جسے خبر ملی وہ ڈولی میں سوار آن پہنچی۔ ڈومنیاں ڈھولک لے کر آئیں اور شروع ہو گئیں:

میرے للا کے گھونگھر والے بال
اماں جیوے، باوا جیوے اور جئے پروار
میرے للا کے گھونگھر والے بال
ہنسلی چوموں، کٹھلا چوموں، اور چوموں گلے ہار
میرے للا کے گھونگھر والے بال
کرتا چوموں، ٹوپی چوموں اور چوموں گورے گال
میرے للا کے گھونگھر والے بال

انا بچے کو کھلاتی ہے۔ میاں آوے علی علی، پھول بکھیروں گلی گلی۔ میاں آوے دوروں سے، گھوڑے باندھوں کھجوروں سے۔ میاں کا آج عقیقہ، کل ختنے۔ ذرا بڑے ہوئے تو رسم بسم اللہ۔ رمضان آئے تو پہلے روزے کی تقریب ہوئی۔ برادری میں افطاری تقسیم ہوئی۔

زنان خانے سے مردانے کی طرف آیئے۔ دیوان خانے میں احباب کی مجلس آراستہ ہے۔ صاحب خانہ تواضع میں بچھے جا رہے ہیں۔ مہمانوں کے عطر ملا جا رہا ہے۔

پھلوں کی قاب اور خشک میوے کی طشتری گردش میں ہے۔ اس کے بعد پان کی گلوریاں۔ کبھی گلوریوں کی جگہ خالی الائچی اور سپاری۔ جس گھر میں دیوان خانہ نہیں وہاں ڈیوڑھی میں محفل آراستہ ہے اور خاطر تواضع ہو رہی ہے۔ ڈیوڑھی میں گنجائش نہ ہوئی تو گھر کے دروازے کے آگے ایک مشک کا چھڑکاؤ کرایا، مونڈھے بچھائے، بیچ میں حقہ رکھا، گزرتے ہوئے پھول والے سے پھولوں کا ایک ہار لیا اور حقے کی نے میں لپیٹ لیا۔ لیجئے محفل معطر ہو گئی۔

گھر، گلیاں اور بازار گرم دوپہروں میں خس سے مہکتے، شام پڑے سے پھولوں کی خوشبو میں بس جاتے۔ اس تہذیب میں خوشبو اور رنگ کا بہت عمل دخل تھا۔ درخت اور پھول کا لوگوں کے حسیاتی تجربوں سے لے کر روحانی وارداتوں تک میں اثر و رسوخ، کچھ ہندو دیو مالا کا نفوذ، مل جل کر ایک ایسے طرز احساس نے جنم لیا تھا جو معلوم اور نامعلوم کو ملا جلا دیکھتا تھا۔ چیزیں جتنی کچھ نظر آتی تھیں اتنی کچھ نہیں تھیں۔ جہاں آنکھ کا سفر ختم ہوتا تھا وہاں سے آگے تخیل کا سفر شروع ہو جاتا تھا۔ پھر یہ تخیل ہٹ کر آنکھ پر اثرانداز ہوتا۔ ان دیکھی چیزیں دکھائی دیتیں اور انہونی ہونی بن جاتی۔ کوئی بی بی ڈولی میں سوار ہوتے ہوتے کہار کے پیروں کو دیکھتی اور سکتہ میں آجاتی۔ پھر واپس آ کر سناتی کہ "بی بی وہ کہار تھوڑا ہی تھے"

"پھر کون تھے؟"

"اری ہوا یوں کہ مجھ کال کھاتی کی نظر اگلے کہار کے پیروں پہ جا پڑی میں حق دق رہ گئی۔ وہ تو آدمی کے پیر ہی نہیں تھے۔"

"اچھا؟...."

"ہاں وہ تو کُھر تھے۔"

کسی عقیدت مند کو کبھی کسی درگاہ سے آتے ہوئے سبز پوش سوار نظر آتا۔ وہ اسے بشارت جانتا اور ایک حیرت اور مسرت کے عالم میں گھر لوٹتا۔

لوگوں کو سائے نظر آتے، بشارتیں ہوتیں، اور مستقبل کی خبر دینے والے خواب دکھائی دیتے۔ مستقبل کی خبر کبھی خواب کے ذریعے ملتی کبھی کوئی پہنچا ہوا فقیر گزرتے گزرتے کوئی اُڑتا سا فقرہ کہہ جاتا اور وہی فقرہ مستقبل کی خبر ٹھہرتا۔ پہنچے ہوئے

فقیر اور صاحب کرامت بزرگ شہر میں جا بجا بیٹھے تھے۔ کوئی تحیر میں ڈوبا ہوا، کوئی عالم جذب میں پہنچا ہوا۔ قدم شریف کے نواح میں ایک گنبد تھا کہ وہاں دین علی شاہ ننگے پڑے رہتے۔ (۳) اہل حاجت جوق در جوق آتے اور وہ انہیں برا بھلا کہتے۔ اہل حاجت انھیں باتوں میں سے اپنے مطلب کی بات نکال لیتے اور اپنی مراد پا لیتے۔ چتلی قبر کے آس پاس ایک دیوانہ پھرتا نظر آتا۔ رات ہوئی تو جو دکان خالی پڑی نظر آئی اُس میں گھس کر سو رہا۔ دِن میں پھر وہی آوارگی اور ازخودرفتگی۔ چلتے پھرتے کسی اہل حاجت کو کچھ کہہ دیا کچھ دے دیا۔ یہ میر احمد دیوانہ تھے جو کٹیا بنانے اور بسیرا کرنے کے قائل نہیں تھے۔ (۳) مگر شاہ عبدالنبی مجذوب جب بہت چل پھر لیئے تو جامع مسجد کے ایک حجرے میں پڑ رہے۔ ایک مرید بخشی بھوانی شنکر شب و روز خدمت کرتا۔ وہ بیٹھے قرآن مجید لکھتے رہتے۔ دونوں وقت دہی پیڑے کھاتے اور اللہ اللہ کرتے۔ (۴) ایک بزرگ سید حسن رسول نما کے مزار پر زنجیروں میں جکڑے پڑے رہتے۔ ہر وقت جلال میں رہتے۔ کبھی کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ انہیں نظر بھر کے دیکھ لے۔ یہ سید حسنؒ رسول نما کے نواسے تھے، سید عسکری۔ ابتدا میں سپاہی پیشہ تھے۔ کسی بزرگ کی خدمت میں پہنچے اور یہ شعر پڑھ بیٹھے۔

مستم چناں بکن کہ ندانم زبے خودی
در عرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت

بزرگ نے نگاہ بھر کے دیکھا اور کہا کہ جا اپنے نانا کی قبر پہ جا بیٹھ۔ نواسے نے حواس کھوئے، کپڑے پھاڑے اور نانا کی قبر پہ پہنچ کر زمین پکڑی۔ (۵) ایک بائی جی تھیں۔ اصلی نام گم ہو چکا تھا بائی جی کہلاتی تھیں اور شہر سے باہر پرانی عیدگاہ کے پاس ایک چھپر میں پڑی رہتی تھیں۔ مراد مانگنے والے اور مانگنے والیاں مال لے کر خدمت میں حاضر ہوتیں۔ بائی جی اس مال میں سے سترہ کوزے بھر کر الگ نکالتیں۔ باقی کو سترہ دفعہ زمین پر رکھ کر زمین سے اُٹھاتیں، ساتھ میں 'انا اعطینا' پڑھتیں۔ لہر میں مراد مانگنے والے سے کچھ بھی کہہ دیتیں اور وہ پورا ہو جاتا۔ (۶)

ایسے مجذوب اور پہنچے ہوئے فقیر شہر میں جابجا ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ کسی نے بیٹھے بیٹھے ٹھنڈا سانس کھینچا اور گزر گیا۔ کسی نے اینٹ پر سر رکھا، آنکھیں

موندیں، کہا کہ میں مر گیا اور وہ مر گیا۔ کوئی دُھونی رمائے بیٹھا تھا اور مرادیں مانگنے والوں کی مرادیں پوری کر رہا تھا۔

ان سے بڑے وہ صاحب کرامت بزرگ تھے جو زمانہ ہوا گزر چکے تھے اور جن کے مزار صدیوں سے مرجع خلائق تھے اور جن کی بدولت دِلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ مشہور تھی۔ مزاروں سے کرامات منسوب تھیں اور جابجا جو تاریخی عمارتیں کھڑی تھیں اور جو پرانے درخت کھڑے تھے ان سے روایتیں اور داستانیں وابستہ تھیں۔ مسجد قوۃ الاسلام میں کھڑی ہوئی لوہے کی لاٹھ کے متعلق ہندو کہتے تھے کہ یہی وہ کیلی ہے جو پرتھی راج نے راجہ باسک کے پھن میں پیوست کی تھی۔ کالکا مندر کے بارے میں کہتے تھے کہ یہاں کالی دیوی نے استھان کیا تھا۔ اکاس مندر کے آگے سنگ سرخ کے دو شیر کھڑے تھے اور پجاری کہتے تھے کہ اصل میں دیوی جی سنگھ پر سوار ہو کر یہاں براجی تھیں۔ مسلمانوں کی اپنی روایتیں اور داستانیں تھیں۔ اونچی کرسی پہ بنی ہوئی جامع مسجد کو لوگ دیکھتے، حیران ہوتے اور بزرگوں سے سنی سناتے کہ مسجد کے تعمیر ہو جانے کے بعد جب قطب نما رکھ کر قبلہ کا رُخ جانچا گیا تو پتہ چلا کہ مسجد پوری طرح قبلہ رُخ نہیں۔ اعلیٰ حضرت بہت افسردہ ہوئے۔ تب کہیں سے ایک درویش چلتے پھرتے یہاں پہنچے۔ انہوں نے مسجد کے ایک کونے سے پشت لگائی اور مسجد کو سرکا کر قبلہ رُخ کر دیا۔ شاہ بولا کا بڑ اس مجذوب کی یادگار تھا جس نے اِس گھنے پرانے پیڑ کی چھاؤں میں دُھونی رمائی تھی۔ اِس بڑ سے باروں مہینے بڑ گرتے رہتے اور شاہ بولا آتے جاتے لوگوں کو بڑ مارتے رہتے۔ ایک دفعہ کوئی شہزادہ بیمار پڑا۔ حکیموں نے جواب دے دیا۔ تب شہزادے کو شاہ بولا کے پاس لایا گیا۔ شاہ بولا نے پیالے میں تیل بھرا، شہزادے سے کہا کہ پیالے میں اپنی صورت دیکھ۔ شہزادے نے پیالے میں اپنی صورت دیکھی۔ پھر شاہ بولا نے تیل غٹ غٹ پیا اور بڑ کی چھاؤں میں لمبے لیٹ گئے۔ شہزادہ اچھا ہو گیا اور شاہ بولا اللہ کو پیارے ہو گئے۔

تخیل کی اس کارفرمائی نے ہر معلوم کے گرد نامعلوم کا ایک ہالہ بن دیا تھا۔ جانی پہچانی چیزوں کے عقب میں ایک انجانی دُنیا سانس لیتی نظر آتی۔ درخت، جانور، پھول، ہوا، صبح و شام کے اوقات سب اس شہر کے آدمی سے کچھ کہتے نظر آتے۔ سو وہ کسی

چیز، کسی منظر، کسی عمل سے بے تعلقی نہیں برت سکتا تھا۔ آدمی اور فطرت کے درمیان غیریت نہیں رہی تھی۔ درخت اور پرندے یہاں کی معاشرتی زندگی میں عمل دخل رکھتے تھے۔ موسم محض موسم نہیں رہے تھے۔ انسانی تعلقات میں رچ بس کر تہذیب بن گئے تھے۔ بسنت رت میں صرف سرسوں نہیں پھُولتی تھی، زرد بانا بھی اپنی بہار دکھاتا تھا۔ ساون بھادوں کی اپنی ریت رسمیں اور اپنی چہل پہل تھی۔ دِلی کی زندگی ایک اچھا خاصا بارہ ماسہ تھی۔ ہر مہینہ اپنے الگ رنگ، مہک اور ذائقہ کے ساتھ وارد ہوتا اور دِلی والوں کے حواس میں سرایت کر جاتا۔ مگر وہ مہینے بھی تو تھے جو مسلمانوں کے ہجری سنین کے ساتھ چل کر یہاں پہنچے تھے۔ دِلی میں پہنچ کر وہ مہینے دیسی مہینوں کے ساتھ مل جل کر رہے۔ بعضوں نے دیسی رنگ لے کر اپنے نام بھی بدل لیئے۔ ماہ صفر تیرہ تیزی کا مہینہ بن گیا۔ ربیع الاول کا مہینہ بارہ وفات کا مہینہ کہلایا۔ ربیع الثانی کو میراں جی کہنے لگے۔ جمادی الاول کا نام مدار کا مہینہ پڑ گیا۔

اس فضا میں رنگ آپس میں گھل مل رہے تھے۔ مختلف تہذیبی طور ایک نئی وحدت میں حل ہو رہے تھے دل آپس میں جڑ رہے تھے۔ دلوں کے پھٹنے کا وقت کسی کے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔ مذہب کا چلن بہت تھا، ہندوؤں میں بھی، مسلمانوں میں بھی۔ یہ تہذیب مذہبی روایت میں رچی ہوئی تھی مگر فرقہ پرستی سے ناآشنا تھی۔ بادشاہ مسلمان تھا، مگر ہندوؤں سے کبھی امتیازی سلوک نہیں برتا۔ بادشاہت گزر جانے کے زمانے بعد سی۔ ایف اینڈریوز صاحب ان بوڑھے ہندوؤں سے جنھوں نے شاہی زمانہ دیکھا تھا پوچھتے پھرے کہ اِن دنوں بادشاہ کا سلوک آپ لوگوں سے کیسا تھا۔ ہر ایک نے بلا تامل جواب دیا کہ آخری مغل بادشاہ کا ہندوؤں سے سلوک بہت اچھا تھا۔ سی۔ ایف اینڈریوز صاحب نے اس ساری گفتگو سے خلاصہ نکالا کہ "مغل بادشاہ" ہندوؤں پر اعتبار کرتے۔ ہندو ان پر اعتبار کرتے تھے۔ یہ اعتبار صدیوں کے عمل کا نتیجہ تھا۔ مغل بادشاہوں کے خلاف باقی معاملات میں جتنا بھی کہا جائے بہرحال اِس معاملہ میں وہ تعریف کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے مذہبی تعصبات اور طرفداری کے جذبے پر قابو پا لیا تھا اور اس لیئے وہ ہندو رعایا کے ساتھ مروت اور انصاف برت سکتے تھے۔ دربار کے مسلمان اُمرا کے یہاں بھی انہوں نے یہی مروت پیدا کر دی تھی۔ اگر کبھی کبھار مذہب

کی توہین ہو جانے پر جاہل لوگوں کے درمیان جھگڑا ہو بھی جاتا تو وہ انہیں تک محدود رہتا اور دب دبا جاتا۔ اوپر تک یہ جھگڑا کبھی نہیں پہنچتا۔ کشیدگی اگر پیدا ہو جاتی تو بہت جلدی رفع ہو جاتی۔ مغل، امن و آشتی کے قائل تھے۔ (۷)

نتیجہ اس طرز عمل کا یہ نکلا کہ ہندو مسلمان آپس میں گھل مل گئے۔ مذہب الگ الگ مگر تہذیب مشترک۔ ایک سی وضع قطع، ایک سے ادب آداب، ایک سی بول چال۔ لباس کی صورت یہ تھی کہ سر پہ دوپلڑی ٹوپی، برمیں انگرکھا، ٹانگوں میں پائجامہ۔ دوپلڑی ٹوپی کا رواج عام تھا۔ مگر سروں پر اور قسم کی ٹوپیاں بھی نظر آتی تھیں۔ چوگوشیہ، پنج گوشیہ، گول۔ پھر معزز سروں پر پگڑیاں بھی سجی دکھائی دیتی تھیں۔ پائجامہ کوئی ڈھیلا ایک برا، کوئی تنگ موری کا خوب چست، کوئی ٹخنوں سے اُونچا جو شرعی کہلاتا۔ انگرکھا وہی ایک قسم کا لیکن پہننے والا ہندو ہوا تو گھنڈی دائیں طرف مسلمان ہوا تو گھنڈی بائیں طرف۔ ہندو دھوتی باندھتے، مگر بالعموم گھر کے اندر۔ باہر نکلتے تو چست پائجاموں میں نظر آتے۔ سیٹھ ساہوکار اور صاحب مرتبہ لوگ انگرکھے پر شال بھی ڈال لیتے، ایک سرا کاندھے پر پڑا ہوا، دوسرا لٹکتا ہوا۔ کمر میں ایک چیز اور نظر آتی، نیام میں چھوٹی تلوار یا پیش قبض۔ کاندھے کے برابر ایک چھوٹی سی ڈھال۔

تیج تیوہار کا معاملہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے اپنے تیوہار ہندوؤں کے اپنے تیوہار۔ لیکن جو لوگ اکٹھے میلے ٹھیلے کر رہے تھے وہ ایک دوسرے کے تیوہار سے بے تعلق تو نہیں رہ سکتے تھے۔ "ہندوؤں کے گھر تیج تیوہار ہوتا تو ان کے بچے مٹھائیاں لیکر مسجد کے مکتب میں اُستادوں کی خدمت میں پہنچتے۔ گھروں پر جا کر اُستادوں کو تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دیتے اور اُستاد ہنسی خوشی دعوت قبول کر لیتے۔ مسلمان بھی ہندوؤں کے مذہبی تیوہاروں کا احترام سے ذکر کرتے۔ کوئی ایسی بات نہ کرتے جس سے ہندوؤں کے رسم و رواج کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔" (۸) ہولی پر جتنے سانگ بھرے جاتے بادشاہ کے جھروکے کے نیچے سے گزرتے اور انعام لے کر رخصت ہوتے۔ دسہرے کے دن بادشاہ سلامت دربار کرتے۔ پہلے نیل کنٹھ اُڑاتے، پھر باز کو ہاتھ پر بٹھاتے، پھر سہ پہر کو سجے بنے مہندی سے رنگے گھوڑوں کو ملاحظہ کرتے۔ (۹) دوالی کے موقعہ پر لال قلعہ میں ایک ترازو نصب ہوتی۔ دوالی کے تیسرے دِن بادشاہ سلامت چاندی سونے میں

تلتے۔ یہ چاندی سونا محتاجوں میں تقسیم ہوتا۔ "رات کو بیٹوں کے ہاتھی، بیٹیوں کی ہٹڑیاں کھیلوں بتاشوں سے بھری گئیں۔ ان کے آگے روشنی ہوئی۔ نوبت، روشن چوکی اور باجا بجنے لگا۔ چاروں کونوں میں ایک ایک گنا کھڑا کیا، نیبوؤں میں ڈورے ڈال کر ان میں لٹکا دیئے۔ صبح کو وہ گنے اور نیبو حلال خوروں کو دے دیئے۔ رتھ بان بیلوں کو بنا سنوار، پاؤں میں مہندی لگا، رنگ برنگ کی اس پر نقاشی کر، سینگوں پر قلعی دار سنگوٹیاں، گلوں میں گھنگرو، اُوپر کار چوبی باناتی جھولیں پڑی ہوئی، چھم چھم کرتے چلے آتے ہیں۔ بیلوں کو دِکھا، انعام و اکرام لے اپنے گھروں میں آئے۔ دوالی ہو چکی۔" (١٠)

اہلِ دل بہانہ ڈھونڈتے پھرتے۔ جہاں گہماگہمی دیکھی وہیں پسر گئے۔ عید کی چہل پہل میں شریک، دوالی کی دُھوم دھام میں بھی شامل۔ ہولی آئی تو لال گلال اُڑاتے رنگ چھلکاتے پھرے۔ خود بھی شرابور ہوئے دوسروں کو بھی شرابور کیا۔ محرم لگا تو گلے میں سبز کفنی ڈالی، جھولی میں الائچی دانے، سونف اور خشخاش بھری اور امامِ مظلوم کے فقیر بن گئے۔ تیزم تیز امام باڑے پہنچے۔ دیکھا کہ بادشاہ سلامت لال کھاروے کی ایک لنگی باندھے بھری مشک کاندھے پہ لادے عباس علمدار کے سقے بنے کھڑے ہیں اور بچوں کو شربت پلاتے ہیں۔ وہاں سے تبرک کا ملیدہ لیا، ملیدہ پھانکتے گھر آئے۔ محرم کے بعد آخری چہار شنبہ، آخری چہار شنبہ کے بعد بارہ وفات، بارہ وفات کے بعد خواجہ بختیار کاکیؒ کا عرس۔ لپک جھپک درگاہ پہنچے۔ دیکھا کہ مہندی چڑھتی ہے۔ شہزادے گلاب کے شیشے اور قبر کا غلاف سروں پر اُٹھائے چلے آتے ہیں۔ مہندی دیکھی، عرس کے مزے لوٹے۔ اس کے بعد گیارھویں شریف آ گئی۔ پھر مہندی چڑھتی دیکھی اور پھر تبرک کھایا۔ گیارہویں شریف گئی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی سترھویں آ گئی۔ سترھویں گزری تو مدار کا مہینہ آن پہنچا۔ مدار صاحبؒ کی چھڑیاں کھڑی ہوئیں تو وہاں جا پہنچے اور ملیدہ لوٹ کر کھایا۔ مدار صاحب کی چھڑیاں گئیں تو خواجہ صاحب کی چھڑیاں آ گئیں۔ اہل دل اجمیر شریف سدھارے۔ وہاں سے پھرے تو درگاہ کا صندل، صندل کی کنگھیاں اور تسبیحیں لیتے آئے۔

تیوہاروں کا تار ٹوٹتا تو عرسوں کا موسم شروع ہو جاتا۔ عرسوں کے موسم میں وقفہ آتا تو موسموں کے میلے شروع ہو جاتے۔ آج بسنت کا میلہ، کل پھُول والوں کی سیر۔

بسنت پالا اڑنت۔ کھیتوں میں سرسوں پھُولی، شہر میں بسنتی پوشاکوں کی بہار آئی۔ میلہ کا سماں بندھا۔ عرق گلاب اور بید مشک کی وہ بارش ہوئی کہ بسنتی پوشاکیں تربتر ہو گئیں۔ میلہ قدمگاہ رسول سے شروع ہوا، قدم قدم چلا اور درگاہ درگاہ پھرا۔ قدمگاہ رسول سے حضرت بختیار کاکیؒ کے مزار پر۔ وہاں سے چراغؒ دِلی۔ چراغ دِلی سے درگاہ نظام الدین اولیاءؒ کی طرف۔ درگاہ نظام الدین اولیاء سے حضرت حسنؒ رسول نما کے مزار پر اور سب سے آخر میں پانچویں دن مزار حضرت شاہ ترکمان پر۔

پھر گرمی نے ڈیرے ڈالے۔ جلتی بلتی لمبی دوپہریں۔ دِن میں لُو، رات کو حبس۔ اساڑھ کا مہینہ آیا۔ آس پاس برسے، دِلی پڑی ترسے۔ خدا خدا کر کے یہاں بھی چھینٹا پڑا۔ ساون لگا۔ ساون کے ساتھ ساون کی جھڑی لگی۔ گھروں میں اور باغوں میں جھولے پڑے۔ برہ کے گیت گائے جانے لگے۔

چھپر پرانے ہو گئے اور کڑکن لاگے بانس
آون کو پیا کہہ گئے آئے نہ بارہ مانس

ساون بھی گزر گیا۔ اب بھادوں کے دن ہیں۔ شہر کے دو معزز ہندو، دو معزز مسلمان قلعہ میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ جہاں پناہ ساون بیت گیا۔ بھادوں کی پھوار پڑتی ہے۔ شمسی تالاب اُمنڈا ہوا ہے۔ یہ پھُول والوں کی سیر کا سمے ہے۔ تاریخ مقرر کی جاوے۔ بادشاہ سلامت نے تاریخ مقرر کر دی۔ شہر میں نفیری بجی ۔ گلی گلی میلے کی دُھوم پڑی۔ پہلے قلعہ والوں کی سواری چلی، کوئی پالکی میں کوئی نالکی میں۔ اگلے دن صبح سویرے بادشاہ سلامت کی سواری نکلی۔ چوبداروں نے آواز لگائی۔ "ادب سے تعظیم سے مجرا بجا لاؤ، حضرت بادشاہ سلامت۔" آگے آگے نشان کا ہاتھی۔ پیچھے نقارے کے اونٹ، ترک سوار، روشن چوکی، ان کے پیچھے شہزادے کوئی گھوڑے پر، کوئی تخت رواں پر، کوئی تام جھام میں۔

سواری بادبہاری قطب صاحب پہنچی۔ قطب صاحب نے رونق پائی۔ برسات کی بہار میں ایک اور بہار لگی۔ امریوں میں گلبدنوں، پری چہروں کا جمگھٹا ہوا۔ آموں کی لٹس پڑی۔ کڑھائیاں چڑھیں، پکوان پکے۔ ایک شور موروں کی جھنکار کا، ایک شور شہزادیوں کی کلکاریوں کا۔ کوئی پھوار میں بھیگتی ہے اور طرارے بھرتی ہے۔ کوئی جھولے

میں بیٹھی پینگ بڑھاتی ہے اور گیت گاتی ہے:

جھولا کن نے ڈارو ری امریاں
باگ اندھیرے تال کنارے
مورلا جھنکارے بادر کارے
برسن لاگیں بوندین پھوئیاں پھوئیاں
جھولا کن نے ڈارو رئے امرئیاں

ابھی جھولا جھولا جا رہا تھا اور ابھی بادشاہ سلامت کا اشارہ پاتے ہی یہ جا وہ جا۔ اب ڈار کی ڈار قلانچیں بھرتی جھرنے کی طرف چلی جا رہی ہے۔ جھرنے پہ پہنچ کر چاروں طرف کا جائزہ لیا، پردے کا پورا اِنتظام دیکھا۔ بس پھر لیا تھا اللہ دے اور بندہ لے۔ دوپٹے، کرتے، ڈھیلے پائجامے اتار کے وہ پھینکے۔ چست جامے پہنے اور غڑاپ سے جھرنے میں۔ کوئی ڈبکیاں لگاتی ہے، کوئی دوسری پر چھینٹے اُڑاتی ہے، کوئی کسی کی ٹانگ کھینچتی ہے۔ اِس دھاچوکڑی میں کسی کی چولی مسک گئی، کسی کا پنڈا کھل گیا۔

قلعہ والوں کے بعد خلقت کی باری آئی۔ ہندو، مسلمان، چھوٹا بڑا، غریب امیر، عورت مرد سب قطب صاحب کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں۔ امرا اپنی بگھیوں میں، رنڈیاں اپنی بجی بنی رتھوں میں، ترچھے بانکے اپنے اپنے گھوڑوں پہ۔ غریب غربا لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے ہیں۔ بے فکروں نے لنگوٹ کسے ہیں، انگوچھے اور تہمد باندھے ہیں، سر پہ مٹکا رکھا ہے۔ بوندوں میں بھیگتے چلے جاتے ہیں۔ مٹکے میں نیا جوڑا اور جوتا رکھا ہے۔ میلہ میں پہنچ کر نہا دھو کر جوڑا پہنیں گے اور اوپچی بن جائیں گے۔

خلقت پہنچی تو میلے نے زور پکڑا۔ سیلانی البلے گہلے پھرتے ہیں۔ بے فکرے اپچی بنے گھومتے ہیں، کلے میں بیڑا دبا ہوا، گلے میں بیلے، موتیا، مولسری کے ہار پڑے ہوئے۔ ساقی کی پکار پر ٹھٹکے، بیلے چنبیلی کی لڑیوں میں اُلجھی خس میں لپٹی نے کو سنبھالا، دو گھونٹ بھرے اور آگے بڑھ لیئے کہ آگے پنکھے کے جلوس کی دھوم دھام ہے، خاص و عام کا اژدہام ہے۔ پوشاکیں رنگ رنگ کہ ہندو ہے تو سر پہ گنبد نما پگڑی بندھی ہے اور مسلمان ہے تو سر پہ زعفرانی عمامہ سجا ہے یا چوگوشیہ ٹوپی منڈھی ہے۔ گلوں میں گجرے ڈالے، ہاتھوں میں پھُولوں کی لڑیاں لپیٹے، خس کے پنکھے جھلتے، پھوار میں

بھگتیے خوش خوش چلے جاتے ہیں۔ بیچ میں پھولوں سے سجا ایک رنگین بانس میں آویزاں بڑا سا پنکھا ہے۔ آگے پیچھے اکھاڑے اور رسالے چلتے ہیں۔ نفیری بجتی ہے۔ طبلہ سارنگی والے طبلہ سارنگی بجاتے ہیں۔ ناچنے والیاں پاؤں میں گھنگرو باندھے چھم چھم ناچتی ہیں۔

میلہ ختم ہوا۔ خلقت کہ قطب صاحب ڈھل گئی تھی واپس ہونے لگی۔ دِلی کہ خالی سی ہو گئی تھی بھرنے لگی۔ پھر وہی کوچہ کوچہ جمتی پھڑیں اور چوک کی سیریں۔ کچھ سیر و تفریح، کچھ کھیل کود، کچھ ورزش کے مشغلے۔ دیوان خانوں میں کہیں شطرنج کی بساط بچھی ہے، کہیں گنجفہ، کہیں چوسر۔ گلیوں میں کوڑیاں کھیلی جا رہی ہیں، انڈے لڑائے جا رہے ہیں۔ بازیوں میں پتنگ بازی، کبوتر بازی، مرغ بازی۔ شکاروں میں شکرے اور باز کا شکار۔ پھر ورزش کا مشغلہ۔ دیوان خانے ہی نہیں اکھاڑے بھی آباد تھے۔ حویلیوں والوں نے اپنی حویلیوں کے اندر اکھاڑے کھدوا رکھے تھے۔ کیا اشراف کیا عوام ڈنڈ بیٹھک سب نکالتے تھے۔ مگدر گھماتے تھے، کشتی کے داؤں سیکھتے تھے، پنجہ لڑاتے تھے، بانک بنوٹ کی مشق کرتے تھے، تیراندازی اور نیزہ بازی میں کمال حاصل کرتے تھے۔

انہیں سرگرمیوں کے بیچ علم و ادب کی سرگرمی بھی جاری تھی۔ اکھاڑوں اور مشاعروں میں برابر کی رونق تھی۔ مسجدیں، مطب، مدرسے، خانقاہیں، یہ نمائندہ تعلیمی اور تہذیبی ادارے تھے۔ پھر وہ افراد تھے جو اداروں کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ مولوی امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی فضل حق خیرآبادی ایسے عالم فاضل کہ اپنی ذات میں ادارے تھے۔ مفتی صدرالدین نہ مدرس تھے نہ معلم تھے مگر تحصیل علم کے جویا مودب ہو کر بیٹھتے اور درس لے کر جاتے۔ بات یہ ہے کہ وہ آج کے نئے معاشروں کی طرح کوئی غیر روایتی معاشرہ نہیں تھا جس میں بقول ایلن ٹیٹ یہ گنجائش نہیں ہوتی کہ پچھلوں سے حاصل کیا ہوا علم اگلوں تک منتقل کیا جا سکے۔ سو علم کی تدریس اب پیشہ ہے مگر وہ ایک روایتی معاشرہ تھا جس میں پچھلوں سے حاصل کیا ہوا علم اگلوں تک منتقل کرنا ایک فریضہ تھا، پیشہ نہیں تھا۔ اور پیشوں کی صورت وہاں یہ تھی کہ وہ پیشوں سے زیادہ ایک تہذیبی روایت نظر آتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ پیشے ایک روایتی معاشرے میں پروان چڑھے تھے اور روایتی معاشرے کی ایک صفت

ایلین ٹیٹ نے یہ بتائی ہے کہ وہاں زندگی کی اِقتصادی بنیادیں اخلاقی ضابطہ سے متصادم نہیں ہوتیں، بلکہ اس کے ساتھ پیوست ہوتی ہیں۔ دِلی میں یہی صورت تھی۔ وہاں آدمی کو روزی کمانے کے لیئے اپنے اخلاقی شعور کو معطل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ اس کی پوری گنجائش تھی کہ روزی کمانے کے عمل میں اپنی اخلاقی تربیت کی جائے اور اپنے انسانی وصف کو جلا بخشی جائے۔ سو نقشہ یہ تھا کہ دکاندار دکانداری کرتے تھے مگر کاروباری ذہنیت نہیں رکھتے تھے۔ پیشہ ور اپنے اپنے پیشہ میں صاحب کمال تھے مگر پیشہ ورانہ رویہ نہیں رکھتے تھے۔ البتہ ان کی اپنی اپنی وضع تھی جو ان کے اخلاقی شعور اور پیشہ ورانہ دیانت سے نشوونما پاتی تھی۔ صاحب کمال پیشہ ور کچھ اپنے کمال سے نامور ہوتے تھے، کچھ اپنی وضعداری سے شہرت پاتے تھے۔ جیسی تہذیب ویسے اس کے پیشے اور ہنر۔ نفیس اور باریک کام اس تہذیب میں بہت تھا۔ ہنرمند کیسا کیسا ہنر اپنی پوروں اور ناخنوں میں لیئے بیٹھے تھے۔ کامدانی، تارکشی، زردوزی، سلمہ ستارے کا کام، ہاتھی دانت کا کام، چکن سازی، چٹائی کاری۔ ان ہنر رکھنے والوں کا ہنر اپنی نفاست اور باریکی کے زور پر فنونِ لطیفہ کی حدوں کو چھوتا تھا۔ پھر اور پیشہ ور بھی تھے۔ گل فروش، تنبولی، نانبائی، کبابی، نہاری والے، حلیم والے۔ ہر پیشہ ور کا اپنا پیشہ اور اپنی وضع۔ پیشہ میں پختہ اور وضع میں پکا۔ جس کے ہنر نے شہرت پائی اس کی وضعداری بھی شہرت پکڑ گئی۔ ہنرمند کی وضعداری ایک اخلاقی طاقت بن کر اس کے ہنر کو جلا بخشتی تھی اور اس کی دکان ایک تہذیبی مرکز کی شکل اختیار کر جاتی تھی۔

پیشوں میں ایک پیشہ طبیب کا تھا۔ مگر اس تہذیب میں یونانی طب ایک پیشہ سے بڑھ کر ایک علمی روایت تھی۔ یونانی طب مسلمانوں کے ساتھ سفر کرتی ہوئی ہندوستان پہنچی تھی مگر ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کی بوباس اس نے بغداد ہی میں پکڑ لی تھی۔ خلیفہ ہارون رشید کے وقت میں ہندوستان کا ایک وید منکہ شاہی دعوت پر بغداد پہنچا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ منکہ کی قدردانی نے ہندوستان کے اور ویدوں کو بھی سفر پر اُکسایا۔ کتنے ہی وید اپنی خاص دوا دارو لے کر بغداد پہنچے۔ ان کی دوائیں مقبول ہوئیں اور رفتہ رفتہ یونانی طب کے نسخوں میں راہ پا گئیں۔ ہندوستان پہنچ کر یونانی طب نے یہاں کا مزید اثر قبول کیا۔ دِلی میں یونانی طب ہند اسلامی تہذیب کا ایک باوقار علمی

ادارہ بن گئی۔

دِلی میں طبیب خالی طبیب نہیں تھے اور مطب محض مطب نہیں تھے۔ مطب مجلسی زندگی کے مرکز تھے۔ طبیب علم و ادب کی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ اور مجلسی زندگی میں بہت عمل دخل رکھتے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں، گورے چٹے، گول چہرہ، سفید ڈاڑھی، سفید لباس۔ طب کے ساتھ تاریخ کے بھی شناور تھے۔ شعر و ادب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ظہیر دہلوی کو اکسایا کہ کوئی داستان لکھو۔ اس طرح اِن سے قصہ ممتاز، لکھوایا۔ بہادر شاہ ظفر کے معالج خاص تھے مگر خالی علاج نہیں کرتے تھے، سارے امورِ سلطنت میں دخیل تھے۔ خطابات سے نوازے گئے اور احترام الدولہ، عمدۃ الحکماء، معتمد الملک، حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر ثابت جنگ کہلائے جانے لگے۔

حکیم غلام نجف خان نے دربار سے عضدالدولہ کا خطاب پایا۔ مریض ان کی طرف دوڑتے تھے، وہ شاعروں کی طرف دوڑتے تھے۔ غالب کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ ایک غریب مریض نے ان سے علاج کراتے کراتے کہیں دوسرے طبیب سے رجوع کر لیا۔ اِس مریض کی کم بختی آ گئی۔ غالب نے غریب کی وکالت میں رقعہ لکھا اور سمجھایا "میری عرض مانو اور ہیرا سنگھ کی تقصیر معاف کرو۔ بھائی انصاف کرو، اس نے اگر حکیم احسن اللہ خاں سے رجوع کیا تو وہ بھائی بھی ہیں اور تم کو ان سے استفادہ بھی ہے۔ اگر گھبرا کر حکیم محمود خاں کے پاس گیا تو ان کے باپ سے تم کو نسبت تلمذ کی ہے۔ ابتدا میں ان سے پڑھے ہو۔ پس یہ غریب گیا تو تمہارے ہی علاقے میں گیا۔ (۱۱)

حکیم آغاجان عیش خود شاعر تھے۔ "میانہ قد، خوش اندام، سر پر ایک ایک انگل بال سفید۔ ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری سرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ململ کا کرتا جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔" (۱۲) "شاہی طبیب تھے مگر قلعہ میں کم اور قلعہ کی دیوار کے آس پاس زیادہ منڈلاتے نظر آتے تھے۔ یہ قلعہ کی وہ دیوار تھی جس کے سائے میں ایک مجذوب شاہ بھورے پڑا تھا۔ حکیم آغا جان اس کے مرید تھے۔ ساتھ میں شاعری بھی لگی ہوئی تھی۔ شاعر ایسے کہ بارہ دیوان موٹے موٹے

مرتب کیئے مگر چھپائے بیٹھے رہے۔ مرتے وقت بیٹے کو وصیت کر گئے کہ کلام نہ تو چھپوانا نہ کسی کو دکھانا ورنہ قیامت میں دامن گیر ہوں گا۔ (۱۳) بیباک ایسے کہ بھرے مشاعرے میں غالب کی ہجو پڑھ ڈالی۔

حکیم مومن خاں، طبیب سے زیادہ شاعر۔ شاعر سے زیادہ عاشق۔ ساتھ میں نجوم ورمل کا بھی شوق لگا ہوا تھا۔ پردہ نشینوں کی نبض بھی دیکھتے جاتے ہیں اور ستاروں کا حساب بھی لگاتے جاتے ہیں۔

حکیم امام الدین خاں، حکیم غلام حیدر خاں، حکیم نصراللہ خاں، حکیم حسن بخش خان حکیم ابو خاں، سب اپنے اپنے طور پر طب میں ممتاز، ساتھ میں علوم معقول و منقول کے شناور۔ منطق، فلسفہ، ہیئت، ہندسہ میں دستگاہ کامل۔

دِلی ایک سطح پر سیلانیوں کا شہر تھا، دوسری سطح پر علماء حکماء فقراء اور شعراء کا قریہ تھا۔ بعض قلعہ سے وابستہ تھے۔ دوسرے اپنے اپنے کوچے میں مرجع خلائق بنے بیٹھے تھے۔ انہیں کوچوں میں ایک کوچہ بلیماراں نام کا تھا جس کے متعلق ایک شاعر نے کہا تھا۔

بلیماراں کا محلّہ صفاہانِ دہلی

چاوڑی اور چاندنی چوک کے بیچ لگ بھگ آٹھ سو قدم کا ایک بازار۔ بازار میں بیٹھا ہوا کوئی مینہار، کوئی عطار، کوئی نیچہ بند، کوئی صندوق فروش، کوئی ریشم والا، کوئی جہیز کا سامان بیچنے والا۔ آگے چل کر ایک مسجد جس کے عقب کے مکان میں غالب نے ڈیرا ڈالا اور یہ شعر کہا ؎

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

اس مسجد کی محراب پر ایک کتبہ رقم ہے ؎

شکر خدا بلغیِ محمد شریف خاں
شد طرح مسجدے کہ بود کعبۂ صفا
برخاست چوں ندائے موذن خطیبِ عقل
گفتا بجوئے سال دے از خانۂ خدا

۱۲۶۱ھ

یہ شریف خاں حکیم شریف خاں تھے جنھوں نے اپنے وقت میں اس کوچے کو بسایا۔ ایک حویلی کھڑی کی، ایک مسجد بنائی۔ حویلی شریف منزل کہ مسجد کے روبرو ہے۔ حکیم شریف خان کو دنیا سے رخصت ہوئے ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ اب ان کی مسند پر ایک اور شخص بیٹھا ہے۔ کسرتی بدن، لانبا قد، گورا رنگ، سر پر پٹے، گول بھری ڈاڑھی، بر میں سفید ململ کا انگرکھا، سر پہ دوپلی ٹوپی، ٹانگوں میں آڑا پائجامہ۔ قلعہ سے دور، شاہی نوازش سے بے نیاز۔ یہ حکیم محمود خاں ہیں، حکیم شریف خاں کے پوتے۔

حواشی

۱۔ داستان غدر صفحہ ۵۶ / ۵۵ --- رمبلز اینڈری کلیکشنز آف این انڈین آفیشل صفحہ ۴۹۹
۲۔ ذکاء اللہ آف دہلی، مصنفہ سی ایف اینڈریوز صفحہ ۵
۳۔ آثار الصنادید صفحہ ۲۳۸
۴۔ آثار الصنادید صفحہ ۲۳۷
۵۔ آثار الصنادید صفحہ ۲۳۶
۶۔ آثار الصنادید صفحہ ۲۳۵
۷۔ آثار الصنادید صفحہ ۲۳۸-۳۹
۸۔ سی، ایف، اینڈریوز ذکاء اللہ آف دہلی، صفحہ ۱۱
۹۔ ذکاء اللہ آف دہلی، صفحہ ۱۶
۱۰۔ بزم آخر صفحہ ۶۰
۱۱۔ بزم آخر صفحہ ۶۱
۱۲۔ اردوئے معلّٰی (جلد دوم) صفحہ ۴۳۹
۱۳۔ مضامین فرحت (حصہ اول) صفحہ ۲۰۴

خاندانِ شریفی

جاننا چاہیے کہ حکیم محمود خاں بیٹے تھے حکیم صادق علی خاں کے، اور حکیم صادق علی خاں بیٹے تھے حکیم شریف خاں کے کہ اس بزرگ کی نسبت سے یہ خاندان، خاندانِ شریفی کہلایا اور خاندانِ شریفی مٹی تھی سمرقند کی کہ جہاں آباد میں آکر زرخیز ہوئی۔ ناموروں نے اس خاندان کے خاندانی حالات منتشر اوراق میں جہاں تہاں یوں قلمبند کئے ہیں اور اس طور سینہ بہ سینہ منتقل کئے ہیں کہ جب بابر نے ہند کی مہم ٹھانی تو لشکر آراستہ کرتے کرتے سمرقند سے چند بزرگانِ دین کو ہمراہ لیا کہ ان کی برکت سے مہم بخیر و خوبی سر ہو۔ یہ بزرگ اولاد تھے خواجہ عبیداللہ احرارؒ کی کہ مزار اس بزرگ کا سمرقند میں ہے اور بسر ہوئی اس کی ہرات میں۔ خواجہ عبیداللہ اصرارؒ بیٹے تھے محمود شاشی کے، اور محمود شاشی بیٹے تھے شہاب الدین شاشی کے، اور شہاب الدین شاشی بیٹے تھے محمد بش غری شاشی کے، اور محمد بش غری شاشی بیٹے تھے تاج الدین رومی شاشی کے، اور تاج الدین رومی شاشی بیٹے تھے خواجہ محمد بغدادی کے۔

سو یوں ہوا کہ بابر مارا مار کرتا سرزمین ہند میں داخل ہوا، اور برکت سے اِن بزرگوں کی فتح و کامرانی نے اس عالی ہمت کے قدم چومے۔ وہ بزرگ سرزمین ہند میں ورود کے بعد اول اول لاہور میں اقامت پذیر ہوئے۔ لاہور سے کشمیر چلے گئے۔ عہد اکبری میں اکبر آباد کی راہ لی اور اکبر آباد سے اِن بزرگوںؒ کی ایک شاخ حیدر آباد میں جاکر پھلی پھُولی۔ آج بھی اورنگ آباد ضلع مٹمٹہ میں دو مزار مرجع خلائق ہیں۔ ایک ہاشم کی مہندی کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرا کہ برابز میں ہے قاسم کی چوکی کہلاتا ہے۔ خواجہ محمد قاسم بیٹے تھے خواجہ محمد ہاشم کے۔ اور آگے حکیم محمد احمد خان نے جو

صاحبزادے تھے حکیم عبدالمجید خاں کے، اپنے اوراق میں یوں لکھا ہے:

"حاجی محمد قاسم کے ایک صاحبزادے حاجی محمد افضل اورنگ آباد سے بزمانہ اکبر بادشاہ اکبر آباد آگرہ میں قیام پذیر ہو کر ملازمین شاہی میں داخل ہوئے اور ایک صاحبزادے مدراس کی طرف تشریف لے گئے اور نرمل کٹھری دروازہ سرکل مالاپور میں جا کر مقیم ہوئے۔ مولوی قدرت اللہ اور مولوی عظمت اللہ بہت بڑے عالم دین اور صاحب دولت ہوئے ہیں جن کے پوتے ملا علی قاری شارح فقہ اکبر ہجرت کر کے مکہ چلے گئے اور مع گھر بار وہاں پر مقیم ہوئے اور حکیم فاضل خاں آگرہ ہی میں مقیم رہے۔ حکیم محمد واصل خاں شاہجہاں اور عالمگیر کے طبیب خاص مقرر ہوئے اور شاہجہاں کے زمانے میں عالمگیر کے ہمراہ دہلی آ گئے۔"

حکیم فاضل خاں اس خاندان میں پہلے طبیب تھے۔ یہاں سے اس گھرانے نے ایک نئی کروٹ لی۔ بزرگانِ دین کا گھرانا طبیبوں کا گھرانا بن گیا۔ حکیم واصل خان حکیم فاضل خاں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اکبر آباد سے نکلے اور دلی میں جا کر ڈیرا کیا۔ پھر دِلی ہی اس گھرانے کا مسکن ٹھہرا۔ اس شہر میں پہنچ کر بادشاہ کی نظروں میں چڑھے اور عہدہ طبابت پر مامور ہوئے۔

حکیم واصل خاں شاہی طبیب بن کر پوری طرح مطمئن نہیں ہوئے۔ کچھ اس شخص کی رُوحانی ضرورتیں بھی تھیں۔ سو دربار سے نکل کر اہل اللہ سے رجوع کیا۔ دلی اِن دنوں اہل ہنر، اہل علم اور اہل اللہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ شاہ کلیم اللہ شیخ نور اللہ کے بیٹے تھے اور شیخ احمد معمار کے پوتے کہ جس نے تاج محل اور لال قلعہ کی عمارتیں کھڑی کی ہیں۔ دادا صاحب ہنر، پوتا صاحب کرامت۔ مدینہ منورہ کا سفر کیا۔ شیخ یحیٰ مدنی کے مرید بنے۔ واپس آ کر خانم بازار میں ڈیرا کیا۔ توکل کو اپنایا اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ حکیم واصل خاں مرشد کی تلاش میں وہاں پہنچے اور ان سے بیعت ہوئے۔

ایک اور صاحب کرامت بزرگ تھے سید حسن رسول نما۔ لوگ کہتے تھے کہ اس بزرگ کو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تقرب حاصل ہے۔ جس پر مہربان

ہوتے ہیں اُسے حضورؐ کا دیدار کرا دیتے ہیں۔ اِس نسبت سے رسول نما کہلائے۔ حکیم واصل خاں نے اس چوکھٹ پر بھی حاضری دینی شروع کر دی۔ حسن رسول نما ان سے خوش ہوئے۔ دُعا دی اور کہا کہ تیری سات پشتوں تک دولت اور شہرت کی فراوانی رہے گی۔ ساتھ میں ہدایت فرمائی کہ اے عزیز، غریبوں، محتاجوں کا علاج مفت کیا کر۔ دونوں وقتوں میں ایک وقت دال مسور کھایا کر۔

حکیم واصل خاں نے ہدایت گرہ میں باندھی۔ عمر بھر خود بھی اِس پر عامل رہے اور اولاد کو بھی اسی راہ پر ڈال گئے۔ عمر لمبی پائی۔ عالمگیر کا زمانہ پورا کر کے شاہ عالم کا عہد دیکھا اور محمد شاہی عہد کے اوائل میں انتقال کیا۔ اِس حساب سے ان کا انتقال ۱۷۱۲ء کے آس پاس ہوا۔

حکیم واصل خاں نے پیچھے دو بیٹے چھوڑے۔ اکمل خاں جن کی عمر اس وقت سولہ برس کی تھی اور اجمل خاں جو اس وقت گیارہ کے بن میں تھے۔ محمد شاہ نے حکیم علوی خاں کو دونوں کے امتحان پر مامور کیا۔ علوی خاں نے امتحان لیا اور بادشاہ کو مطلع کیا کہ دونوں ہونہار ہیں۔ سو بادشاہ نے باپ کا منصب بیٹوں کے لئے برقرار رکھا۔ مگر بالآخر یہ منصب بڑے کے لئے مخصوص ہوا۔ چھوٹا فرزند خانہ نشین ہو گیا۔ گھر کے معاملات اور طب کے معاملات، بس انہیں سے معاملہ رکھا۔

حکیم اکمل خاں نے عہدہ طبابت پر مامور ہو کر بہت عروج پایا۔ سہ ہزاری منصب ملا۔ دو لاکھ کی جاگیر سوادِ عظیم آباد میں پائی۔ لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا کہ آخر انہیں بھی خانہ نشین ہونا پڑا۔ کہتے ہیں کہ ولی عہد کی طرف سے اشارہ ہوا کہ کسی دوا میں زہر ملا کر بادشاہ کو دے دو۔ حکیم اکمل خاں نے اس سازش میں شامل ہونے سے اِنکار کیا۔ مستزادیہ کہ بادشاہ کو خبردار کر دیا کہ کھانے پینے میں احتیاط اور نگہبانی کی ضرورت ہے۔ بادشاہ نے یہ ذمہ داری انہیں کو سونپ دی۔ اس کے بعد سے کھانے پینے کی ہر چیز حکیم صاحب کی مہر سے بادشاہ کے سامنے پہنچتی۔

محمد شاہ کے بعد احمد شاہ کا زمانہ آیا تو پھر اس نے حکیم صاحب سے اس کا بدلہ لیا۔ عہدے بھی گئے اور جاگیر بھی چھن گئی اور خانہ نشینی ان کا مقدر ٹھہری۔ تھوڑا عرصہ گزرنے پر بادشاہ کے رویے میں تبدیلی آئی۔ پھر عہدہ طبابت کی پیش کش ہوئی۔

مگر اس آن والے آدمی نے عہدہ قبول کرنے سے معذرت کر لی۔

حکیم اکمل خاں نے پیچھے دو بیٹے چھوڑے۔ محمد شریف خاں اور سعید خاں۔ دونوں صاحب علم و فضل تھے۔ مگر خاندان کا نام شریف خاں سے روشن ہوا کہ "سرامد حکماء اور سرطبقہ اطبا تھے۔ جالینوس و ارسطو کا غلغلہ، ان کے سامنے ایسا ہے جیسا طوطی کی آواز نقار خانے میں۔" (۱)

حکیم شریف خاں محمد شاہ کے زمانے میں ۱۷۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شاہ عبدالعزیز کے خاندان میں ہوئی۔ طب میں باپ اور چچا سے استفادہ کیا کہ دونوں مستند طبیب تھے۔ باہر کے اطبا میں حکیم عابد سرہندی اور حکیم اچھے صاحب کے سامنے زانوے تلمذتہ کیا۔ بڑے ہو کر شاہ عالم ثانی کے عہد میں شاہی طبیب بنے۔ اشرف الحکماء کا خطاب پایا۔ شاہی قدردانی کے ساتھ ساتھ خلقت کی طرف سے بھی بہت قدر ہوئی۔ علاج معالجہ کو قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا۔

مطب بھی کرتے تھے، شاگردوں کو درس بھی دیتے تھے۔ علمی و جملہ تحقیق و تفتیش بھی بہت کی۔ طب میں اجتہاد کیا، تجربے کئے اور کتابیں لکھیں۔ ان کی طبی تصانیف یہ ہیں:

۱۔ عجالہ نافعہ

۲۔ فوائد شریفیہ یعنی حاشیہ شرح اسباب

۳۔ شرح حمیات قانون

۴۔ حاشیہ کلیاتِ نفیسی

۵۔ تالیف شریفی

۶۔ رسالہ خواص الجواہر

۷۔ دستورالفصد

۸۔ علاج الامراض

علاج الامراض کی تاریخ یہ ہے کہ اسے دادا نے شروع کیا اور پوتے نے تمام کیا۔ حکیم واصل خاں نے اس طور آغاز کیا کہ جو نسخہ ان کے اپنے یا ان کے ہمعصروں کے تجربے میں آتا اُسے ایک بیاض میں نقل کر لیتے۔ یوں انہوں نے مرتے

وقت دو فرزندوں کے ساتھ ایک مجربات کا مجموعہ بھی چھوڑا۔ دونوں فرزندوں نے باپ کی سنت جاری رکھی اور مجربات بیاض میں نقل کرتے رہے۔ ان کی آنکھ بند ہونے کے بعد حکیم شریف خاں نے اِس بیاض میں اضافے کیے۔ اور تکمیلی شکل دے کر 'علاج الامراض' نام رکھا۔ نظرثانی سے پہلے ہی حکیم صاحب کا ایک شاگرد اُسے چرا لے گیا۔ مگر بیٹوں کے پاس اس کی نقلیں موجود تھیں، باپ کی نگرانی میں دوبارہ اسے جمع کیا۔ سو ان کی زندگی ہی میں یہ مجموعہ مرتب ہو کر داخل کتب خانہ ہو گیا۔ (۲)

حکیم صاحب کی علمی سرگرمیاں کچھ طب تک محدود نہیں تھیں۔ انہوں نے اس کے سوا بھی علمی کارنامے انجام دیئے۔ سب سے اہم کارنامہ قرآن شریف کا اُردو ترجمہ ہے جو انہوں نے شاہ عالم ثانی کے ایما پر کیا تھا۔ مشکوۃ شریف کا فارسی ترجمہ 'کاشف المشکوۃ' کے نام سے کیا۔ (۳)

حکیم شریف خاں نے اپنی علمی فضیلت، طبی اجتہادات، اور مقبولِ خاص و عام ہونے کے سبب وہ عظمت پائی کہ باپ دادا کے نام پس منظر میں چلے گئے خاندان پر ان کے نام کی چھاپ پڑ گئی۔ بادشاہ سے جو زمین ملی تھی اس پر ایک بڑی حویلی تعمیر کر ڈالی جس میں اس خاندان کی پشتیں پلیں بڑھیں اور جو آگے چل کر شریف منزل کے نام سے مشہور ہوئی۔

حکیم صاحب نے ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں وفات پائی۔ (۴) شاعر نے تاریخ یوں کہی:

دریغا ازیں دارِ فانی گزشت
حکیم و طبیب و لطیف و ظریف
خرد گفت سالِ و فاتش بمن
صد افسوس مرزا محمد شریف

۱۲۳۱ھ

بعض تذکرہ نویسوں نے تاریخ وفات ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء لکھی ہے، اور "دخل الجنتہ بلا حساب" مادۂ تاریخ لکھا ہے۔ جو مزار پر بھی کندہ ہے۔ پورا کتبہ یوں ہے

هوالحکیم

ہذا مرقد اشرف الحکماء محمد شریف خاں الدہلوی

"دخل الجنتہ بلا حساب" (۵) و (۶)

—— ۱۲۲۲ھ ——

حکیم شریف خان نے پیچھے چھ بیٹے چھوڑے، محمد اشرف خاں، شرف الدین خاں، محمد حسن بخش، محمد صادق علی خاں، محمد حسین بخش خاں، محمد امام بخش خاں۔ سب بیٹے اچھے طبیب تھے مگر حکیم صادق علی خاں نے سب سے بڑھ کر نام پایا۔ "اپنے والد ماجد کی طرح فن طبابت میں یکتائے روزگار تھے جن کی حذاقت کا شہرہ دُور دُور بلا دو امصار میں تھا۔ (۷) اور سرسید احمد خاں نے ان کی توصیف یوں کی:

"آج اس کمالاتِ ظاہری و باطنی کا جامع عرصہ روزگار میں جلوہ گر نہیں۔ علم و عمل ایک ساتھ اس بزرگ بلند فطرت کی ذات میں جمع ہے۔ نہ ان کے علم کی صفت زبانِ قلم پر آ سکتی ہے نہ عمل کی تعریف اندیشہ میں سما سکتی ہے۔" (۸)

اس بزرگ بلند فطرت انسان نے علم اور عمل کو اس طرح یکجا کیا کہ مطب بھی کرتے تھے اور طلبہ کو درس بھی دیتے تھے۔ ساتھ ساتھ طبی اور دوسرے علمی مسائل پر غور و فکر کر کے کتابیں بھی تصنیف کیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ شرح تشریح اعضائے مرکبہ

۲۔ زادِ غریب

۳۔ طریق تعلیم نسواں

۴۔ تقویت العقاید (جو مولوی اسمٰعیل شہید کی کتاب "تقویتہ الایمان" کے جواب میں لکھی گئی۔)

۵۔ صرف و نحو سے متعلق چند رسائل

۶۔ مخازن التعلیم

حکیم صادق علی خاں حکیم بڑے تھے مگر زمانہ انہیں اچھا نہیں ملا۔ یہ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ اب بادشاہ اور دربار کا نام ہی نام تھا۔ بات ایسٹ انڈیا کمپنی کی چلتی تھی

اور کمپنی حکیم صاحب سے خوش نہیں تھی۔ اس نے ساری شریفی جاگیر ضبط کر لی اور اولاد کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ بس وہ تین گاؤں کمپنی کی دستبرد سے بچ رہے جو حکیم شریف خاں نے ناداروں کے لئے وقف کیئے تھے۔

اس برے زمانے نے خاندانِ شریفی کو ایک نئے زمانے سے روشناس کیا۔ دربار سے وابستگی کا دَور ختم ہو رہا تھا۔ خاندانِ شریفی کی نظر نے آنے والے وقت کی نبض پہچانی۔ اُس نے دربار سے مُنہ موڑ کر خلقت سے رشتہ قائم کیا۔ حکیم صادق علی خاں شاہی طبیب نہ بن سکے تو کیا ہوا۔ وہ عوامی طبیب بن گئے اور یوں خاندانِ شریفی میں ایک نئی روایت کا آغاز کر گئے۔

حکیم صادق علی خاں اسی برس سے اوپر جئے۔ ۱۸۴۸ء میں انتقال کیا۔ سہراب بیگ نے تاریخ وفات کہی :

طبیب حاذق و عالم حکیم صادق بود

۱۲۶۴ ھ

حکیم صادق علی خان نے تین بیٹے چھوڑے غلام محمد خاں، غلام محمود خاں، غلام مرتضیٰ خاں۔ غلام محمد خاں کہ سب سے بڑے تھے باپ کی زندگی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ باپ کے انتقال سے چھ سال پہلے جب وہ ابھی چوالیسویں برس میں تھے مکہ معظمہ سے واپس آتے ہوئے دُنیا سے گزر گئے۔ حکیم غلام مرتضیٰ خاں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ ریاست پٹیالہ سے وابستہ ہو گئے۔ باپ کے جانشین منجھلے بیٹے حکیم غلام محمود خاں بنے۔

حکیم صادق علی خاں اور اکبر شاہ ثانی آگے پیچھے دُنیا سے سدھارے۔ ان کے بعد ادھر بہادر شاہ ظفر تخت پہ بیٹھے، ادھر حکیم محمود خاں شریفی مسند پر رونق افروز ہوئے۔ دربار کے ساتھ خاندانِ شریفی کا اب کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

حکیم محمود خاں دربار میں کبھی نہیں دیکھے گئے، فقیروں کے تکیے پر اکثر دیکھے جاتے تھے۔ دیوبند میں ایک مجذوب تھے گھسن شاہ۔ حکیم صاحب دلی سے دیوبند پہنچتے اور کئی کئی دن تک ان کی ہمراہی میں پیدل چلتے۔ (۹) دِلی میں ایک درویش حافظ عبدالرحمٰن نابینا تھے۔ حکیم صاحب ان کے مرید ہو گئے اور ان کا بتایا ہمیشہ بعد نماز

مغرب وِرد کرتے۔ (۱۰)

طبیعت میں غصہ بہت تھا۔ (۱۲) آن بان کے آدمی تھے۔ بعضے اطباء امراء کی عادت بگاڑ دیتے ہیں اور خوشامد میں جس طرح وہ چاہتے ہیں علاج کرتے ہیں، مگر محمود خاں صاحب کی یہ حالت تھی کہ جہاں کسی نے کہا کہ یہ دوا سرد ہے یا گرم، کہہ دیتے گدھے ہو، تم کیا جانو۔ (۱۳) " مہاراجہ کشمیر کے بلاوے پر کشمیر پہنچے۔ ہاتھوں ہاتھ لیئے گئے، عزت و احترام سے ٹھہرائے گئے۔ مگر جب صبح کو مہاراجہ کی نبض دیکھنے کے لئے چلنے لگے تو بتایا گیا کہ مہاراجہ صاحب تو صبح صبح مسلمان کی شکل دیکھنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ سو نبض اس کے بعد کسی وقت دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ سن کر اُس وقت تو چپ ہو رہے مگر جب سہ پہر کو نبض دیکھنے گئے تو ملازم سلفچی آفتابہ اور تولیہ لیئے ساتھ تھا۔ مہاراجہ کی نبض دیکھی۔ نبض دیکھنے کے بعد ملازم کو اشارہ کیا۔ ملازم سلفچی آفتابہ اور تولیہ کے ساتھ آگے بڑھا۔ حکیم صاحب نے مہاراجہ کے رُوبرو وہ ہاتھ جس سے نبض دیکھی تھی سلفچی میں دھویا اور تین مرتبہ پاک کیا۔ (۱۴)

اس رویے کی توجیح مولانا اشرف علی تھانوی نے یوں کی :

"بات یہ ہے کہ وہ اہل کمال تھے اور کمال میں خاصہ ہے استغنا کا۔" (۱۵)

امیروں کے ساتھ غصہ، غریبوں ناداروں کے ساتھ نرمی اس مستغنی المزاج حکیم کا شیوہ تھا اور کیا وضعدار آدمی تھے کہ شروع میں جو وضع اختیار کر لی وہ آخر تک قائم رہی۔ کیا گرمی، کیا جاڑے، کیا برسات ہر موسم وہی ایک لباس۔ دوپلی ٹوپی، سفید پائجامہ، بریں تن زیب کا انگرکھا۔ روز صبح کو گھوڑے پر سوار ہو کر سید حسن رسول نما کے مزار پہ جا کر فاتحہ پڑھنا اور شام کو فٹن میں سوار ہو کر ہوا خوری کے لیئے نکلنا۔ امیر غریب سب کا علاج یکساں توجہ سے کرنا اور نسخہ ہمیشہ دو پیسے والا لکھنا۔ علاج کی طریقے عجب تھے۔ ایک افغان پیٹ کے درد سے بلبلاتا مطب میں آیا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی اور کہا کہ جا چنے کھا لے۔ افغان نے جا کر چنے کھائے۔ شام کو مطب میں پھر حاضر ہوا۔ اب اُس کے پیٹ کا درد جاتا رہا تھا۔ کسی عزیز نے پوچھ لیا کہ حکیم صاحب پیٹ کا درد چنوں سے کیسے رفع ہو گیا۔ کہا کہ اس کے ہاتھوں کی چکنائی اور چربی کی بو سے میں نے جانا کہ اس نے بریانی کھا کر ٹھنڈا پانی پی لیا ہے، اِس کا علاج یہی تھا کہ چنے

کھلائے جائیں کہ وہ چکنائی کو جذب کر لیں۔

ایک معزز اور معمر بزرگ بخار کی شکایت لے کر آئے۔ نسخہ لکھا اور کہا کہ پسینہ آجائے گا اور بخار اُتر جائے گا۔ بزرگ دوسرے دن حاضر ہوئے، حال سنایا کہ نہ پسینہ آیا نہ بخار اُترا۔ نسخہ میں کچھ ترمیم کر دی۔ اگلے دن بزرگ پھر آئے پھر وہی کیفیت کہ نہ پسینہ آیا نہ بخار اُترا۔ حکیم صاحب نے غصے سے ان بزرگ کو دیکھا اور گرج کر کہا کہ صاحب آپ نرے گدھے ہیں۔ اس بزرگ نے یہ کلمہ سنا تو غیرت سے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ حکیم صاحب نے بزرگ کو پسینہ میں شرابور دیکھا اور نرمی سے کہا کہ برا مت مانئے، آپ کا یہی علاج تھا۔ پسینہ آگیا ہے، اب بخار اُتر جائے گا۔ اور بخار اُتر گیا۔

اِس آن بان کے ساتھ حکیم محمود خاں نے طبابت کی اور اپنے عہد کے سب سے بڑے طبیب مانے گئے۔ "زمانہ حال کے حکیموں میں سب سے بڑا مرتبہ جناب حکیم محمود خاں صاحب کا تھا۔" (١٦) مگر کونسا عہد اور کونسا زمانہ حال۔ حکیم محمود خاں نے اپنی زندگی میں دو عہد دیکھے اور برتے۔ ایک عہد ان کے دیکھتے دیکھتے بدل گیا۔ وہ ١٨٥٧ء تھا اور مئی کی ١١ تھی۔ دیسی سوار انگریز حاکموں سے رشتہ تڑا کر میرٹھ سے نکلے اور دِلی پہنچے۔ دِلی شہر فرنگی کے اثر سے آزاد ہو گیا۔ شہر شہر سے باغی، غازی اور سورما چلے اور دِلی پہنچے۔ غازیوں کا ایک لشکر لیکر بخت خاں پہنچا۔ سب غازیوں نے بہادر شاہ ظفر کو نذریں گزاریں اور ان کی قیادت میں فرنگی سے لڑنے کے لئے تیار ہوئے۔ دِلی سے باہر دو میل لمبی ایک پہاڑی ہے۔ وہاں انگریزی فوجوں نے مورچہ جمایا۔ دونوں طرف سے توپیں چلنے لگیں۔ تین مہینے دِلی کی فضائیں توپوں کی گھن گرج سے گونجتی رہیں۔

حکیموں میں حکیم احسن اللہ خاں فرنگیوں کا آلہ کار بن کر بہت سرگرم تھے۔ حکیم محمود خاں سارے قصے سے الگ اپنے مطب میں بیٹھے تھے۔ ان کے سرگرم ہونے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

آخر یوں ہوا کہ مجاہدوں کی مورچے منتشر ہوتے چلے گئے اور فرنگی توپوں کی گھن گرج بڑھتی چلی گئی۔ ١٤ ستمبر کو انگریزی فوجیں کشمیری دروازے کی راہ شہر میں

داخل ہوئیں۔ جوشِ مزاحمت یہ رنگ لایا کہ محلّہ محلّہ طوفان اُمنڈا اور گلی گلی خون کی ندیاں بہیں۔ مگر خلقت کی مزاحمت بے سود رہی۔ بہادر شاہ ظفر نے حوصلہ ہارا۔ لال قلعہ سے نکل مقبرہ ہمایوں میں جا بیٹھے۔ بخت خاں نے بادشاہ کی بے حوصلگی دیکھی اور غازیوں کے لشکر کو لے کر شہر سے نامعلوم منزل کی طرف نکل گیا۔ بس پھر انگریزی فوجوں کی بن آئی۔ شہر لٹنے لگا۔ لوگ مولی گاجر کی طرح کٹنے لگے۔

اب لال قلعہ خالی تھا۔ چاندنی چوک میں سولیاں گڑی تھیں۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نہ گزری بازار نہ قصہ خواں نہ لال پڈڑی والے۔ سیڑھیوں سے کوتوالی تک لاشیں پٹی پڑی تھیں۔ کنوین پردہ نشینوں کی لاشوں سے بھر گئے تھے۔ دِلی اب ایک غارت زدہ شہر تھا۔ خلقت گھروں سے نکل کھڑی ہوئی۔ پردہ نشین عورتیں برہنہ پا، برہنہ سر، بچوں کو سینوں سے چمٹائے ہوئے۔ مرد جمع پونجی بغل میں دبائے ہوئے، گٹھڑی سر پہ اُٹھائے ہوئے۔ مگر جاٹ گوجر لیٹرے بن کر نکلے ہوئے تھے۔ خود انگریز سپاہی لیٹروں سے بڑھ کر لیٹرے تھے۔ جس کے پاس جو دیکھا چھین لیا۔ پھر لہر آئی تو جان بخشی کی۔ موج میں آئے تو گولی مار دی۔ پریشان خلقت یہ نقشہ دیکھ کر اور پریشان ہوئی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جمع پونجی اور جانوں کو اکٹھا کیسے بچائیں۔ شفیق بادشاہ کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ اب کس در پہ جایا جائے اور کس شخص پہ بھروسہ کیا جائے۔ اس عالم میں جانے پہلے کسے یہ خیال آیا کہ ایک در شریف منزل بھی ہے جہاں بیٹھا ہوا حکیم دُکھ بیماری کا علاج کیا کرتا تھا اور مصیبت میں بھی ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ یہ خیال آنا تھا کہ پریشان خلقت بلیماران کی طرف چلی اور شریف منزل پر اُمنڈ پڑی۔

جیسے دِلی کے اور کوچے ویسا بلیماروں کا کوچہ۔ شروع میں وہاں کا حال بھی اچھا نہ تھا۔ غالب نے اُس وقت گلی قاسم جان کا جو حال دیکھا وہ یوں قلمبند کیا:

"کشت و خون اور پکڑ دھکڑ اس گلی تک آ گئی۔ خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے۔ اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے ہے۔ گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے۔ زیادہ تر رہنے والے چلے گئے ہیں۔ عورتیں بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھیں اور مردوں کے کاندھوں پر سامان کی گٹھریاں ہیں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے ہم سب نے

مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پتھر چن دیئے۔ گلی سربستہ تو تھی
ہی، دربستہ بھی ہو گئی۔" (۱۷)

مگر گلی اِس طوفان میں کتنی دیر دربستہ رہ سکتی تھی۔ اس کے بچاؤ کا بندوبست دوسرے ہی طور سے ہوا۔ جاننا چاہیے کہ دِلی میں داخل ہونے والی انگریزی فوج کی کمک پر نابھہ پٹیالہ اور چنبہ کے رسالے بھی تھے اور یہ وہ ریاستیں تھیں جو خاندانِ شریفی کی بہت قدردان تھیں۔ حکیم محمود خاں کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد خاں پٹیالہ سے وظیفہ پاتے تھے اور بالعموم وہیں رہتے تھے۔ اِن کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حکیم غلام اللہ خاں پٹیالہ میں رہے۔ حکیم محمود خاں کے چھوٹے بھائی حکیم غلام مرتضٰی خاں بھی پٹیالہ ہی میں رہتے تھے۔ خود حکیم محمود خاں کو ریاست چنبہ سے وظیفہ ملتا تھا۔

اِن ریاستوں سے خاندانِ شریفی کا یہ تعلق اِس آڑے وقت میں بہت کام آیا۔ اس واسطے سے اِس قیامت میں شریف منزل کی حفاظت کی صورت پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی پورے کوچے کی حفاظت ہو گئی۔ غالب نے اطمینان کا سانس لیا اور بعد کا احوال یوں قلمبند کیا:

"اِس مصیبت میں کام بننے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ فلک مرتبہ مریخ چشم راجہ نرندر سنگھ بہادر فرمانروائے پٹیالہ اس جنگ میں فاتحین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزی لشکر کی مددگار ہے۔ راجہ کے چند ملازمین خاص جو اِن کی سرکار میں اُونچے عہدوں پر ہیں اور شہر کے نامور اور قابل عزت لوگوں میں سے ہیں، حکیم محمود خاں، حکیم مرتضٰی خاں، حکیم غلام اللہ خاں جو حکیم شریف خاں جنت مکاں کی اولاد میں ہیں، اس کوچے میں رہتے ہیں۔ دُور تک ان کی دو رویہ عمارتیں چلی گئی ہیں۔ میں دس سال سے اِن میں سے ایک صاحب جاہ ثروت کا پڑوسی ہوں۔ اِن تین حضرات میں سے اول الذکر متعلقین اور اہل خانہ کے ساتھ اپنے بزرگوں کی طرح باعزت زندگی بسر کرتے ہیں اور باقی دونوں حضرات پٹیالے میں راجہ کی مصاحبت میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ رہتے ہیں۔ چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی، راجہ نے ازراہ بندہ پروری طاقتور اور جنگجو

سے طے کر لیا تھا کہ جب (شہر) فتح ہو گا۔ اِس کوچے کے دروازے پر
محافظ مقرر کر دیے جائیں گے تاکہ انگریز فوجی جن کو گورا کہتے ہیں گھروں
کو نقصان نہ پہنچائیں۔" (۱۸)

سو اس کوچے کے ناکے پر محافظ بیٹھ گئے۔ بلیماراں لٹتے پٹتے کوچوں کے بیچ امن کا کوچہ بن گیا۔ غالب نے منشی ہرگوپال تفتہ کو خیریت کا خط بھیجا اور لکھا کہ:

"بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں
کہاں اور یہ شہر کہاں۔"

اور مختلف کوچوں سے نکلے ہوئے پریشان حال لوگ شریف منزل پہنچے اور عرض پرداز ہوئے کہ حکیم صاحب ہماری جمع جتھ آپ کے حوالے۔ ہم اِس شہر سے نکلتے ہیں۔ جیتے بچے تو واپس آئیں گے اور اپنی امانت واپس لے لیں گے۔ حکیم صاحب کا مطب بند پڑا تھا۔ آج وہ طبیب بن کر نہیں امین بن کر شریفی مسند پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے بے آسرا لوگوں کی بہت دلگیری کی۔ جہاں بیٹھے تھے وہاں سامنے ایک کوٹھری تھی جس میں پوٹلیاں، گٹھریاں، بقچے، صندوقچے ڈھیر ہو رہے تھے۔ ہر امانت رکھنے والے سے کہتے کہ عزیز اپنی گٹھری پر اپنا نام لکھ اور خود جا کر سامنے والی کوٹھری میں رکھ آ۔ میں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ جب واپسی ہو تو خود اپنے مال کی پہچان کرنا اور لے جانا۔

اتنی امانتیں اکٹھی ہوئیں کہ کوٹھری بھر گئی۔ لگتا تھا کہ دلی کی ساری جمع جتھ اس کوٹھری میں اکٹھی ہو جائے گی۔ لال قلعہ خالی تھا، شریف منزل بھر رہی تھی۔ لال قلعہ کا اعتبار اُٹھ چکا تھا۔ مگر اسی قیامت میں شہر کے بیچ اعتبار کا ایک نیا مرکز قائم ہو رہا تھا۔ لال قلعہ سے اِقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں آیا اور اعتبار شریف منزل کی طرف منتقل ہوا۔ حکیم محمود خاں شریف خانی روایات کے والی وارث تھے۔ مگر اب شریف خانی روایات سے بڑھ کر ایک اور روایت کی امانت ان کے سپرد ہو رہی تھی۔ جس تہذیب کا امین اب تک لال قلعہ کو سمجھا جاتا تھا وہ اب ایک نئے امین کی تلاش میں تھی۔ دلی والوں کی امانتوں کے ساتھ شاید اس تہذیب کی امانت بھی شریف منزل میں منتقل ہو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے خونریزی بند ہوئی۔ مگر اس کے بعد مخبر سرگرم عمل ہوئے۔ مخبری پر گرفتاریاں ہونے لگیں۔ اب حکیم محمود خاں کا ایک پیر مطب میں تھا، اور دوسرا تھانے کچہری میں۔ سرپرست ریاستوں کی بدولت خاندانِ شریفی کو جو تحفظ ملا تھا اور مراعات حاصل ہوئی تھیں ان سے اس بزرگ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جو غریب پکڑا جاتا اس کے متعلق جا کر کہتے کہ یہ میرا رشتہ دار ہے اور بے گناہ ہے۔ اس طرح انہوں نے بہت سوں کو قید سے چھٹکارا دلایا۔ جن لوگوں کی جائدادیں ضبط ہوئی تھیں ان میں سے کتنوں کی جائیدادیں کہہ سن کر واگذاشت کرائیں۔

ایسے بھی تھے جنہوں نے بے گھر، بے در ہو کر شریف منزل ہی میں ڈیرے ڈال دیے۔ رفتہ رفتہ پانچ سو کی تعداد میں بے خانماں یہاں اکٹھے ہو گئے، اور شریف منزل ایک اچھا خاصا مہاجر کیمپ بن گئی۔ یہ خبر کسی طرح نکل گئی اور حاکموں تک پہنچی، بقولِ غالب:

"شاید بد خصلت مخبروں کے کہنے سے حاکم شہر کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ راجہ نرندر سنگھ بہادر کے طبیبوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔" (۱۹)

مگر ممکن ہے کہ یہاں پناہ لینے والوں میں کچھ غازی بھی رلے ملے ہوں جس کی سن گن حکام کو ملی ہو۔ بہرحال کوئی ایسی ہی بات تھی کہ حکیم محمود خاں سرپرست ریاستوں کے مہیا کردہ تحفظات کے باوجود یکایک معتوب ہوئے اور گرفتار ہو گئے غالب کا بیان یہ ہے کہ ۲ فروری کو حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ خاں اور ان کے بھتیجے عبدالحکیم خاں عرف حکیم کالے معہ ساٹھ پناہ گزینوں کے گرفتار ہوئے۔ ۵ فروری کو جمعہ کے دن تینوں حکیموں کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ ۱۲۔ اور ۱۳ فروری کو کچھ اور اشخاص رہا ہوئے۔ نصف سے زیادہ حوالات میں رہ گئے۔ (۲۰) مگر اسی زمانے کے ایک اور راوی غلام حسین نے یہ وقعہ یوں قلمبند کیا ہے:

"جب انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی تو ان دونوں صاحبوں (حکیم محمود خاں اور حکیم غلام مرتضیٰ خاں) نے لوگوں کے ساتھ بہت ہمدردی کی جس کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ تمام اہل محلّہ، اقربا و احباب بلا امتیاز امیر و

غریب تقریباً پانسو آدمیوں کو اپنے گھر میں رکھا اور جب تک یہ ہنگامہ فرد نہیں ہوا اس وقت تک ان کی ہر طرح خبرگیری اور خاطرمدارات کرتے رہے۔ ایک دن کسی مخبر کے مخبری کرنے پر سب آدمی جو حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گرفتار ہو کر کوتوالی چلے گئے۔ حکیم صاحب موصوف بھی ان کے ہمراہ تین دن تک کوتوالی میں مقید رہے اور بڑی جانفشانی سے اِن سب کو چھڑایا، اور چند روز کے بعد سب کو ساتھ لے کر ریاست پٹیالہ میں چلے گئے۔ (۲۱)، (۲۲)

جو شخص اِس پوری قیامت میں دِلی سے نکلنے کا خیال دِل میں نہیں لایا تھا اُسے بالآخر ان معتوبین کی خاطر جو شریف منزل کی پناہ میں آ گئے تھے، شہر چھوڑنا پڑا۔ یہ واقعہ اواخر مارچ کا ہے کہ غالب نے یکم اپریل ۱۸۵۸ء کو حکیم غلام نجف خاں کو خط لکھا اور اطلاع دی:

"آج پانچواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں معہ قبائل و عشائر پٹیالہ کو گئے ہیں۔ بہ مقتضائے وقت اپنی سکونت کے مکان کو چھوڑ کر یہاں آ رہا ہوں، اس طرح کہ محل سرا میں زنانہ اور دیوان خانے میں مردانہ۔" (۲۳)

حواشی

۱۔ مضامین فراق صفحہ 125
۲۔ تذکرہ اہل دہلی صفحہ 76
۳۔ ساتھ ہی حکیم شریف خاں نے اس خاندانی ذخیرے کو عام کیا۔ پہلی بار "علاج الامراض" کے نام سے اکمل المطابع، سے طبع ہوئی (بیان حکیم محمد نبی خاں)
۴۔ یہ ترجمے دہلی میں ان کے خاندان میں اب تک محفوظ ہیں۔
۵ تذکرہ علمائے ہند صفحہ 233
۶۔ تذکرہ علمائے ہند۔ حاشیہ مترجم صفحہ 234
۷۔ 1222ھ صحیح تاریخ وفات ہے۔ (بیان حکیم محمد نبی خاں)
۸۔ واقعات دارالحکومت دہلی (حصہ دوم) صفحہ 406

۹- تذکرہ اہل دہلی صفحہ 76

۱۰- یاد گار دلی، مصنفہ سید احمد ولی اللہی صفحہ 148

۱۱- یاد گار دلی، مصنفہ سید احمد ولی اللہی صفحہ 48

۱۲- مشاہیر سے ملاقات (مرزا فرحت اللہ بیگ) مطبوعہ رسالہ گفتگو بمبئی (جنوری، فروری، مارچ 68ء) صفحہ 43

۱۳- مولانا اشرف علی تھانوی- سلسلہ التبلیغ کا چوتھا وعظ الظاہر صفحہ 14

۱۴- میرے زمانے کی دلی صفحہ 113

۱۵- مولانا اشرف علی تھانوی، سلسلہ التبلیغ کا چوتھا وعظ الظاہر صفحہ 14

۱۶- واقعات دارالحکومت دہلی (حصہ دوم) صفحہ 407

۱۷- دستنبو (اردو ترجمہ مندرجہ غالب اور سن ستاون صفحہ 92)

دستنبو (غالب اور سن ستاون صفحہ 93)

۱۸- دستنبو (غالب اور انقلاب ستاون صفحہ 106)

۱۹- دستنبو (غالب اور انقلاب ستاون صفحہ 106)

۲۰- دلی کی سزا صفحہ 49

۲۱- یہ درست نہیں ہے کہ حکیم محمود خاں سب کو ساتھ لے کر پٹیالہ چلے گئے- حکیم محمود خاں نے دلی نہیں چھوڑی، شریف منزل ہی میں مقیم رہے- (بیان حکیم محمد نبی خاں)

۲۲- حکیم محمود خاں کے پٹیالے جانے کا واقعہ درست نہیں ہے، پانچ دن حویلی کے زنانہ حصے میں گوشہ نشین رہے- مہاراجہ پٹیالہ کی قربت کی وجہ سے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حکیم محمود خاں دہلی چھوڑ کر پٹیالہ چلے گئے- کسی نے انگریز حاکم سے مخبری کی تھی کہ حکیم صاحب نے کچھ غازیوں کو پناہ دی ہوئی ہے- انگریز حاکم برافروختہ تھا غالباً گوشہ نشینی کی یہی وجہ تھی اور اس دوران میں مہاراجہ پٹیالے کی خاص سفارش اس حاکم کے پاس پہنچ گئی- یہ روایت ہے حکیم عبید الرحمٰن خاں سے انہوں نے سنی اپنی پرنانی سلطان جہاں بیگم سے جو بیٹی تھیں حکیم محمود خاں کی (بیان حکیم محمد نبی خاں)

گولر کا پھُول

شہراب خاموش تھا۔ مگر کونسا شہر۔ بقولِ غالب :

"دِلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھُول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں ہے۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا...... اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر، نہ بازار نہ نہر۔"

دلی پہلے خون میں نہائی۔ پھر لوٹی گئی۔ لوگ پھانسیوں پر چڑھے اور شہر بدر ہوئے۔ پھاوڑا بجنے لگا، کدالیں چلنے لگیں۔ حویلیاں گرائی جا رہی تھیں۔ بازاروں کو سرنگ لگا کر اُڑایا جا رہا تھا۔ پھر شہر خاموش ہو گیا۔ نہ پھاوڑا بجتا ہے نہ کدالیں چلتی ہیں۔ گلیاں ویران، کوچے سنسان۔ اُردو بازار، خانم بازار، خاص بازار، بلاقی بیگم کا کوچہ، آغا باقر کا امام باڑہ، اب یہ کوچہ و بازار اینٹوں کی ڈھیر تھے۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ دروازے تک ایک لق و دق صحرا تھا۔

پھر یہ وقت بھی گزر گیا۔ رفتہ رفتہ خاموشی کا طلسم ٹوٹا۔ نکل جانے والوں اور نکالے جانے والوں کو کسی نہ کسی طور پر واپسی کی اجازت ملی۔ مگر گھروں سے نکلنا اتنا مشکل مرحلہ نہیں جتنا گھروں میں واپس آنا مشکل مرحلہ ہے۔ لوگ کتنی عجلت میں گھروں سے نکلے تھے اور کتنی مشکلوں سے واپس آئے کہ ایک ایک کر کے ہرج مرج کھینچتے دس برسوں تک آتے رہے۔ بہت سے دربدر خاک بسر پھرتے رہے اور مرکھپ گئے۔ بہت سے خاک چھانتے رنج کھینچتے دُور نکل گئے۔ جو واپس آئے انہوں نے اپنی

بستی کو بہت بدلا ہوا پایا۔

واپس آنے والے پہلے شریف منزل پہنچتے، اپنی پونجی سمیٹتے، پھر اپنے گھروں کا رُخ کرتے۔ شریف منزل میں امانتوں والی کوٹھری بہت دنوں تک بند رہنے کے بعد کھل گئی تھی۔ حکیم محمود خاں نے امانتیں جس طرح لی تھیں اسی طرح واپس کیں۔ آنے والوں سے کہا جاتا کہ کوٹھری میں جاؤ اور اپنی پوٹلی تلاش کر لو۔ پوٹلیوں اور گٹھریوں کے انبار میں سے ڈھونڈنے والے اپنی پوٹلی ڈھونڈ نکالتے اور حکیم صاحب کو دُعائیں دیتے واپس ہوتے۔ پھر وہ اپنے کوچے کی طرف چلتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ ان کا کوچہ کہاں گیا اور ان کا گھر کونسی تہہ میں سما گیا۔ کوچے کچھ غائب ہو گئے تھے، کچھ اجڑے پجڑے پڑے تھے۔ گھر بہت سے بے چراغ تھے، بہت سوں کے نشان مٹ چکے تھے۔ ایک مسئلہ سر چھپانے کا، ایک مسئلہ پیٹ بھرنے کا۔ اب چیزیں پہلے کی طرح سستی نہیں رہی تھیں۔ آگے یہاں گیہوں روپے من تھا۔ گھی روپے کا چار سیر۔ (۱) گڑ شکر ٹکے سیر۔ اب جو آ کر دیکھا تو گیہوں کا بھاؤ روپے من سے چڑھ کر فی روپے تیرہ سیر ہو چکا تھا۔ روپے میں گھی ڈیرھ سیر، باجرہ بارہ سیر چنے سولہ سیر، ماش کی دال آٹھ سیر۔ (۲)

بکھرا ہوا شیرازہ لشٹم پشٹم اکٹھا ہوا۔ خانہ بربادوں نے پھر سے جیسے تیسے کر کے کوچے آباد کیئے اور گھر بسائے۔ جامع مسجد بھی کسی نہ کسی طور واگذاشت ہو ہی گئی تھی۔ سیڑھیوں پر پھر زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر چند بھولے بھٹکے کبابی پہنچے اور اپنا خوانچہ جما کر بیٹھ گئے۔ پھر مرغی انڈے والے آئے اور مرغی انڈا بیچنے لگے۔ پھر پدڑی لال اور میناوالے کہیں سے نمودار ہوئے اور پدڑی لال اور مینا کے پنجرے سجا کر بیٹھ گئے۔ کبوتر والے بھی کسی کھوہ سے نکلے اور یہاں آن پہنچے مگر جو قصہ خواں ان سیڑھیوں سے اُٹھ کر گئے تھے وہ واپس نہیں آئے۔ ڈھال، تلوار اور گھوڑوں کے سوداگر بھی ایسے گئے کہ پھر ان کی صورت نظر نہیں آئی۔ نہ وہ سوداگر پلٹ کر آئے نہ ان کے خریداروں کی صورت نظر آئی۔ سو یوں زندگی کا نقشہ پرانے نقشہ ہی کے مطابق جم رہا تھا مگر بیچ بیچ میں کھانچے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ کھانچے چغلی کھا رہے تھے کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ چیزیں اور

صورتیں کچھ جا کر واپس آگئیں، کچھ گم ہو گئیں۔

کچھ چیزیں اور صورتیں نئی نئی بھی نظر آنے لگی ہیں مگر انہوں نے کھانچوں کو بھرا نہیں اور ابھار دیا۔ گھروں میں کچھ نئے نئے چہرے مہرے والی مامائیں نظر آنے لگی ہیں۔ پہلے کچھ پتہ نہ چلتا کہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے مگر گھر کی بڑی بوڑھیاں چاند سا چہرہ دیکھ کر حیران ہوتیں۔ پھر کوئی ادا دیکھ کر چونک پڑتیں۔ پھر اُسے ٹوہتیں اور ماما کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا بہ نکلتی۔ پتہ چلتا کہ صاحبقران امیر تیمور کے گھرانے کی بیٹی ہے۔ حضرت ابو ظفر بہادر شاہ کی ایک بیٹی ایک باورچی کے گھر پائی گئی، دوسری لڑکیوں کو پڑھاتے دیکھی گئی۔ شہزادی ربیعہ بیگم لال قلعہ سے نکلی اور باورچی حسینی کے گھر کی زینت بنی۔ شہزادی فاطمہ سلطان پادریوں کے زنانہ سکول میں معلمہ بن گئی۔ (۳)

داستان امیر حمزہ اور قصہ حاتم طائی سنانے والے اب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نظر نہیں آتے تھے۔ مگر کچھ نئے رنگ سے مجمع لگانے والے جانے کہاں سے نمودار ہو گئے تھے۔ ایک شخص، خوش شکل، خوش ادا ان سیڑھیوں پر مجمع لگاتا اور یہ غزل درد بھری آواز میں گا کر سناتا۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

جب کریدا تو پتہ چلا کہ کوئی مغل شہزادہ ہے۔ (۴) لال قلعہ میں صاحب عالم تھے۔ اب دادا کی بنائی ہوئی مسجد کی سیڑھیوں پر مجمع لگاتے ہیں اور تایا حضور کے شعر سنا کر پیٹ پالتے ہیں۔

آگے جب عالمگیری عہد میں حضرت عالمگیر دکن سدھارے تھے تو دلی بارہ برس تک اجاڑ پڑی رہی۔ ان اُجاڑ برسوں میں بہت برہ کے گیت لکھے گئے:

دلی شہر سہاؤنا اور کنچن برسے نیر
سب کے کنتھ بٹور کے لے گئے عالمگیر
صاحب کی منتی کرو اور من میں راکھو دھیر
اب کے بچھڑے جب ملیں جب پلٹیں عالمگیر

اور بھری برسات میں کوئی برہن ملہار گاتی سنی جاتی

چھپر پرانے ہو گئے اور کڑکن لاگے بانس
آون کو کہہ گئے آئے نہ بارہ مانس

مگر بہادر شاہ ظفر رنگوں اور رنگ سے سدھارے تھے اور دِلی کی اب کی ویرانی عالمگیری عہد کی ویرانی سے بہت مختلف تھی۔ دلی کی بستی تب برہن بنی تھی، اب کے بیوہ ہوئی۔ بڑی بوڑھیاں پرانے زمانے کو یاد کرتیں کہ بی بی جب دلی سہاگن تھی اور گود سے ہری تھی۔ کوئی بچی نادانی میں ٹوک دیتی تو جواب ملتا "بیٹی، دلی کے سرتاج حضرت بہادر شاہ سدھار گئے، لال قلعہ اُجڑ گیا۔ رانڈ دکھیا دلی کا گہنا پاتا خاکیوں نے نوچ کھسوٹ لیا۔ اب اس کا سہاگ کہاں رہا۔"

دلی والوں نے گزرے ہوئے بادشاہ کو ایسے یاد کیا جیسے سعادت مند اولاد گزرے ہوئے باپ کو یاد کرتی ہے۔ وہ گزرے سمے کو یاد کرتے اور حیران ہوتے کہ یہ سب کچھ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ مگر اس کی توجیہ ان کے لئے ایسی مشکل بھی نہیں تھی دلی والے بہت کچھ کھو بیٹھے تھے مگر ان کا تخیل سلامت تھا۔ اس شہر کے باغی بیٹے کی عقلیت پسندی ابھی تحریک بن کر اس شہر میں نہیں پہنچی تھی۔ عقائد اور اوہام کے سائے میں پلا ہوا شعور برقرار تھا۔ حکیم آغا جان عیش شاہ بھورے صاحب کے مزار پہ حاضری دیتے۔ انہیں اِبدا کے وہ وقت یاد آتا جب لال قلعہ کی کھائی کے برابر پسرے ہوئے شاہ صاحب خالی رکابیوں کو اوپر تلے چنتے، پھر ہاتھ مار کر گراتے اور صدا لگاتے۔ "وہ لال قلعہ گرا دیا۔ وہ ڈھا دیا۔" (۵) کسی بوڑھے کو اپنا اس گزرے زمانے کا کوئی خواب یاد آجاتا اور وہ پچھتاتا کہ اس وقت اس خواب کی تعبیر اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی تھی۔ بوڑھیوں کو وہ یاد آتا جو انہوں نے خوابوں میں دیکھا تھا اور وہ یاد آتا جو جاگتی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا۔

"بوبو، حضور کو تخت راس نہیں آیا۔ راس کیسے آتا تخت نشینی کے ساتھ ہی بدشگونی ہو گئی۔"

"اچھی بی، وہ کیسے۔"

"اری ہوا یوں کہ بادشاہ حضور کے مرنے کی خبر آدھی رات کو ملی۔ صاحب عالم نے صبح کا انتظار نہیں کیا۔ رات ہی کو تخت پر بیٹھ گئے۔"

"اے ہے ایسی تڑاپڑی کیا تھی۔ تخت کہیں بھاگا جا رہا تھا۔ فجر کی اذان تو ہو لینے دیتے۔"

"یہی تو میں سوچوں ہوں۔ پو پھٹنے میں دیر ہی کتنی رہ گئی تھی۔ بس بی بی ہونی ہو کر رہتی ہے۔ صاحب عالم نے اندھیری رات میں چار مشعلیں جلوائیں اور جلدی سے تخت پہ جلوہ افروز ہو گئے۔"

سنتے سنتے کسی دوسری بی بی کو اپنا مشاہدہ یاد آجاتا "اچھی، میرا تو ماتھا آسمان کی رنگت دیکھ کے ہی ٹھنک گیا تھا۔ ایسا ہوا کہ اس رات مجھے سحری کے وقت ہی کا پتہ نہ چلا۔ میں نے انگنائی میں آ کے آسمان دیکھا۔ سچ جانیو، آسمان سرخ بوٹی کی طرح۔ میرے تو ہولیں اُٹھنے لگیں کہ الٰہی خیر رکھیو۔"

"ہاں بی بی وہ رمضان تو بہت سخت گزرے تھے۔ بوبو، تمہیں منجھلا روزہ یاد ہے۔"

"اے بی میری یاد پہ تو پتھر پڑ گئے۔ اب کچھ یاد نہیں ہے۔"

"اے لو منجھلا روزہ یاد نہیں ہے۔ قہر کا روزہ تھا۔ افطاری قلعہ سے جامع مسجد جا رہی تھی۔ اچانچک چیلیں جانے کہاں سے اُڑتی آئیں ایسا جھپٹا مارا کہ سارے خوان اُلٹ گئے۔ جس نے سنا حق دق رہ گیا۔ ہمارے ابا حضور نے سنا تو بیساختہ بولے کہ اللہ رحم کرے۔ مگر بی بی رحم کہاں۔ بس تیسرے دن غدر پڑ گیا۔"

یہ محض یادیں تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یادوں کی اذیت کم ہو چلی تھی۔ وہ ای جمی تو واپس نہیں آئی جو بڑی بوڑھیوں کو رہ رہ کر یاد آتی تھی مگر امن چین کے ساتھ زندگی کا نقشہ پھر جم چلا تھا۔ شریف منزل میں امانتوں کی کوٹھڑی خالی ہوتی جا رہی تھی اور دِلی بھرتی جا رہی تھی۔ ۱۸۴۷ء میں دلی کی آبادی ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی ۱۸۵۷ء تک تھوڑی اور بڑھ گئی ہو گی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک لاکھ پینتیس ہزار کے لگ بھگ رہ گئی۔ (۶) یہ فرق کہیں ۱۸۷۵ء میں جا کر پورا ہوا، اور ابھی تو سن ستاون کو گزرے پانچ ہی برس ہوئے تھے۔ پھر بھی زخم اچھے خاصے مندمل ہو گئے تھے۔ اور کوچے بھرے بھرے نظر آنے لگے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چہل پہل اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ کباب، حلیم، چاٹ بارہ مسالوں والی، شربت، فالودہ، فیرنی، قلفی، طوطا،

مینا، پدڑی، کبوتر غرض دینا زمانے کی ہر چیز اور ہر مال یہاں نظر آنے لگا تھا۔

رہن سہن پچھلی طرز پر استوار ہوا۔ لباس وہی ۱۸۵۷ء سے پہلے والا، انگرکھا، کرتا، پائجامہ اور ٹوپی۔ ٹوپی رنگ رنگ کی، کوئی چوگوشیہ، کوئی پنج گوشیہ، کوئی گول۔ مگر زیادہ رواج دو پلڑی ٹوپی کا تھا۔ ہندو مسلمان کے لباس میں ابھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور یہ فرق تو پرانے وقت سے چلا آتا تھا کہ ہندو کے انگرکھے کی گھنڈی دائیں طرف ہوتی تھی، مسلمان انگرکھے کی بائیں طرف۔

سواریوں کا طور البتہ زمانے کی تبدیلی کی چغلی کھا رہا تھا۔ رتھیں ہنوز چل رہی تھیں مگر ہاتھی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ سنہری جھولوں اور اونچی عماریوں والے وہ ہاتھی جنہیں دیکھنے کے لئے بچے بڑے گھروں سے نکل پڑتے تھے اب چاندنی چوک سے گزرتے نظر نہیں آتے تھے مگر شہر میں ایسے پرانے گھر ہنوز موجود تھے جن کے دروازے ہاتھیوں کو ملحوظ رکھ کر تعمیر ہوئے تھے۔ فٹن ۱۸۵۷ء سے پہلے مفتی صدرالدین آزردہ کی مشہور تھی مگر اب یہ سواری کچھ زیادہ نظر آنے لگی تھی۔ حکیم محمود خاں بھی گھوڑے سے فٹن کی طرف ہجرت کرتے نظر آ رہے تھے۔ شاید گھوڑا بھی اپنے دن پورے کر چکا تھا۔ سن ستاون کے معرکہ میں جہاں اور بہت سے مارے گئے وہاں گھوڑا بھی مارا گیا۔

اے ظفر بس ہو چکی شمشیر ہندوستان کی

شمشیر آبدار اور سپ صبا رفتار بھی۔ شہسوار رخصت ہوئے۔ شہسواروں کے ساتھ تلوار اور گھوڑا بھی چلا گیا۔ اب گھوڑا دوسری سواریوں میں جتنے کے لئے رہ گیا تھا۔ دلی تلوار اور گھوڑے کے زمانے سے نکل آئی تھی۔ مگر نئی سواری اور نئے ہتھیاروں سے ہنوز ناآشنا تھی۔

طبیعتیں اب بحال ہو چلی تھیں۔ دِل و دماغ کی فضا بدل چکی تھی۔ بد شگونوں اور تشویش ناک خوابوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ خوابوں کی رنگت بدلتی چلی جا رہی تھی۔ دیکھنے والوں نے اب اچھے خواب دیکھے اور ان سے اچھی تعبیریں لیں۔ شریف منزل میں ایک نیک بی بی نے گولر کا پھول دیکھا۔ اس بی بی نے صبح ہونے پر بڑی بوڑھیوں سے بیان کیا۔ پھر کیا تھا۔ شریف منزل میں شور پڑ گیا کہ منجھلی بھو (۷) نے گولر کا پھول

کھلتے دیکھا ہے۔ مبارک سلامت کا غل ہوا۔ بڑی بوڑھیوں نے بلائیں لیں اور دعائیں دیں کہ بہو مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہو۔ گھر میں خوشی ہو گی۔ اقبال والا پوت پیدا ہو گا۔

دِلی کی عورتوں میں مشہور تھا کہ گولر کا پھُول کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ اگر کسی کو دکھائی دے جائے تو سمجھ لو کہ اس کا نصیبا جاگ گیا۔ منی بیگم (۸) نے کچھ اور خواب بھی بیان کیا ہے۔ منجھلی بہو کی رات کو سوتے آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ آسمان سے تخت اُتر رہا ہے، اور صبح کو بیبیوں میں پھر ایک شور پڑا کہ منجھلی بہو کو بشارت ہوئی ہے حکیم محمود خاں عبادت گزار آدمی تھے۔ فقیروں کی صحبت اُٹھائی تھی۔ گھیسن شاہ مجذوب کے ساتھ کتنے کتنے دن پیادہ پا چلے تھے۔ خواب دیکھنے اور بشارتیں پانے میں وہ بھی کم نہ تھے۔ انہوں نے بھی ایک خواب دیکھ لیا، اور ان کا خواب کسی استعارے میں لپٹا ہوا نہیں تھا۔ سیدھا سیدھا خواب دیکھا کہ فرزند پیدا ہوا ہے، حافظ قرآن ہے۔

حکیم محمود خاں کا مطب پھر سے آباد ہو گیا تھا۔ مگر اب زمانہ اور تھا اور ان کے لئے ایک نئی آزمائش تھی۔ بیشک طوفان گزر چکا تھا۔ مگر وہ طوفان دِلی کی جڑوں کو ہلا گیا تھا۔ صرف لوگ ہی گھر سے بے گھر نہیں ہوئے اس رستخیز بیجا میں ان اداروں اور روایتوں کی جڑیں بھی ہل گئیں جنہیں صدیوں کے عمل نے استحکام اور توانائی بخشی تھی۔ دوسری روایتوں اور اداروں کے ساتھ یونانی طب پر بھی بھاری وقت آیا ہوا تھا۔ اسے اب دربار کی سرپرستی حاصل نہیں رہی تھی۔ شاہی طبیبوں کا زمانہ گزر چکا تھا۔ نہ شاہ رہے نہ شاہی طبیب رہے۔ ایک شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خاں نے انگریزوں کا آلہ کار بن کر اپنے آپ کو رسوا کر لیا۔ حکیم آغا جان عیش کا اب دل ٹھکانے نہیں تھا۔ روتے تھے، دِلی مرحوم کے مرثیے لکھتے تھے اور شاہ بھورے صاحب کے مزار کے چکر کاٹتے تھے۔

ایسے وقت میں حکیم محمود خاں طب کے پشت پناہ بنے۔ وہ ایسا وقت تھا کہ اپنے اداروں اور روایتوں کا اعتبار ختم ہو چکا تھا۔ مگر حکیم محمود خاں کے واسطے سے طب پر اعتبار بڑھ گیا۔ صاحب کمال حکیم تو وہ تھے ہی کہ ان کے علاج کی شہرت دُور دُور پھیلی ہوئی تھی مگر انہوں نے بڑا کام یہ کیا کہ طب کی روایت کو دربار کی سرپرستی

الگ کر کے خلقت کے حوالے سے نئی بنیادوں پر استوار کیا۔ ادھر بہادر شاہ ظفر تخت پر بیٹھے ادھر حکیم محمود خاں مسند شریفی پہ رونق افروز ہوئے۔ خاندانِ شریفی تعلقات کی ایک نئی دنیا سے روشناس ہو رہا تھا، دربار سے الگ خلقت کے ساتھ تعلقات کی دُنیا۔ اس دُنیا میں رہ کر شریفی روایت کے وارث نے پرانی دنیا کو ایک اذیت کے عالم میں کراہتے اور مرتے دیکھا۔ یہ اذیت اس کے تجربے کا حصہ بنی اور اسے خلقت کے اور قریب لے آئی۔ سونا بھٹی سے کندن بن کر نکلا اور حکیم محمود خاں ۱۸۵۷ء کے آشوب کے بعد ہندوستان کے منظر پر ایک عوامی طبیب بن کر اُبھرے۔

حکیم محمود خاں نے سرکار دربار کی سرپرستی کے خیال کو ترک کر کے خدمت خلق کو اپنی طبی سرگرمی کی بنیاد بنایا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں جب دربار ختم ہو گیا تو اس بنیاد کی معنویت اور اہمیت زیادہ ہو گئی۔ دربار کی سرپرستی میں پلنے والے ادارے دربار اُجڑنے کے بعد بے آسرا ہوئے اور ختم ہو گئے۔ حکیم محمود خاں کے عمل نے طب کو دربار کے حوالے سے الگ کر کے ایک نئے حوالے سے منسلک کیا اور اسے مرنے سے بچا لیا۔ اب حکیم محمود خاں کی حیثیت مولانا حالی کے لفظوں میں یہ تھی

:

اُس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دارالشفاء
خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا
مفت بیماروں کو اُس کے در سے ملتی تھی دوا
فکر نذرانے کا تھا اُس کو نہ شکرانے کا تھا

شہر میں خواہ امیر ہو خواہ غریب کسی سے کوئی فیس نہیں لینا۔ (۹) دوا مفت دینا۔ نسخہ دو پیسے والا لکھنا۔ غریب غربا کے لیئے وقت کی کوئی قید نہ تھی۔ ہوا خوری کی نیت سے فٹن میں سوار ہوئے۔ دیکھا کہ مہتر پریشان حال چلا آ رہا ہے۔ پوچھا، مہتر تمہاری مہترانی کا کیا حال ہے۔ گڑگڑا کر بولا کہ حکیم جی، بس چل چلاؤ ہے۔ یہ سن کر گاڑی کو روکا خادم کو اندر بھیج کر دواؤں کا صندوقچہ منگایا، مہتر کو گاڑی میں بٹھایا۔ ہوا خوری ملتوی۔ حکیم صاحب مہترانی کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ (۱۰)

خدمت خلق، عزتِ نفس، عام آدمی سے مروت، اُمرا سے نخوت، ان اخلاقی

بنیادوں پر اس بزرگ نے بھی روایت کو استوار کیا۔ مطب کرنے کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ آخر کوئی ہنر اس طرح تو قائم نہیں رہتا کہ ایک فرد نے اپنے طور پر کمال حاصل کیا اور اپنا کمال اپنے ساتھ لے گیا یا دوسروں سے چھپا کر بیٹوں کو سونپ گیا۔ علم و ہنر فرد کی نہیں انسانیت کی جائیداد ہیں۔ حکیم محمود خاں نے طب کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر کے یہ انتظام کیا کہ علم طب گنے چنے خاندانوں میں مقید ہو کے نہ رہ جائے بلکہ ایک قومی روایت کے طور پر فروغ پائے اسی سلسلہ نے آگے چل کر مدرسہ طبیہ اور پھر طبیہ کالج کی شکل اختیار کر لی تھی۔

ویسے حکیم صاحب بیٹوں کو بھی تیار کر رہے تھے۔ دو بیٹے تھے عبدالمجید خاں اور واصل خاں۔ دونوں کے تیور بتا رہے تھے کہ صاحب کمال بنیں گے مگر ابھی اس گھر میں ایک خوشی اور ہونے والی تھی۔ شریف منزل کی منجھلی بہو کو بشارت یونہی تو نہیں ہوئی تھی اور حکیم محمود خاں نے خواب بے سبب تو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ۱۲۸۴ھ تھا اور شوال کی سترہ تھی کہ حکیم محمود خاں کے تیسرا بیٹا پیدا ہوا۔ نام اس کا محمد اجمل رکھا گیا۔

حواشی

۱۔ ذکاء اللہ آف دہلی صفحہ ۵

۲۔ عود ہندی۔ خط بنام چودھری عبدالغفور صفحہ ۲۲

۳۔ تاریخ عہد عروج انگلشیہ بحوالہ گوپی چند نارنگ : دلی کالج میگزین کا دلی نمبر۔

۴۔ دلی کالج میگزین کا دلی نمبر صفحہ ۲۰۴

۵۔ مضامین فراق صفحہ ۱۳۵

۶۔ واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول صفحہ ۷۴۲

۷۔ جو والدہ تھیں مسیح الملک حکیم اجمل خان کی

۸۔ منی بیگم کا حکیم اجمل خان سے رشتہ یہ ہے کہ وہ ان کے خالو ہوتے ہیں

۹۔ اس خاندان کے افراد اس دور میں بھی طبی مشورے کی کوئی فیس نہیں لیتے ہیں۔

۱۰۔ ملا واحدی : میرے زمانے کی دلی صفحہ ۱۱۳

اجن میاں

خانہ برباد دس برس تک لگاتار آتے رہے اور اپنی اپنی امانتیں واپس لے کر شہر
میں اپنا ٹھور ٹھکانا بناتے رہے۔ مگر اب ایک مدت سے کوئی خانہ برباد اِس راہ نہیں آیا
تھا اور اپنی امانت کا طلب گار نہیں ہوا تھا۔ حکیم محمود خاں نے گمشدوں کا بہت رستہ
دیکھا۔ آخر یہ کیا کہ باقی ماندہ امانتوں کو صندوق میں مقفل کر کے پرانے کنویں میں اتار
دیا گیا اور اسے اِس طرح پاٹ دیا گیا کہ صحن کے چبوترے کے متصل ایک اور چبوترہ
بن گیا۔ دِلی والوں کی امانتیں آخر کے تئیں دِلی کی زمین کی امانت میں گئیں۔

دِلی کی پرانی دولت زمین کی تہ میں سما چکی تھی۔ اب نئی دولت چمک دمک دکھا
رہی تھی۔ ۱۸۷۷ء کے ختم ہوتے ہوتے قیصری دربار کی دُھوم دھام ہوئی۔ راجے
مہاراجے، رؤساو امراء قریب و دُور کے رجواڑوں اور ریاستوں سے کھنچ کھنچ کر آئے
اور نئے دربار کے درباری بن کر معزز ہوئے۔

دِلی نے پھر رونق پکڑ لی تھی۔ مگر یہ رونق اب کسی دربار کی شرمندہ احسان
نہیں تھی۔ نئے حاکموں نے اپنا دارالسلطنت کلکتہ کو بنایا تھا۔ سرکار دربار کی رونقیں
ادھر منتقل ہو گئی تھیں۔ مگر بیس سال کے عرصے میں دلی نے بھی اپنے زخموں کا اندمال
کر لیا تھا اور اپنے کھانچوں کو بھر لیا تھا۔ آبادی پھر اتنی ہو گئی تھی جتنی ۱۸۵۷ء سے
پہلے تھی۔ پھر چاندنی چوک میں وہی چہل پہل اور جامع مسجد کے چوک میں وہی
گہماگہمی، اب صرف وہ بوڑھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کے دن دیکھے تھے یہ
محسوس کر سکتے تھے کہ کیا کچھ تھا جو ان بازاروں سے گم ہو چکا ہے۔ جنہوں نے وہ زمانہ
نہیں دیکھا تھا ان کے لئے اب کے زمانے کی رونق ہی سب کچھ تھی۔ دِن ڈھلا اور

سیلانی گھروں سے نکلے۔ اپچی بنے اڑے چلے جاتے ہیں۔ کسی نے پوچھا "اماں کدھر" چلتے چلتے جواب دیا، "سیل کو جاتے ہیں۔"

اشراف کا حال اچھا نہیں تھا۔ امراء کی حویلیاں کچھ مدت گزری پیوند زمین ہوچکی تھیں، کچھ بکھر کر محلے بن گئی تھیں۔ طبقہ اشراف کے لوگ مراتب وظائف سے محروم ہو چکے تھے۔ انگریزی اقدار سے ابھی وہ ذہنی مفاہمت نہیں کر پائے تھے کہ سرکاری ملازمت کا خیال دل میں لاتے۔ شاید اِسی لیئے نئی سرکاری ملازمتیں انہیں اپنے وقار کے خلاف نظر آتی تھیں۔ بہرحال وہ اپنی وضع پر قائم تھے۔ گھر میں جو حال بھی ہو، باہر اسی ٹھسے سے نکلنا۔ رہے نچلے طبقے کے لوگ تو ان کے ناخنوں میں تو ہنر بھرے پڑے تھے۔ دِلی والوں کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کی دس انگلیاں دس چراغ۔ دستکاری میں ماہر تھے۔ دن بھر کام کیا، شام کو مزدوری وصول کی اور چلے جامع مسجد کی طرف۔ کوئی بیلے موتیا کا گجرا گلے میں ڈالے مٹرگشت کرتا ہے، کوئی چاوڑی کی طرف رواں دواں ہے، کوئی ان سب بازاروں سے کنی کاٹ کر کسی باغ کی راہ لیتا ہے اور اکھاڑے میں جا کر زور کرتا ہے۔

دِلی کے بازاروں کے ساتھ دِلی کے اکھاڑوں کی رونق بھی لوٹ آئی تھی۔ شمشیرزنی، نیزہ بازی اور تیراندازی کے فنون سن ستاون کے شہسواروں اور شمشیرزنوں کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ مگر بنوٹ اور پٹے بازی کے کمالات ابھی تک مقبول تھے۔ اکھاڑے بھی قائم تھے، باغوں ہی میں نہیں حویلیوں میں بھی۔ ہر محلہ میں اکھاڑہ کھدا ہوا تھا۔ اشراف کی حویلیوں میں اکھاڑے ہنوز موجود تھے۔ ایک اکھاڑہ شریف منزل میں بھی تھا۔ اکھاڑے کے استاد الن خاں تھے۔ الن خاں کے خلیفہ اسمٰعیل انچھو تھے۔ شریف منزل کے نوجوانوں میں ان دنوں سب سے بڑھے چڑھے جوان واصل خاں تھے۔ ان کے اور مشاغل بھی تھے مگر پہلوانی کا خاص شوق رکھتے تھے۔ اکھاڑے کے روحِ رواں وہی تھے۔ باقی اس گھرانے کے اور افراد بھی یہاں ورزش کرتے اور زور کرتے نظر آتے۔ اس اکھاڑے میں تھوڑے دنوں سے ایک نیا لڑکا دکھائی دے رہا تھا۔ ذوق شوق کے ساتھ ورزش کرتا تھا اور کشتی لڑتا تھا۔ شروع میں صرف پہلوان بننے کا شوق تھا۔ پھر دُھن سوار ہوئی کہ پنجہ کشی کا فن سیکھا جائے۔ سو وہ کشتی لڑنے

کے ساتھ ساتھ پنجہ بھی لڑانے لگا۔ یہ نیا لڑکا ہمجولیوں میں اجن کہلاتا تھا۔ بڑے اُسے اجمل کہہ کر پکارتے تھے۔

یوں سمجھنا چاہیے کہ اس لڑکے نے زندگی کا آغاز اکھاڑے سے کیا۔ پہلوانی کا شوق زندگی کا پہلا شوق تھا۔ آگے چل کر اس میں دوسرے شوق شامل ہوئے۔ پہلوانی کے بعد پنجہ کشی اور پھر ایک اور شوق پیدا ہوا، خوش نویسی کا شوق، اجن میاں خوب تھے۔ جسم سڈول، بر میں انگرکھا، پاجامہ چست، ٹوپی دو پلی، کبھی ٹوپی کی جگہ عمامہ، طبیعت میں دھیماپن۔ جس شوق سے پنجہ لڑاتے تھے اسی شوق سے خوش نویسی کرتے تھے۔ ان اُنگلیوں میں دو ایسے ہنر کہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ انگلیاں پنجہ کشی بھی خوب کرتی تھیں اور وصلیاں بھی مرغوب لکھتی تھیں۔

پہلوانی اور پنجہ کشی تو ہنر ہوئے کہ مردانہ اوصاف میں شمار ہوتے تھے۔ باقی کھیل کود سے اس لڑکے کو ایسی دلچسپی نہیں تھی۔ گھر سے کم نکلنا اور شرارتوں سے دُور رہنا، بڑوں کے قریب مودب بیٹھے رہنا اور ان کا کہا دھیان سے سننا، کھیل کھیلنا تو اس طرح کا کہ اجن میاں ہمجولیوں کے بیچ جھوٹ موٹ کے طبیب بنے بیٹھے ہیں۔ ہمجولیوں نے مریضوں کا روپ دھارا ہے۔ حکیم جی نبض دیکھتے ہیں، اور نسخہ لکھتے ہیں۔ ایک دفعہ کھیل کھیل میں سچ مچ کا علاج کر ڈالا۔ ایک بچے کو کھانسی تھی۔ دوا بھی کھائی تھی مگر آرام نہیں ہوا تھا۔ بچہ کھیل کھیل میں حکیم اجن کے مطب میں آیا کہا کہ حکیم جی مجھے کھانسی ہے۔ حکیم جی بیساختہ بولے کہ سرولی آم کھاؤ۔ ایسی دوا کھانے کو کس مریض کا جی نہ چاہے گا۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ بچے نے دبا کے آم کھائے اور خدا کی قدرت کہ کھانسی سچ مچ جاتی رہی۔

تعلیم کی ابتدا قرآن خوانی سے ہوئی۔ مراد آباد کے ایک صاحب تھے، مولوی دائم علی کہ طب کی تعلیم کے لئے دِلی آ کر حکیم عبدالمجید خاں کے شاگرد بنے تھے۔ اُنھوں نے اس لڑکے کو قرآن پڑھایا۔ تین سال کے اندر اندر لڑکے نے پورا قرآن حفظ کر لیا۔

مولوی دائم علی سے قرآن پڑھنا، اکھاڑے میں جا کر کشتی کے داؤں سیکھنا، پنجہ لڑانا۔ باپ کے مطب میں مودب بیٹھ کر علاج معالجہ کے رموز کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔

ایک شام یوں ہوا کہ ایک مریض پیٹ کے درد کا رونا لے کر مطب میں آیا، حکیم محمود خاں نے نسخہ لکھوایا اور مریض کو ہدایت کی کہ رات کا کھانا مت کھانا۔ کمسن بیٹے نے جھرجھری لی۔ مئودبانہ گزارش کی کہ ابا جان اِس مریض کا تو کھانے ہی سے علاج فرمایئے۔ باپ نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ مسکرا کر کہا کہ اچھا ہم نے یہ مریض تمہیں دیا۔ بیٹا سر جھکا کر آداب بجا لایا۔ کہا کہ ابھی دوا لے کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر سیدھا زنان خانے میں گیا۔

تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ آگے آگے اجن میاں، پیچھے پیچھے ماما۔ وہ ماما کشتی میں سرپوش سے ڈھکا ایک پیالہ لے کر آئی تھی۔ اجن میاں نے سرپوش اُٹھا کر پیالہ باپ کے سامنے رکھا اور عرض کیا کہ یہ اس مریض کو کھلا دیجئے۔ حکیم محمود خاں نے دیکھا کہ پیالے میں گرم شوربہ ہے اور اس میں روٹی کے تھوڑے ٹکڑے پڑے ہیں۔ اُنھوں نے مریض سے کہا کہ کھاؤ۔ مریض نے رغبت سے شوربہ روٹی کھایا۔ کھاچکنے کے تھوڑی دیر بعد کہا کہ حضور اب پیٹ میں درد نہیں ہے۔ حکیم محمود خاں نے شفایاب مریض کو رخصت کیا، پھر بیٹے سے پوچھا کہ تم نے یہ کھانا کیا سوچ کر تجویز کیا۔ اجن میاں بولے کہ میں مریض کو جانتا ہوں۔ دھوبی ہے صورت سے معلوم ہو رہا تھا کہ سیدھا گھاٹ سے آ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ دِن بھر کپڑے دھوتا رہا ہے کھایا کچھ نہیں۔ خلوئے معدہ سے یہ درد ہوا ہے۔ گرم شوربہ روٹی کھلاؤ۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی خرابی پیدا ہوئی تو آپ سنبھالنے کے لیئے موجود ہیں۔ باپ نے بیٹے کا جواب سنا، گلے لگایا، شاباشی دی۔

اب لڑکا پندرہ سولہ کے سن میں تھا۔ مسیں بھیگ چلی تھیں۔ قرآن پڑھتے پڑھتے تین سال گزر چکے تھے۔ قرآن حفظ ہو چکا تھا۔ مسجد تو گھر کے دروازے ہی سے لگی ہوئی تھی۔ مسجد میں جا بیٹھتا اور دیر دیر تک تلاوت کرتا۔ گھر والوں نے اجن میاں کا یہ رنگ دیکھا تو ملا کہنا شروع کر دیا۔

حفظ قرآن کے ساتھ مولوی دائم علی رخصت ہوئے۔ اب دوسرے معلم آئے اور دوسرے علوم کی تعلیم شروع ہوئی۔

یہ وہ وقت تھا جب ہند اسلامی تہذیب کی کوکھ سے پیدا ہونے والی تعلیمی

روایت بے سہارا ہو کر بیٹھ رہی تھی۔ زمانہ بدل چکا تھا۔ سہارا دینے والے اب ایک نئی اور اجنبی تعلیمی روایت کو سہارا دے رہے تھے۔ اس تعلیمی روایت کا آغاز پہلے ہی اِس شہر میں دلی کالج کی صورت ہو چکا تھا۔ اب اسی شہر سے ایک شخص اس نئی تعلیم کا مبلغ بن کر اُٹھا تھا اور اسی شہر سے دِلی کالج کے چند تعلیم یافتہ اس کے لفٹنٹ بن گئے تھے۔ علی گڑھ میں ایک نئی درسگاہ کھل چکی تھی اور دلی کے مختلف گھرانوں کے چشم و چراغ وہاں سے نئی روشنی لے کر واپس بھی آ چکے تھے۔ لیکن شریف منزل میں پچھلی تعلیمی روایت پر اعتبار قائم تھا۔ اجمل خاں کی تعلیم و تربیت اسی روایت میں ہوئی۔ منطق، فلسفہ، طبیعات، ادب، فقہ، حدیث، تفسیر، ان سب میں اٹھارہ انیس برس کی عمر تک خاصی استعداد حاصل کر لی۔ زبانوں میں عربی اور فارسی پڑھی۔ عربی کی ابتدائی تعلیم پیر جی صدیق احمد اور حکیم جمیل الدین سے حاصل کی۔ شریف منزل میں انگریزی کا چلن نہیں تھا۔ وہ اِس نوجوان نے اپنے طور پر سیکھی۔ خوش نویسی کی طرف میلان دیکھ کر باپ نے مولوی رضی الدین کی شاگردی میں دے دیا۔ مولوی رضی الدین خاں بہادر شاہی عہد کے مشہور و معروف خطاط میر پنجہ کش کے شاگرد تھے اور نسخ اور نستعلیق دونوں میں اپنے وقت کے استاد تھے۔ اجمل خاں وصلیاں لکھ لکھ کر انہیں دکھاتے اور اصلاح لیتے۔ طب میں تعلیم باپ سے اور بھائیوں سے حاصل کی۔

شریف منزل میں ایک مطبع قائم ہوا تھا جس کا نام اکمل المطابع رکھا گیا۔ اُس سے ایک اخبار نکلنا شروع ہوا۔ جس کا نام 'اکمل الاخبار' تھا۔ اس واسطے سے اجمل خاں کو اپنے جوہر دکھانے کے لئے ایک میدان میسر آ گیا۔ اُنہوں نے اس اخبار میں لکھنا شروع کر دیا۔ حکیم واصل خاں مطبع اور اخبار کے نگران تھے۔ اجمل خاں نے ہوش سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اس میں دلچسپی لینی شروع کی۔ پھر وہی اس کے اڈیٹر بن گئے۔ منشی ذکاء اللہ ، جالب دہلوی ایسے لوگ اس اخبار کے قلمی معاونین میں تھے۔

'اکمل الاخبار' ایک تحریک کا پیشرو بن گیا۔ علی گڑھ تحریک تو شروع ہو چکی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ کالج قائم ہوا اور نئی تعلیم کا نقیب بنا۔ شریف منزل میں پلنے والے دماغ کچھ اور سوچ رہے تھے۔ انہیں اس تہذیب کی فکر تھی اور اس علمی روایت کی جسے صدیوں کے تخلیقی عمل نے پرورش کیا تھا اور جو اس وقت بے سہارا

تھی۔ شریف منزل والوں نے اس کے تحفظ کی تحریک کا آغاز اپنے پالے سے کیا۔ آخر یونانی طب بھی تو اس تہذیب کا ایک نمائندہ ادارہ تھی۔ طب کا رخصت ہونا اور ڈاکٹری کا رواج پانا محض طریق علاج کی تبدیلی سے عبارت نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا اپنی تہذیب میں رچی بسی انسانی درد مندی کی ایک روایت کا انجام۔ غالباً اسی احساس کے تحت حکیم محمود خاں نے طب کی درس و تدریس پر خاص توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ قریب و دُور سے طلبہ دلی آتے اور شریف منزل میں پہنچ کر یہاں کے حکیموں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے اور کسب فیض کرتے۔

باپ نے جو کام پچھلی روایت کے تحت غیر رسمی انداز میں شروع کر رکھا تھا بیٹوں نے اسے ایک ضابطہ کی شکل دی اور درس و تدریس کے سلسلہ کو کالج کی صورت میں منتقل کر دیا۔ طلبہ موجود تھے۔ اساتذہ بھی موجود تھے۔ آخر اِن طلبہ کو حکیم محمود خاں اور ان کے بیٹے ہی تو تعلیم دیتے تھے۔ بس ایک شکل دینے کی ضرورت تھی۔ وہ اس طرح دی گئی کہ حکیم محمود خاں، نواب عبداللطیف خاں کے علاج کے لئے کلکتہ گئے ہوئے تھے یہاں تینوں بھائیوں نے سر جوڑ کر ایک مدرسہ کا خاکہ تیار کر لیا۔ بڑے بیٹے نے باپ کو مطلع کیا کہ "دست بستہ گزارش ست کہ فدوی مدرسہ طبیہ توکل علی اللہ جاری کردہ است۔" یہ خط ۱۳۰۸ھ میں لکھا گیا۔

گلی قاسم جان میں ایک مکان کرائے پر لے کر یہ مدرسہ قائم کیا۔ اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم واصل خاں مدرسہ میں مدرس بنے۔ اجمل خاں نے 'اکمل الاخبار' کے ذریعہ اس کے مقاصد کی تشریح و تبلیغ شروع کی۔ طب کی ترویج و اشاعت کے نقطہ نظر سے ایک درس گاہ کا قیام ایک نیا واقعہ تھا اور نیا واقعہ اس روایتی معاشرے میں آسانی سے تو قبول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مخالفتیں شروع ہو گئیں۔ اجمل خاں نے 'اکمل الاخبار' میں محاذ کھولا اور اس درس گاہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ طب کا تحفظ برحق، مگر اجمل خاں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ طب کو ایک جامد روایت نہیں بننے دیا جائے گا۔ مغرب کی نئی طب نے اس علم میں جو نئے اضافے

کیے ہیں انہیں سوچ سمجھ کر یونانی طب میں سمونے کی کوشش کی جائے گی۔ انہوں نے صاف صاف لکھا کہ :

''ڈاکٹری کی تعلیم کو بھی مدرسہ میں لازمی قرار دیا گیا ہے.....اور نقشوں کی تشریح اور مختلف اقسام کی جراحیوں کو دیکھنے کے لئے سول ہسپتال میں طلبہ کو بھیجنے کی اجازت حاصل کر لی گئی ہے اور طلبہ کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ لازمی طور سے ہسپتال میں حاضری دیں۔ علم طبیعی اور جدید سائنس کے لیکچروں کو سننے اور طبیعات کے تجربے دیکھنے کا بھی ذریعہ پیدا کیا گیا ہے۔''

شاید حکیم محمود خاں اسی دن کے انتظار میں زندہ تھے۔ مدرسہ طبیہ کے قیام کی اطلاع میں یہ اطلاع بھی تو پوشیدہ تھی کہ سعادت مند بیٹے اجداد کی امانت کو سنبھالنے کے لائق ہو گئے ہیں بلکہ نئے عہد کے گرد و پیش میں اسے ایک نئی نہج پر استوار کرنے کے بھی اہل ہیں۔ بس اسی برس وہ طبیب عصر جس کی ذات میں دو عہد اکٹھے ہو گئے تھے اس دُنیا سے سدھارا۔

زمانے نے حکیم محمود خاں کو بہت خراجِ تحسین پیش کیا اور دِلی والے اپنے محسن کو بہت روئے۔ مولانا حالی نے اس ایک شخص کا مرثیہ لکھ کر پورے شہر کا اور پوری تہذیب کا مرثیہ لکھا۔ اس شاعر نے اس شخصیت کو دلی کی ٹوٹی ناؤ کا آخری تختہ اور ہند اسلامی تہذیب کی آخری انسانی مثال جانا اور نوحہ کہا۔

مٹ گئی افسوس اِک ایسی سلف کی یادگار
قوم میں جس کی مثال آئندہ کم دیکھیں گے یار

مفتی صدرالدین کی حویلی کے صحن میں ۲۰ محرم ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۹۲ء بروز یکشنبہ ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ (۱) مولانا حالی نے پہلے تقریر کر کے مرثیے کی اہمیت و ضرورت سمجھائی اور اس پر زور دیا کہ محمود خاں ایسا ''قوم کا محسن اور خدمت گزار گزر جائے تو اس کی زندگی کے حالات قلمبند کیے جائیں اور شعرا جو کہ قوم کی زبان ہیں تمام

قوم کی طرف سے اس کے مرثیے لکھیں۔" پھر انہوں نے اپنا مرثیہ سنایا اور ایک دکھ کے ساتھ اعلان کیا۔

ظاہرا اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

حواشی

۱۔ کلیات نثر حالی (حصہ دوم) صفحہ ۳۰

دلی سے رامپور کی طرف

حکیم محمود خاں دُنیا سے سدھار چکے تھے اور اجمل خاں، حکیم اجمل خاں بن کر رامپور جا رہے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد ذمہ داریوں کی تقسیم بیٹوں کے درمیان اس طور ہوئی تھی کہ برادرِ بزرگ حکیم عبدالمجید خاں مسند شریفی پر بیٹھے۔ منجھلے نے مدرسہ طبیہ کو سنبھالا، چھوٹے کو رامپور جا کر افسرالاطباء بننے کی ذمہ داری سنبھالنی تھی۔

ریاست رامپور سے خاندانِ شریفی کا تعلق حکیم محمود خاں کے وقت میں قائم ہوا تھا۔ حکیم محمود خاں خود بھی رامپور جاتے رہتے تھے۔ وقتاً فوقتاً حکیم عبدالمجید خاں بھی وہاں پہنچتے تھے۔ مگر اب نواب صاحب کی خواہش یہ ہوئی کہ اس گھرانے کا کوئی لائق حکیم رامپور میں آ کر مستقل قیام کرے۔ یہ ۱۸۹۲ء کا ذکر ہے۔ حکیم محمود خاں کا چل چلاؤ تھا۔ اُنھوں نے دُنیا سے جاتے جاتے چھوٹے بیٹے کو یہ ذمہ داری سونپ دی۔

ریاست رامپور پٹھانوں کی بستی تھی۔ ۱۸۵۷ء تک پٹھان اپنے سیدھے سچے پٹھانی طور طریقوں میں مگن تھے۔ وہی پٹھانی وضع قطع مگر ۱۸۵۷ء کے بعد جب دلی والے یہاں پہنچے تو لوگوں کی چال ڈھال اور وضع قطع بدلتی چلی گئی۔ تکلفات پیدا ہوتے چلے گئے۔ مردوں کے پیروں میں دلی کی سلیم شاہی جوتیاں دکھائی دینے لگیں اور مُنہ پان سے سرخ نظر آنے لگے۔ چنٹ دار ٹخنوں تک کے دامنوں والا انگرکھا رخصت ہوگیا اور شیروانی کا چلن شروع ہو گیا۔ جو متمول تھے وہ اس سے بھی آگے گئے اور انگریزی وضع قطع اور طور طریقوں پر مائل ہو گئے۔ اصل میں اب رامپور ہندوستان کے باقی علاقوں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے مسلمانوں کی صورتِ حال کو منقلب کر دیا تھا۔ اب لال قلعہ جیسا کوئی مرکزی ادارہ ان کے علم و ہنر

ں سرپرستی کے لیئے اور ان کی قومی سرگرمیوں کی پشت پناہی کے لیئے موجود نہیں تھا۔
ب اداروں، تحریکوں اور اہل ہنر نے مسلمان ریاستوں کی طرف دیکھنا شروع کیا۔
ریاست رامپور اس زمانے میں مسلمانوں کی بڑی ریاستوں میں شمار ہوتی تھی۔ اداروں
اور تحریکوں نے سہارا حاصل کرنے کے لیئے اور شاعروں، عالموں اور ہنرمندوں نے
سرپرستی حاصل کرنے کے لئے اس ریاست سے رجوع کیا اور رامپور کی ریاست دیکھتے
دیکھتے مسلمانوں کا مرجع بن گئی۔

ایسا زمانہ تھا کہ اجمل خاں دِلی سے نکل کر اس دیار میں پہنچے۔ یہ اثرات قبول
کرنے اور جذب کرنے کی عمر تھی۔ شروع جوانی کا یہ سفر اجمل خاں کے لیئے مسلمانوں
کے ماضی و حال میں ایک سفر بن گیا۔ ایک سطح پر یہ مسلمانوں کی علمی روایت کے بیچ
ایک سفر تھا۔ دوسری سطح پر ہندی مسلمانوں کے نئے دل و دماغ کے اندر ایک سفر تھا۔
علمی روایت کے بیچ سفر اس طور کہ رامپور میں پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد یوں
سمجھئے کہ ۱۸۹۶ء میں ریاست کے کتب خانے کا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ یہ کتب خانہ تیرہ
ہزار قدیم مطبوعہ کتابوں اور اٹھارہ ہزار قلمی نسخوں کی صورت صدیوں کی علمی روایت کو
اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ یہ نوجوان اس کتب خانے میں پہنچ کر کتابوں کا کیڑا بن گیا۔
سارے کتب خانے کو کھنگال ڈالا۔ بہت سے نادر نسخوں کی نقلیں کرائیں اور مدرسہ طبیہ
کی لائبریری میں منتقل کر دیں۔ کتابوں کے اس پورے ذخیرے کی فہرست مرتب کی۔
اس پر ایک دیباچہ باندھا جس میں قدیم علمی روایت کا تعین اس طرح کیا:

"جس طرح پچھلے زمانے کے صناعوں کی چیزیں ان لوگوں کے
مخصوص حالات کو روشنی میں لاتی رہی ہیں اسی طرح ہر ایک گذشتہ قوم کی
تصنیف و تالیف آئندہ نسلوں کے لیئے اس قوم کے خیالات کی طرف
رہبری کرتی رہی ہے۔ مشرقی علوم و فنون کا آفتاب گو اپنے زمانے میں
برابر عروج کرتا رہا اور بہت سی قوموں نے اس کی روشنی سے دُنیا میں
فائدے حاصل کیے لیکن اب یہ آفتاب گہنا گیا ہے اور زمانے نے اپنی
عادت کے مطابق ایک دوسرا آفتاب پیدا کر دیا ہے جو اہل زمانہ کی
ضرورتوں کو پورا کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر عام لوگوں کی

توجہ اور ان کا التفات اپنے نئے مہمانوں کی جانب زیادہ ہونا چاہیے
اور روزافزوں ہوتا بھی جاتا ہے۔ اِس انقلاب کا نتیجہ جیسا کہ پچھلی قومیں
برداشت کر چکی ہیں ہمارے لیئے یہی ہو گا کہ ہم اپنی پچھلی عظمت اور
وقعت کو گمنامی کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں گے اگر ہم ان کے قائم رکھنے کا
خیال نہ کریں۔"

کتب خانے کے ساتھ ساتھ اجمل خاں کو اس شہر میں ایسے اہل علم بھی میسر آگئے جن کی صحبت نے انہیں بہت فائدہ پہنچایا۔ ایک مولوی طیب صاحب تھے جو مدرسہ عالیہ رامپور کے مدرسِ اعلیٰ اور عربی زبان و ادب کے شناور تھے۔ اجمل خاں نے ان سے بہت اِستفادہ کیا۔ ان کے فیض صحبت سے عربی ادب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ عربی بولنے اور لکھنے میں بھی مہارت پیدا کر لی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۸۵۷ء کی اُکھڑی ہوئی مسلمان قوم نئے گرد و پیش میں اپنے مقام کو جاننے اور بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ نئے ذہن پیدا ہو رہے تھے، نئی تحریکیں اُٹھ رہی تھیں۔ نئی تحریکوں اور نئے اداروں کے قائدین رامپور آتے جاتے رہتے تھے۔ حکیم صاحب کو یہاں اُن سے ملنے اور بات کرنے کے مواقع میسر آئے۔ اِس طور ۱۸۵۷ء کے بعد کے گرد و پیش میں اُبھرتے ہوئے مسلمان دِل و دماغ سے ان کا رابطہ قائم ہوا۔ مولانا شبلی سے حکیم صاحب کی پہلی ملاقات سید سلیمان ندوی کے قیاس کے مطابق انہیں دِنوں رامپور ہی میں ہوئی تھی۔ (۱۱) ملاقات ہونے کی دیر تھی، اس کے بعد تو ربط و ضبط بڑھتا ہی چلا گیا اور آگے چل کر حکیم صاحب نے ندوہ العلماء کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ محسن الملک سے بھی ان کی پہلی ملاقات رامپور ہی میں ہوئی تھی۔ یہ ۱۸۹٦ء کا واقعہ ہے کہ نواب محسن الملک پہلی مرتبہ رامپور آئے اور حکیم صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی۔ پھر ۱۸۹۸ء میں ایک علی گڑھ کا وفد یہاں پہنچا۔ حکیم صاحب نے اس وفد کی بہت مدد کی۔ اس کے بعد علی گڑھ تحریک سے ان کی دلچسپی بڑھتی ہی چلی گئی۔ آگے چل کر ۱۹۰۰ء میں وہ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی مقرر ہو گئے۔

سرکار دربار اور جوڑ توڑ میں چولی دامن کا ساتھ چلا آتا ہے۔ دربار سے وابستہ

لوگ یہاں بھی جوڑ توڑ میں بہت مصروف رہتے تھے۔ مگر ایک شخص تھا جو دربار سے وابستہ تھا مگر اس کی مصروفیتیں اور ہی قسم کی تھیں۔ اس زمانے کی اس کی ڈائری کے ورق ان مصروفیتوں پر گواہ ہیں:

"۵ نومبر جمعہ: صبح نماز پڑھی۔ اس کے بعد لوگ آ گئے۔ افسوس ہے کہ قرآن شریف نہ پڑھ سکا۔ مطب کیا۔ ہمارے حضور پرنور کے ماموں صاحب یعنی صاحبزادہ .... صاحب جو ایک باوضع اور نہایت خوبیوں کے آدمی ہیں فاتحہ (والدہ صاحبہ) کے لیئے تشریف لائے۔ اس کے بعد مولوی فاخر صاحب، محفوظ اللہ خاں صاحب، افضل خاں صاحب اور میں دیر تک حضور پرنور دام اقبالہم کی ذہانت، لیاقت، حلم، مروت کی تعریف کرتے رہے۔ پھر میں امیردولہ کو دیکھنے گیا۔ وہاں سے واپس ہو کر خورشید منزل میں اُتر گیا۔ مدار المہام صاحب نے ڈاکٹر لوکس سے ملایا۔ بہت خلیق آدمی ہے علاج میں بہت کوشش کرتا ہے، اور ہر ایک سے جو بات اپنی سمجھ میں نہیں آتی دریافت کرتا ہے۔ مجھ سے دریافت کیا کہ یونانی طب میں سب سے زیادہ معتبر اور بڑی کتاب کونسی ہے۔ میں نے 'قانون' کا نام لیا جسے وہ جانتا بھی تھا۔ مجھ سے کہا کہ اس کا فارسی یا اُردو میں ترجمہ ہوا ہے یا نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اُردو میں صرف کلیات کا ترجمہ نو لکشور نے چھاپا ہے جو آپ کے لیئے بیکار ہے۔ تھوڑی دیر تک اسی قسم کی باتیں رہیں۔ پھر ہم سب کھانے پر گئے۔ مدرالمہام صاحب نے کہا کہ پلیگ کے نام سے انہوں نے (میں نے) ایک رسالہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر مجھ سے پوچھنے لگے کہ اس رسالہ میں آپ نے کیا کیا باتیں لکھی ہیں۔ میں نے خلاصہ کے طور پر بڑی بڑی بحثیں بتا دیں جن کو انہوں نے پسند کیا اور کہا کہ میں اُمید کرتا ہوں کہ ایک مجھے دینے میں آپ تامل نہ کریں گے۔ میں نے کہا میں میں بہت خوش ہوں گا اگر آپ جیسا لائق اسے دیکھے گا۔ پھر پلیگ کے متعلق دیر تک باتیں رہیں۔ میں اپنی واقفیت کے اظہار سے قاصر نہ رہا۔ اور جو کچھ مجھے معاہم تھا وہ میں نے بیان کیا۔ تزکِ جہانگیری

کا وہ چوہے کا قصہ جسے ایک لڑکی نے جہانگیر کے سامنے بیان کیا تھا اور جسے ایک بلی نے پکڑ کر چھوڑ دیا تھا اور خود مضمحل ہوتی گئی تھی، اور اس لڑکی نے اسے تریاق فاروق کھلایا تھا، میں نے بیان کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے ایسا یاد ہے کہ وہ بلی مر گئی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ شاید ایسا ہی ہو لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے وہ بلی چوتھے دن اچھی ہو گئی تھی۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہم سب لوگ اب کتب خانے چلتے ہیں۔ وہاں سے تزک نکال کر دیکھیں گے۔ کھانے کے بعد میں، ڈاکٹر صاحب، مدارالمہام صاحب، حامد علی خان بیرسٹر کتب خانہ گئے۔ کتب خانہ کی تمام چیزیں دیکھیں۔ پھر تزک نکلوائی۔ میں نے وہ قصہ نکال کر دکھایا۔ اِس میں لکھا تھا: "روزِ چہارم بہوش آمد (گربہ)"۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے 'بہوش' کا 'بیہوش' یاد رہا۔

وہاں سے دو بجے کے بعد میں مکان پر واپس آیا۔ افسوس ہے کہ جمعہ کی نماز قضا ہو گئی۔ خیر ظہر پڑھی۔ اِس کے بعد کمیٹی میں لوگ آنے لگے۔ آج تین بجے میں نے یونانی شفا خانوں کی دواؤں کا نرخ مقرر کرنے کے لئے کمیٹی کی تھی۔ اِس میں شہر کے پنساری اور عطار پچاس کے قریب تھے....... پانچ بجے کمیٹی ختم ہوئی۔ میں عصر کی نماز پڑھ کے سوار ہو گیا۔ خاص باغ گیا۔ وہاں سے واپس آیا۔ نمازِ مغرب وہیں پڑھی........ ۸ نومبر ۹۷ء، روز دو شنبہ، نماز و قرآن شریف پڑھنے کے بعد مطب کیا۔ .... سرکار نے بلایا۔ چوسر ہو رہی تھی۔ چھٹن صاحب اور نواب صاحب میں گالی گلوچ ہونے لگی (مگر مذاق) میں حسب الحکم حضور پرنور بازیوں کی ہار جیت کراماً کاتبین کی طرح لکھتا گیا۔ چونکہ عصر کی نماز کا وقت تنگ ہو گیا تھا اِس لیئے وہاں سے اُٹھا۔ نماز پڑھ کر کلب آیا۔ مغرب کی نماز پڑھی اور ایک گیم بلیرڈ کا کھیلا۔ پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ نماز پڑھی۔ کھانا کھایا اور تھوڑی دیر تک باتیں رہیں۔ مولوی محمد طیب سے علمی صحبت گرم رہی۔ گیارہ بجے سو گیا۔ آج رات کو ٦ کتابیں کتب خانہ بمبئی سے محسن الملک

نے بھیج دیں۔

۱۸ نومبر، روز جمعہ .... تیسرے پہر کو کلب میں تین انگریز آئے۔ ان سی باتیں ہوتی رہیں۔ آج رامپور میں ایک انگریز آیا ہے جو شصت سالہ جوبلی کے تمام و کمال جشن کو اس کی اصلی حالت پر دِکھاتا ہے۔ تمام باتیں بالکل واقعی معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۹ یا ۲۰ تاریخ یہ تماشا خورشید منزل کے ٹینس کورٹ میں ہو گا........

۲۳ نومبر ۹۷ء روز سہ شنبہ۔ آج انگریز نے تماشا کیا۔ تماشا بہت دلچسپ تھا۔ ایک پردہ پر اندر سے برقی روشنی کے ذریعہ سے فوٹو کی تصویروں کا عکس پڑتا تھا جس سے وہ بڑی معلوم ہوتی تھیں اور برقی آلہ کے ذریعہ سے وہ برابر حرکت کرتی ہوئی اور چلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ بہت دلچسپ تماشا تھا۔ پونے نو بجے رات کے شروع ہوا اور ساڑھے دس بجے ختم ہو گیا۔ حامد علی خاں بیرسٹر لکھنوی بھی شامل تھے۔ رائٹ وغیرہ بھی آئے۔ ہم سب لوگ حسب الحکم ڈنر سوٹ پہنے ہوئے تھے۔

جس انگریز سوداگر کو میں نے پیش کیا تھا۔ اس سے نو سو روپیہ میں تین سگار بکس حضور پرنور نے خرید فرمائے۔

۲۷ نومبر ۹۷ء : آج غبارہ میں میم اڑی۔ پریڈ کے میدان میں انتظام کیا گیا تھا۔ پانچ بجے کے قریب اڑی اور مسٹر ہملٹن کی کوٹھی کے احاطہ میں اُتری۔

۲۸ نومبر ۹۷ء : آج میں نے اور محفوظ اللہ خاں اور افضل خاں نے فوٹو اتروائے۔ چار میں نے، تین محفوظ اللہ خاں اور تین افضل خاں نے۔ میں نے دو یونیفارم میں فوٹو لوائے۔

۳۰ نومبر ۹۷ء : آج غبارہ والے کو سرکار نے رخصت کیا۔"

حکیم اجمل خاں رامپور میں اِس طور دن گزار رہے تھے۔ ادھر دِلی میں حکیم عبدالمجید خاں خاندان شریفی کا نام روشن کر رہے تھے۔ کیا آدمی تھے۔ کسرتی بدن، سرخ و سفید رنگ، ہلکی کالی ڈاڑھی، برمیں انگرکھا، کبھی کبھی اس پر صدری۔ خوش پوش،

خوش ذوق۔ عطر کے شوقین، باغوں کے رسیا۔ ہفتے میں پانچ دن مطب کرتے اور دو دن باغ کی سیر کرتے۔ ہفتے اور منگل کو مطب سے بے نیاز دوستوں کو ہمراہ لے باغ میں نکل جاتے اور جی بھر کے سیر کرتے۔

فقراء سے عقیدت باپ دادا سے ورثہ میں ملی تھی۔ بزرگوں اور درویشوں کے مزاروں پر جانا روزمرہ کا معمول تھا۔ پانچ بجے شام کو نکلنا، پہلے شیخ کلیم اللہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنا، پھر سید حسن رسول نما کے مزار پر جا کر حاضری دینا۔ مگر خود حکیم صاحب کے عقیدت مند بھی وضع کے بہت پابند تھے۔ رائے بہادر شو پرشاد کہ پوتڑوں کے امیر تھے اپنی حویلی کے بالا خانے میں منتظر بیٹھے رہتے۔ ادھر حکیم صاحب کی سواری حویلی کے برابر آئی ادھر شو پرشاد جی نے کھڑے ہو کر مودبانہ سلام عرض کیا۔ (۲)

ایک تھے مرزا یارن جان۔ کیا وضعدار آدمی تھے کہ حکیم محمود خاں کے وقت میں جو وضع قائم کی اسے بیٹوں کے ساتھ بھی نباہے چلے گئے۔ چاوڑی میں دکان تھی۔ دِن بھر تہبند باندھے نیم آستین پہنے بیٹھے رہتے اور رفو کرتے رہتے۔ جہاں شام ہوئی مرزا صاحب نے رفو کے کھڑاگ کو سمیٹا، گھر جا کے نہائے دھوئے، سجے بنے، تنگ پائجامہ، کرتا، کرتے پر انگرکھا، سر پہ دو پلی ٹوپی، پاؤں میں کامدار جوتی۔ اس رنگ سے سج بن کر دکان پر واپس آئے اور دکان کے آگے کرسی بچھا کے بیٹھ گئے۔ بیٹھے ہیں اور حکیم عبدالمجید خاں کا انتظار کرتے ہیں کہ ان کی سواری آئے تو سلام عرض کیا جائے۔ حکیم صاحب بھی کم وضعدار نہیں تھے۔ بھول چوک میں گاڑی آگے نکل جاتی تو دھیان آتے ہی گاڑی کو پھیرتے، واپس آ کر مرزا صاحب سے علیک سلیک کرتے اور پھر آگے جاتے۔ (۳)

عبادت گزار ایسے کہ مغرب سے عشاء تک کے وقت میں کسی سے بات نہ کرتے۔ خلوت میں بیٹھ کر عبادت کرتے، وظیفے پڑھتے۔ طبیب ایسے کہ نبض دیکھی اور پشتوں کا حال معلوم کر لیا۔

ایک مریض آیا، بر میں شیروانی، سر پر دستار۔ حکیم صاحب کی خدمت میں مودبانہ ایک اشرفی نذر کی۔ حکیم صاحب بولے کہ صاحب ہم مطب میں فیس نہیں لیا کرتے۔ مریض بولا کہ مفت میں کون علاج کرتا ہے۔ حکیم صاحب بولے کہ پھر ہمیں

بھی آزمائیے۔ یہ کہہ کے نبض دیکھی۔ دیکھتے دیکھتے حال پوچھا۔ مریض بولا کہ اگر میں نے اپنا حال بیان کر دیا تو آپ نے پھر نبض کیا دیکھی۔ حکیم صاحب بولے، اچھا تھوڑا توقف کیجئے۔ دوسرے مریضوں کو نبٹایا۔ پھر اس مریض کی نبض پر ہاتھ رکھا اور اس کا اگلا پچھلا سارا احوال سنا ڈالا۔ مریض قائل ہو گیا۔ اب وہ دوا مانگ رہا ہے اور حکیم صاحب دوا نہیں دیتے۔ "آپ علاج کرانے نہیں میرا امتحان لینے آئے تھے۔ امتحان لے لیا اب علاج کسی اور سے کرائیے۔ (۴)

ایک دفعہ حکومت سے ٹکرا گئے۔ دلی میں طاعون پھیلا۔ سرکاری حکم ہوا کہ طاعون زدگان شہر سے باہر کیمپ میں منتقل ہو جائیں۔ حکیم صاحب نے جواباً کہا کہ شہر سے باہر کوئی نہیں جائے گا۔ میں شہر کے اندر ہی ان کے علاج کا بندوبست کروں گا۔ مدرسہ طبیہ کے طلبہ کے دستے بنائے اور گلی گلی، کوچہ کوچہ مریضوں کی دوا دارو کرتے پھرے۔

حکومت نے ان کی طبی لیاقت کو تسلیم کیا اور حاذق الملک کا خطاب دیا۔ یوں انگریزی حکومت کی طرف سے پہلی مرتبہ ایک طبیب کو یہ خطاب ملا۔

مطب بھی کرتے او مدرسہ طبیہ میں جا کر درس بھی دیتے۔ درس میں کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ قانونِ شیخ پڑھاتے تھے اور کیا پڑھاتے تھے۔ بقول سید احمد ولی اللہی :

"حلقہ درس میں بیٹھ کر لگتا کہ بو علی سینا بھی بیان کرتا تو بس اتنا ہی کرتا۔"

مدرسہ طبیہ خود ایک تعلیمی تحریک تھا۔ مگر حکیم عبدالمجید خاں اس نئی تعلیمی تحریک کے بھی حامی تھے جو سرسید احمد خاں کی قیادت میں شروع ہوئی تھی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ساتواں اجلاس ۱۸۹۲ء میں دلی میں ہوا۔ قدامت پسندوں نے بہت مخالفت کی۔ اشتہار لگ گئے کہ کانفرنس میں جو شریک ہو گا وہ مرتد ٹھہرے گا۔ اس نرغے میں کانفرنس کو شریفی خاندان سے کمک پہنچی۔ اجمل خاں ابھی دلی ہی میں تھے۔ وہ اِس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے سیکرٹری بنے۔ حکیم عبدالمجید خاں اس مجلس کے رُکن تھے۔ اجلاس میں طب یونانی کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا۔ حکیم عبدالمجید خاں نے قرارداد پیش کی، اور اس قرارداد کے ساتھ جو تقریر کی اس میں اس پر زور دیا کہ کوئی

فن، کوئی علم کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ اضافے اور توسیع کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ یونانی طب سے سرجری کے خارج ہو جانے کا نتیجہ ان کی دانست میں یہ نکلا کہ "ہم آدھے طبیب رہ گئے۔" اُنھوں نے اعلان کیا کہ "جب تک ہم طب کے دونوں ٹکڑوں سے کام نہ لیں پورے طبیب کہلانے کے مستحق نہیں...... میری اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ ہم اپنے علم طب کی اصلاح کریں اور اس میں اعمالِ ید (سرجری) عملی طور پر جاری کریں۔ جہاں جہاں اس کی تشریح ناقص ہے اسے مکمل کریں اور ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کو جو بعض امراض میں اکسیر کا کام دیتی ہیں، اپنی کتابوں میں مدون کر کے یونانی کو وسعت دیں اور نئے نئے ایجادات و اختراعات کو اس میں شامل کریں۔"

اِس تصور نے مدرسہ طبیہ کو ایسی تحریک بنا دیا جو علی گڑھ تحریک کی ہمنوائی بھی کر رہی تھی اور ان پہلوؤں پر اصرار بھی کر رہی تھی جنہیں علی گڑھ تحریک نے نظرانداز کر دیا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں حکیم عبدالمجید خاں نے مدرسہ طبیہ کی خاطر ایک وفد ترتیب دیا جس میں علی گڑھ تحریک کے زعما بھی شامل تھے مثلاً منشی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد۔ یہ وفد دلی سے چل کر رامپور پہنچا اور نواب صاحب سے اپیل کی کہ مدرسہ کی سرپرستی کیجئے۔ حکیم اجمل خاں یہاں پہلے ہی افسر الاطبا کی حیثیت سے پہنچ چکے تھے۔ نواب صاحب نے مدرسہ کا سرپرست بننا قبول کیا اور سالانہ امداد میں اضافے کا وعدہ کیا۔

۱۱ جولائی ۱۹۰۱ء کو اس بزرگ نے ترپین سال کی عمر پا کر دنیا کو خیرباد کہا۔ خبر دِلی سے رامپور پہنچی۔ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کے گزرنے کی خبر پائی اور دِلی پہنچا۔

۱۴ اگست کو اس شخصیت کی یاد میں ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ ہندو اور مسلمان معززین شہر اکٹھے ہوئے۔ شہر کے ڈپٹی کمشنر میجر ڈگلس نے صدارت کی۔ وہاں سوچا گیا کہ اس مرحوم کو یاد کرنے کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ مدرسہ طبیہ کو کہ اس کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے فروغ دیا جائے۔ طے ہوا کہ اس ادارے کی ایک شاندار عمارت بنانے کا اہتمام کیا جائے۔ اس مقصد سے حاذق الملک میموریل فنڈ جاری ہوا۔ اور ایک لاکھ روپیہ اکٹھا کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس فنڈ کے لیئے حکیم اجمل خاں نے اپنے دستخطوں سے ایک اپیل جاری کی۔ پھر اس کی خاطر اگلے مہینے یعنی نومبر میں

ایک وفد لے کر علی گڑھ پہنچے۔ اس وفد میں مولانا حالی، منشی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور چند دوسرے عمائد شامل تھے۔ وہاں نواب محسن الملک نے اِس وفد کی بہت آوٴ بھگت کی۔

۱۹۰۱ء اسی مصروفیت میں گزر گیا۔ مگر یہ مصروفیت تو اب رہنی ہی تھی۔ حکیم عبدالمجید خاں کے بعد شریفی مسند پر حکیم واصل خاں بیٹھے تھے۔ مدرسہ طبیہ کی ساری ذمہ داری اب اجمل خاں کو سنبھالنی تھی۔ سو رامپور میں قیام اب ممکن نہیں رہا۔ اِس شہر میں رہتے رہتے اجمل خاں کو اب نو برس ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں انہوں نے رامپور کو سلام کیا اور نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیئے دلی روانہ ہوئے۔

حواشی

۱۔ حیات شبلی صفحہ ۲۹۸

۲۔ میرے زمانے کی دلی صفحہ ۲۰۱

۳۔ میرے زمانے کی دلی صفحہ ۱۸۷

۴۔ فرحت اللہ بیگ : مشاہیر سے ملاقات (مطبوعہ گفتگو بمبئی شمارہ جنوری فروری مارچ ۶۸ء صفحہ ۴۴

دِلّی بدل گئی

حکیم صاحب نے رامپور سے واپس آ کر اپنے شہر کو بہت بدلا ہوا پایا۔ شریف منزل میں تو خیر پچھلا قرینہ برقرار تھا۔ وضع قطع وہی جو حکیم محمود خاں کے وقت قائم ہوئی تھی۔ دوپلی ٹوپی، چوڑی دار پاجامہ، سلیم شاہی جوتی۔ بہت سردی لگی تو ہلکی اُونی چادر کاندھوں پر ڈال لی، بیٹھے ہیں تو ٹانگوں پر پھیلا لی۔ اِس چادر سے قطع نظر کیا گرمی کیا سردی، وہی ایک لباس۔ اکھاڑہ اسی طرح قائم تھا اور شریف منزل کے نوجوانوں میں کسرت کرنے اور جسم بنانے کا شوق برقرار تھا، مگر شریف منزل سے باہر دُنیا بہت بدل گئی تھی۔ انگرکھے اور اکھاڑے دونوں پر زوال آ چکا تھا۔ اچکن تو خیر انگرکھے ہی کی اولاد تھی مگر شہر میں اچکن کے سوا بھی کہیں کہیں ایک لباس نظر آنے لگا تھا۔ یہ کوٹ پتلون تھا۔ دوپلی ٹوپی کا عروج بھی ختم ہوا۔ اب نئے سر تھے اور نئی ٹوپیاں تھیں۔ ولایت سے ایک نئی ٹوپی آئی جو فیلٹ کیپ کہلائی۔ علی گڑھ سے تعلیم پا کر آنے والے خالی ڈگری لے کر نہیں آئے، کالے پھندنے والی سرخ ٹوپی بھی ساتھ لے کر آئے۔ اِس ٹوپی پر شروع میں بہت انگلیاں اُٹھیں۔ لوگوں نے اسے نیچریوں کی ٹوپی کہا اور رد کر دیا لیکن یہ مزاحمت زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ علی گڑھ اپنی ٹوپی سمیت دِلی میں نفوذ کرتا چلا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے سروں پر یہ ٹوپی دیکھ کر جو اب نیچری ٹوپی سے ترکی ٹوپی بن چکی تھی ہندوؤں نے فیلٹ کیپ کو سر چڑھایا۔ یہاں سے دِلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں تفریق پیدا ہونی شروع ہوئی۔

شہر میں اکھاڑے قائم تھے، مگر اب کچھ نئی ورزشیں اور نئے کھیل نکل آئے تھے جو اکھاڑے کے لیئے ایک چیلنج بن گئے تھے۔ پہلوان اور نچلے طبقوں کے نوجوان اب

بھی اسی ولولہ سے بدن پر مٹی ملتے اور زور کرتے دکھائی دیتے تھے مگر شرفا اکھاڑوں سے کھنچنے لگے تھے۔ انہیں ٹینس اور ہاکی کے کھیل اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

دِلی والوں نے تو سن ستاون کے آشوب کے بعد بھی زندگی کو اسی پچھلے قرینے پر ترتیب دیا تھا۔ تھوڑے عرصے تک تو یہی گمان رہا کہ پچھلا قرینہ لوٹ آیا ہے لیکن قیصری دربار کے ساتھ دوسرا ہی عمل شروع ہو گیا۔ پچھلے قرینے میں دراڑیں پڑتی چلی گئیں۔ انیسویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی دِلی اچھی خاصی بدل چکی تھی۔

انیسویں صدی اور ملکہ وکٹوریہ نے آگے پیچھے کوچ کیا۔ اب بیسویں صدی شروع تھی اور نئی روشنی کی آمد آمد تھی۔ پرانی روشنی اپنے مٹی کے دیوں، شمعوں فانوسوں کے ساتھ جھلملا رہی تھی۔ بجلی کے آنے کی خبریں تھیں اور کرزن دربار کا غلغلہ تھا۔

۱۹۰۳ء کی پہلی صبح کو کرزن دربار منعقد ہوا۔ کیا دُھوم دھام کا جلوس نکلا کہ آگے آگے لارد کرزن کا ہاتھی، پیچھے پیچھے ہندوستان کے سب راجے مہاراجے اپنے اپنے ہاتھیوں پر سوار، سونے چاندی کے ہودوں میں بیٹھے ہوئے۔ دِلی والوں نے ایک زمانے کے بعد ہاتھیوں کو بصد شان و شوکت قطار اندر قطار گزرتے دیکھا تھا۔ بس ریجھ گئے اور کرزن دربار کو ہاتھیوں کا دربار کہنے لگے۔ دن میں جلوس نکلا اور دربار ہوا۔ رات کو محفل رقص آراستہ ہوئی۔ دن کی برات کے دولہا لارڈ کرزن تھے، رات لیڈی کرزن نے لوٹ لی۔ مور کے پروں کی پوشاک بطورِ خاص تیار کرا کے زیب تن کی اور لال قلعہ کی مورنی بن گئیں۔ ڈیوک آف کناٹ کے ساتھ ہمرقص ہوئیں۔ اکبر الہ آبادی اس واقعہ کو لے اُڑے اور شعر کہا

ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن

کرزن صاحب نے بھی اپنے دورِ اقتدار میں کیا شہرت حاصل کی کہ ان کے نام پر ایک اخبار کا نام رکھا گیا۔ یہ اخبار کرزن گزٹ تھا۔ اسی زمانے میں شریف منزل سے ایک طبی رسالہ نکلنا شروع ہوا۔ یہ تھا 'مجلّہ طبیہ' ۔ یہ ماہوار رسالہ تھا اور مدرسہ طبیہ کا آرگن تھا۔ کچھ مدرسے کی خبریں، کچھ طبی مضامین۔ حکیم سید عبدالرزاق کو اس کی

ادارت سپرد ہوئی۔ حکیم واصل خان اس کے سرپرست بنے مگر اس کے رُوحِ رواں حکیم اجمل خاں تھے۔ وقتاً فوقتاً خود مضامین لکھتے تھے۔ پہلا مضمون پانی پر لکھا جس نے اتنا طول پکڑا کہ کئی قسطوں میں جا کر پورا ہوا۔

حکیم عبدالمجید خاں کے اِنتقال کے بعد انتظام یہ پڑا تھا کہ حکیم واصل خاں مسند شریفی پر بیٹھے اور مدرسہ طبیہ کا انتظام وانصرام حکیم اجمل خاں کے سپرد ہوا۔

حکیم صاحب تن من سے اس کام میں مصروف ہو گئے۔ اس سے جو وقت بچتا وہ قومی کاموں میں صرف ہوتا۔ اسی زمانے میں اُنہوں نے ہندوستانی دوا خانے کی بنیاد رکھی۔ ایک مشترکہ سرمائے کی کمپنی قائم کر کے گلی قاسم جان اور بلیماراں کے نکڑ پر دوا خانہ کھولا مگر ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ اِسی حالت میں سارے کام ہو رہے تھے زیادہ بیمار پڑ گئے۔ خدا خدا کر کے اچھے ہوئے اور 'کرزن گزٹ' میں خبر شائع ہوئی :

"جناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب اب بفضلہ تعالیٰ بہ نسبت پہلے سے اچھے ہیں۔ صرف ضعف باقی ہے" — نامہ نگار [1]

اسی حالت میں پھر مدرسہ طبیہ کے کام میں مصرورف ہو گئے۔ مدرسہ میں اجمل خاں، مطب میں واصل خاں۔ دونوں بھائی اپنے اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔

حکیم واصل خاں کیا نرالے آدمی تھے۔ خوش پوش، رنگین مزاج، طبیعت میں غصہ بہت تھا۔ اکھاڑہ اور مطب دونوں میدانوں میں صاحب کمال تھے۔ ایک زمانے تک صرف اکھاڑے سے غرض رکھی یا چوسر اور شطرنج سے۔ باپ نے ایک روز کہہ دیا کہ میاں، اپنے بڑے بھائی کو دیکھو اور چھوٹے بھائی کو دیکھو۔ دونوں طب میں کامل ہوا چاہتے ہیں۔ بس اس پر تاؤ کھا گئے۔ والدہ سے جا کر کہا کہ آج سے ہمارا کھانا ہمارے کمرے میں بھجوا دیا کرو۔ یہ کہہ کے کمرے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ گئے اور کتابوں کے ساتھ جت گئے۔ طب کا سارا علم یکمشت پڑھ ڈالا۔ ایک سال گوشہ نشین رہنے کے بعد باپ کو آ کر رپورٹ دی کہ لیجئے اب ہمارا امتحان۔

جس ڈھب کے آدمی تھے اسی ڈھب سے علاج کرتے تھے۔ ایک مریض آنکھ کی پرانی تکلیف لے کر آیا۔ دیکھتے ہی بولے کہ آکھ کا دودھ سلائی سے لگا لے۔ جس نے یہ سنا سر پٹیا اور مریض کو سمجھایا کہ ایسا مت کرنا، رہی سہی بینائی بھی پٹ ہو جائے

گی۔ مگر مریض بھی اپنے حکیم کا عقیدت مند تھا۔ اس نے آکھ کا دودھ لیا اور سلائی سے آنکھ میں لگایا۔ بہت تکلیف ہوئی، بہت پانی بہا۔ مگر اس عمل سے آنکھیں روشن ہو گئیں۔

قریب و دور کی ریاستوں سے بلاوے آتے اور حکیم واصل خاں جب وہاں پہنچتے تو ہاتھوں ہاتھ لیئے جاتے۔ بھائی کی بیماری کے زمانے میں دیر سے بلاوا آ گیا۔ بہت انکار کیا مگر پھر جانا ہی پڑا اور کرزن گزٹ میں خبر شائع ہوئی۔

"عالی جناب حکیم محمد واصل خاں صاحب نواب محمد شریف خاں صاحب والئی دیر کے علاج کے واسطے تشریف لے گئے ہیں۔ نواب صاحب نے اپنے صاحبزادے اور بھائی کو حکیم صاحب کو لینے کے لئے بھیجا تھا۔ اگرچہ اِس وقت حکیم صاحب کا ارادہ بسبب اپنے برادرِ خرد حکیم محمد اجمل خاں صاحب کی علالت کی وجہ سے نہ تھا لیکن نواب صاحب بہادر کے متواتر خطوں اور ان کے صاحبزادے اور بھائی کے اصرار نے ان کو مجبور کیا کہ وہ دیر تشریف لے جائیں۔ نواب صاحب والئی دیر نے پانچ ہزار آدمی فقط راستہ کے انتظام کے واسطے مقام درگائی تک جہاں تک ریل ہے بھیجے تھے اور جب حکیم صاحب نواب صاحب کے علاقہ میں پہنچے تو نواب کے منجھلے صاحبزادے نے معہ ہمراہیاں حکیم صاحب کا استقبال کیا اور دو سو روپے حکیم صاحب پر سے نچھاور کیے........ دس بارہ روز کے علاج میں نواب صاحب بغیر سہارے چل پھر سکتے ہیں۔" (۲)

حکیم واصل خاں آدمی رنگین مزاج اور خوش پوش تھے

حکیم واصل خاں کی عمر نے وفا نہیں کی۔ اُنھوں نے مسند شریفی پر بیٹھ کر تین برس گزارے اور تینتالیس سال کی عمر میں دُنیا سے گزر گئے۔ درگاہ سید حسن رسول نما میں دفن ہوئے۔

یہ ۱۹۰۴ء کا واقعہ ہے۔ دونوں بڑے بھائی آگے پیچھے دُنیا سے سدھار گئے۔ اب اجمل خاں اکیلے تھے۔ اب وہی خاندان کے سرِدھرے اور شریفی روایت کے امین تھے۔ کچھ بھائی کی جدائی کا صدمہ، کچھ نئی ذمہ داریوں کا بوجھ، حکیم صاحب پھر بیمار پڑ

گئے۔ عارضہ قلب نے آگھیرا۔ دورہ اس شدت کا پڑتا تھا کہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ سوچا کہ دِلی سے نکلو، شاید اس طرح بھائی کی جدائی کا غم غلط ہو جائے اور آب و ہوا کے بدلنے سے طبیعت سنبھل جائے۔ ستمبر ۱۹۰۴ء میں دلی سے نکلے۔ کچھ دنوں میرٹھ رہے۔ پھر لاہور پہنچے۔ وہاں سے چمن کی طرف نکل گئے۔ ڈھائی تین مہینے اِسی طرح سیر و سفر کرتے رہے مگر مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ آخر اُنھوں نے ہندوستان سے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ سفر عراق کا منصوبہ بنا۔

حکیم صاحب دِلی واپس آئے۔ یہاں سے ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ء کو روانہ ہوئے۔ ۱۸ مارچ کو کراچی سے جہاز میں بیٹھے۔ بصرہ اور بغداد سے گزر کر نجف اشرف ہوتے ہوئے کربلائے معلی پہنچے۔ تبدیلی آب و ہوا کا خیال اب پیچھے رہ گیا تھا۔ نجف اور کربلا کا سفر ایک روحانی تجربہ بن گیا۔ کیسی بیماری، کہاں کی بیماری، اب اور ہی عالم تھا جو یوں قلمبند کیا گیا:

"آج ۲۴ تاریخ ہے۔ کوفہ سے گدھوں پر روانہ ہوئے۔ الحمدللہ کہ سنت اہل بیت بھی ادا ہو گئی۔ تنہا ہوں۔ دُھوپ میں چل رہا ہوں۔ اِس وقت کوئی رفیق ہمراہ نہیں۔ سب نے اپنے اپنے آرام میں ساتھ چھوڑ دیا۔ ظاہری پریشانی ہے مگر دِل نہایت خوش ہے اور طبیعت میں ایک جذبہ اُس وقت سے پیدا ہو گیا جب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کے مقتل کی زیارت کی ہے۔" (۳)

حواشی

۱۔ کرزن گزٹ، یکم مئی ۱۹۰۴ء ص ۱۴
۲۔ کرزن گزٹ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۴ء ص ۱۴
۳۔ بحوالہ سیرت اجمل ص ۱۴

خاندانِ شریفی کی مسند پر

"تنہا ہوں۔ دُھوپ میں چل رہا ہوں۔" دِلی کا مسافر نجف کی راہ میں اکیلا تھا اور دھوپ میں چل رہا تھا۔ اِدھر دلی میں بجلی آ چکی تھی اور ٹریموے چل پڑی تھی۔ ایک نئی سواری موٹر نام کی شہر میں نمودار ہوئی تھی۔ جو خلقت کبھی شاہی سواری کے ہاتھیوں کو ذوق و شوق سے دیکھا کرتی تھی اب موٹر کو دیکھ کر متحیر تھی۔

دِلی کا مسافر نجف کی راہوں سے دھوپ لے کر واپس ہوا۔ تبدیلی آب و ہوا کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اب اندر کی آب و ہوا بدلی ہوئی تھی۔ طبیعت بحال تھی۔ حکیم صاحب اپنے آپ کو بہت تندرست اور توانا محسوس کر رہے تھے۔ مسند شریفی پر بیٹھے۔ مطب کو آباد کیا۔ طب کو نئے گرد و پیش میں نئے سرے سے استوار کرنے کا ذوق کچھ اور تیز ہو گیا تھا۔ اسی کے ساتھ ایک اور جذبہ بھی اس شخص کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ قومی زندگی کی تعمیر نو میں شریک ہونے کا جذبہ۔ یہی جذبہ اُنہیں دلی سے علی گڑھ لے گیا۔

یہ ۱۹۰۵ء کے ابتدائی ایام تھے۔ حکیم صاحب نے مطب اور مدرسہ طبیہ کی مصروفیتوں کے ساتھ ایک اور مصروفیت اپنے لیئے پیدا کر لی۔ قومی سرگرمیوں مین حصہ لینے لگے۔ پھر اِسی سلسلہ میں علی گڑھ کا سفر کیا۔ وہاں ان دنوں نواب رامپور آئے ہوئے تھے۔ وہ انہیں وہیں سے کھینچ کر اپنے ساتھ رامپور لے گئے مگر اب وہ رامپور میں زیادہ قیام نہیں کر سکتے تھے۔ دلی میں نئی مصروفیتیں اُن کی منتظر تھیں۔

حکیم صاحب جلد ہی دلی واپس آئے کہ یہاں مدرسہ طبیہ کا سالانہ جلسہ سر پر

کھڑا تھا۔ واپس آتے ہی جلسہ کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ اسی میں ۵ء گزرا اور ۶ء میں یہ جلسہ منعقد ہوا۔ حکیم صاحب نے اپنی تقریر میں طب کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا اور اس کی بہتری کے لئے تجاویز پیش کیں:

"ہمارے ذخیرہ ادویات کی حالت کچھ اضافے اور اِصلاح کی محتاج ہے۔ صرف ہندوستان میں بہت سی جڑی بوٹیاں ایسی موجود ہیں اور کوشش سے فراہم کی جا سکتی ہیں جو ہر طرح کار آمد اور مفید ہوں لیکن ہم کو اس طرف مطلق توجہ نہیں ہے .... ہمارے مجربات کی حالت یہ ہے کہ جس کے پاس کوئی نسخہ ہوتا ہے وہ اس کو بری طرح چھپاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہمارے علم علاج میں کچھ نقائص ہیں اور ہم سب کا یہ مشترکہ فرض ہے کہ اپنی مجموعی قوت سے اُن نقائص کو رفع کریں۔ ہماری طب کا بڑا حصہ جا چکا ہے اور اگر ہم اتفاق اور دِلی ہمدردی کے ساتھ اپنی طب یونانی اور ویدک کی خدمت اور حفاظت پر آمادہ نہ ہوئے تو سمجھ لیجئے کہ وہ زمانہ آگیا ہے کہ ان کا بقیہ حصہ بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اِس لیئے میری خواہش ہے کہ ہر سال مختلف دیار و امصار کے اطبا ایک جگہ جمع ہوا کریں اور باہمی اِتحاد کے ساتھ ان باتوں پر غور کر کے اپنی طب کی خدمت کیا کریں۔"

طبی محاذ پر یہ کچھ ہو رہا تھا ادھر سیاسی محاذ بھی گرم تھا۔ تقسیم بنگال نے ایک طوفان بپا کر رکھا تھا۔ سرسید تحریک ابھی تک محض تعلیمی تحریک تھی لیکن تقسیم بنگال کے واقعہ نے سیاست کا محاذ اتنا اہم بنا دیا تھا کہ اس تحریک کے موجودہ رہنما اِس سے اغماض نہیں برت سکتے تھے۔ اب اُنہیں سیاسی سطح پر اپنے تحفظ کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اِس نوزائیدہ سیاسی سرگرمی میں اجمل خاں بھی شامل ہو گئے۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو آغا خاں کی قیادت میں ایک وفد وائس رائے سے ملا اور مسلمانوں کے لیئے مطالبات پیش کئے۔ اِس وفد میں حکیم صاحب بھی شامل تھے۔ اِس کے چند دنوں بعد دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس نواب وقار الملک کی صدارت میں

منعقد ہوا۔ یہاں یہ تحریک پیش ہوئی کہ مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت بنائی جائے۔ نواب ڈھاکہ سر سلیم اللہ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی قیام کی قرارداد پیش کی۔ حکیم صاحب نے اس کی تائید کی۔ (۱) قرارداد منظور ہوئی اور ایک کمیٹی مسلم لیگ کا آئین وضع کرنے کے لیئے قائم ہوئی۔ حکیم صاحب اِس کے رُکن چنے گئے۔ (۲) یہ حرف آغاز تھا ہندی مسلمانوں اور حکیم صاحب کی سیاسی زندگی کا۔

حکیم صاحب ڈھاکہ سے دلی واپس آئے اور پھر طبی کاموں میں مصروف ہوگئے۔ اب وہ دو دو جگہ مصروف تھے۔ طب کی مصروفیات الگ، قومی زندگی کی مصروفیات الگ۔ مدرسہ طبیہ کے مصارف کیسے پورے ہوں، یہ ایک مسئلہ تھا۔ اس مسئلہ کو انہوں نے یوں حل کیا کہ انڈین میڈیسن کمپنی قائم کی۔ جس نے بعد میں ہندوستانی دواخانہ کا نام پایا اور کافی مشہور ہوا۔ دواخانے کے قیام کی غرض و غایت یہ تھی کہ اگر یہ دواخانہ کامیاب ہو گیا تو اِس کی آمدنی سے مدرسہ طبیہ کے اخراجات کی کفالت بہ آسانی ہوتی رہے گی اور اِس کے لیئے دوسروں کی طرف دیکھنا نہیں پڑے گا۔ چنانچہ جب ہندوستانی دواخانہ مدرسہ طبیہ کے نام وقف کر دیا گیا تو پھر کسی سرکاری یا نجی امداد کی محتاجی باقی نہ رہی۔

مطب، مدرسہ، مسلم لیگ۔ ایک جان اور تین ذمہ داریاں۔ اور ہر ذمہ داری کو اس طرح ادا کرنا کہ اِس میں جان لڑا دینا۔ اس کا اثر صحت پر پڑا۔ ۱۹۰۷ء کے جون اور جولائی کے مہینے اِس اعتبار سے اِن پر سخت گزرے۔ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے اگست میں کوئٹہ کا سفر کیا۔ چند ماہ خیرپور اور فرید کوٹ میں گزارے۔ جب دسمبر کا مہینہ آیا تو مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے کراچی روانہ ہو گئے۔

حکیم صاحب اس اجلاس سے فراغت پا کر دلی واپس آئے۔ ادھر ۱۹۰۸ء کے آغاز کے ساتھ ہی خطاب یافتگان کی فہرست شائع ہوئی اور اس کے ساتھ حکیم صاحب نے اپنے آپ کو حاذق الملک کے خطاب سے سرفراز پایا۔ اِس خطاب پر بہت مبارک سلامت کا شور مچا۔ جلسے ہوئے۔ سپاسنامے پیش ہوئے۔ تہنیتی نظمیں پڑھی گئیں۔ ایک جلسہ ۷ جنوری کو ٹاؤن ہال میں نواب امیرالدین خاں والئی ریاست لوہارو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولانا حالی نے تقریر کی:

"جو معزز خطاب گورنمنٹ ہند نے جناب رئیس الاطبا حکیم محمد اجمل خاں صاحب کو حال میں عطا کیا ہے وہ نہ صرف اہل دہلی و نواحِ دہلی کے، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر حصے اور صوبے کے لوگوں کی خوشی کا باعث ہوا ہے حکیم صاحب جس نامور اور شہرہ آفاق خاندان کے ممبر ہیں، اُن کی ناموری اور شہرت ہندوستان کی حدود سے گزر کر ایشیا گیر ہو گئی ہے۔ اِس خاندان نے صرف علم طب، حذاقت اور دست شفا ہی میں نام پیدا نہیں کیا بلکہ جس فیاضی، فراخ حوصلگی اور سیرچشمی کا برتاؤ ہر ادنیٰ، اعلیٰ، مقامی، مسافر اور قریب و دُور کے ساتھ اِس خاندان میں دیکھا گیا ہے اس کی مثال نہ صرف ہندوستان میں بلکہ شاید دنیا کے تمام طبیبوں اور ڈاکٹروں میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

لیکن اے صاحبو! حاذق الملک ایک ایسا خطاب ہے جو عام خطابات کی طرح صاحب خطاب کی ایک خاص حیثیت پر دلالت کرتا ہے۔ مگر ہمارے محترم ہیرو میں اور بہت سی ایسی حیثیتیں موجود ہیں جو خاص کر جماعت اطباء میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ عربی اور فارسی لٹریچر سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ دونوں زبانوں میں مثل اہل زبان تکلم کر سکتے ہیں۔ طب میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ قومی خدمات سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ حسن اخلاق کے لحاظ سے میں ان کو ایک غیر معمولی انسان خیال کرتا ہوں۔ میں ان کے اخلاقی فضائل کا زیادہ ذکر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ ان کی زیادہ مدح و ثنا کہیں ان کو وسعت اخلاق میں زیادہ ترقی کرنے پر آمادہ نہ کرے۔ ان کا اخلاق اب اِس درجے پر پہنچ گیا ہے کہ انہوں نے ابنائے جنس کی خدمت پر اپنے ضروری آرام و آسائش کو جس کے بغیر انسان کی صحت قائم نہیں رہ سکتی قربان کر دیا۔" (۳)

مولانا حالی نے نظم اور نثر دونوں میں داد کے ڈونگرے برسائے۔ مگر جس پر یہ ڈونگرے برس رہے تھے وہ جلسہ میں موجود نہیں تھا۔ انہوں نے ایک قطعہ حکیم صاحب کو خطاب کر کے لکھا تھا، انہیں موجود نہ پا کر کہا کہ

"چونکہ حکیم صاحب اس وقت موجود نہیں ہیں اِس لیئے میں نواب فیض احمد خان صاحب ہی کو حکیم صاحب کا قائم مقام فرض کر لیتا ہوں۔"

اور پھر یہ قطعہ پڑھا:

"حاذق الملک! اِس خطابِ فرخ و مسعود پر
ایک عالم آپ کو دیتا مبارک باد ہے
پر یہ ہے کیسی مبارکباد ہم حیران ہیں
گو کہ دِل ہر اپنے بیگانے کا اِس سے شاد ہے
سعی و کوشش آپ نے کی تھی کبھی بہر خطاب
یا کوئی درخواست دی تھی آپ نے کچھ یاد ہے
یہ تو یاروں کی دُعاؤں کا ہے بس سارا ظہور
غیب سے یہ ان دُعاؤں کی ہوئی امداد ہے
پس مبارکباد یہ جو دے رہے ہیں خاص و عام
مستحق ہیں اس کے ہم یا آپ، کیا ارشاد ہے"

دلی میں تہنیتی جلسے ہو رہے تھے اور حکیم صاحب سفر میں تھے۔ انہیں دلی میں ٹکنے کون دیتا تھا۔ پورے ملک میں اُن کی طب کا ڈنکا بج چکا تھا۔ آج ایک شہر سے بلاوا آ گیا تو کل دوسرے شہر نے کھینچ بلایا۔ جولائی کے مہینے میں دہرہ دون کا سفر کیا۔ آٹھ دس دن کے قیام کے بعد واپس ہونے لگے تو ہمراہیوں سے یہ پروگرام طے کیا کہ مجھے رستے میں کام ہے سو میں تو سہارنپور تک موٹر میں جاؤں گا۔ آپ لوگ ریل سے چلیں۔ میں سہارنپور سٹیشن پر آپ سے ملوں گا۔

حکیم صاحب دہرہ دون سے نکلے ہی تھے کہ بارش ہونے لگی اور جھکڑ چلنے لگے۔ ڈرائیور نے موٹر کی رفتار تیز کر دی۔ بس اِسی میں اختلاج کا دورہ پڑا اور وہ بیہوش ہو گئے۔ ملازم نے ایک کسان کی جھونپڑی میں پہنچایا اور خود کیلاش پور پہنچ کر وہاں کے محمد نعیم خان کو اِس واقعہ کی اطلاع دی۔ محمد نعیم خاں نے جھٹ پٹ پالکی میں انہیں کیلاش پور لانے کا انتظام کیا۔ اب ادھر کی سنو۔ ہمراہی رات کے بارہ بجے سہارنپور پر اُترے۔ اُن کی آنکھیں حکیم صاحب کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ وہ کہیں نظر نہ

آئے۔ ہاں کیلاش پور سے ایک پالکی آئی جو انہیں کیلاش پور لے گئی۔ وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ حکیم صاحب بستر علالت پر دراز ہیں۔ رنگ پیلا ہلدی۔ بولنے کی سکت نہیں۔

آٹھ دس دن میں جب حالت دُرست ہوئی تو دلی آئے مگر اُن کے لیئے چین کہاں تھا۔ چند دن گزرے تھے کہ جاورہ سے بلاوا آ گیا۔ وہاں چلے گئے۔ ۱۳ ستمبر کو کانپور پہنچ کر مدرسہ الہیات کا افتتاح کیا۔ اواخر دسمبر میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی غرض سے امرتسر کا سفر کیا اور اُلٹے پاؤں دلی واپس آئے۔

حکیم صاحب اِن دنوں دلی کے سب سے سرگرم آدمی تھے او ردلی کا معاملہ اس وقت یہ تھا کہ اِس شہر میں نئی روشنی تو آ گئی تھی، نئے شعور نے ابھی جنم نہیں لیا تھا۔ یہ ایک روایتی معاشرہ تھا جو اپنے آپ میں مگن اور مطمئن تھا۔ نئی ایجادات نے اسے متحیر کیا اور نئے رویوں نے اسے مشتعل کیا۔ موٹر اور ٹریموے کو لوگوں نے حیرت سے دیکھا اور قبول کر لیا، مگر ترکی ٹوپی کو قبول کرتے کرتے انہیں بیس سال لگ گئے۔ یہاں پیدا ہونے والے نئے ذہن جب تک یہاں رہے مطعون رہے۔ یہاں سے نکل کر اُنہوں نے تحریکیں چلائیں اور ذہنوں کو نئے رستوں پر ڈالا۔ باہر کی دُنیا میں اُن کی حیثیت مصلحین کی تھی۔ دلی والوں نے انہیں نیچری کہا اور اُن پر انگلیاں اُٹھائیں۔

اب اِس روایتی معاشرے میں ایک نیا شخص اُبھرا جو دلی کی روایت کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا اور چپکے چپکے نئے شعور کے لیئے بھی راہ ہموار کر رہا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں بالخصوص مسلمانوں میں فکر و احساس کی سطح پر جو تبدیلیاں آ رہی تھیں اور ان سے جو نئی قومی زندگی نشوونما پا رہی تھی اسے اس نے شہر شہر گھوم پھر کر مشاہدہ کیا اور اس میں شامل ہوا۔ اب اس کی کوشش یہ تھی کہ اِس نئے قومی شعور سے دلی کا ملاپ کرایا جائے۔ اس نے آگے پیچھے ایسے کئی قدم اُٹھائے۔

۱۹۰۹ء شروع ہو چکا تھا۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ مدرسہ طبیہ میں ایک تقریب کا اہتمام ہوا۔ تقریب یہ تھی کہ اِس مدرسہ میں اب ایک زنانہ شعبہ قائم ہو رہا تھا۔ لفٹنٹ گورنر پنجاب کی لیڈی صاحبہ مہمانِ خصوصی بن کر یہاں آئیں اور اس شعبہ کا افتتاح کیا۔ حکیم صاحب نے تقریر میں اِس شعبہ کی اہمیت جتائی اور اعلان کیا کہ

"کوئی تعلیمی کام کامل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ سوسائٹی کے نصف حصہ یعنی خواتین کے ساتھ سچی ہمدردی کا عنصر اس میں شامل نہ ہو....."

سرسید تحریک کے دانشور تعلیم نسواں کی ابھی صرف باتیں کر رہے تھے۔ حکیم صاحب نے اس کا سچ مچ آغاز کر دیا۔

اِس شعبہ کی تنظیم سے فارغ ہو کر جون کے مہینے میں حکیم صاحب نے دوسرا قدم اُٹھایا۔ نواب وقار الملک سے درخواست کی کہ مسلم لیگ کا آئندہ سالانہ اجلاس دِلی میں منعقد کیا جائے۔ وقار الملک مان گئے۔ ادھر حکیم صاحب پورے جوش و خروش سے جلسہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ایک پاؤں دِلی میں تھا تو دوسرا پاؤں علی گڑھ میں۔

۱۹۱۰ء کے آغاز کے ساتھ دِلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی دُھوم پڑی۔ یہ اجلاس ۲۹ اور ۳۰ جنوری کی تاریخوں میں سنگم تھیٹر میں منعقد ہوا۔ شہزادہ ارکاٹ سر غلام محمد علی خاں نے صدارت کی۔ اِستقبالیہ کمیٹی کے صدر حکیم صاحب تھے۔ ان کی تقریر سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ ان کی تقریر اُس اعلان سے شروع ہوئی کہ بچہ بالغ ہو گیا ہے۔ "جو جماعت جہانگیر کے شہر میں تولد ہوئی تھی اُس نے شاہ جہاں کے شہر میں پہنچ کر طفولیت کی منزل کو طے کیا۔" (۴) طفولیت کی منزل اس طرح طے ہوئی کہ مسلم لیگ اب ایجوکیشنل کانفرنس سے الگ ہٹ کر اپنے سیاسی وجود کا اظہار کر رہی تھی اور حکیم صاحب اعلان کر رہے تھے کہ، "مسلمانوں کا یہ پہلا اجتماع ہے جس کے مقاصد خالصتاً سیاسی ہیں۔" (۵)

مسلمانوں کے لیئے یہ ایک نیا واقعہ تھا۔ قومی سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو سیاسی عمل سے بدکتے تھے۔ مسلم لیگ کے اُبھرتے ہوئے سیاسی کردار سے ان کی ذہنی مفاہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ سرسید احمد خاں کے غیر سیاسی طریق عمل کو مستند اور مسلمانوں کے لیئے حرف آخر جانتے تھے۔ حکیم صاحب نے سرسید احمد خاں کے رویے کی یوں وضاحت کی کہ اس وقت مسلمان ہندوؤں سے تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ سرسید احمد خاں چاہتے یہ تھے کہ مسلمان پہلے کسی طرح تعلیم کے میدان میں ہندوؤں کے برابر آجائیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ

مسلمان اس وقت سیاست میں شامل ہوئے، تو یہ مقصد پورا نہ ہو سکے گا۔ اس لیئے انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا۔ "لیکن کانگریس کے بارے میں سر سید کے اِس رویے سے یہ استدلال کرنا غلط ہو گا کہ سر سید چاہتے تھے کہ مسلمان ہمیشہ ہی سیاست سے الگ تھلگ رہیں۔ اُنھوں نے تو خود ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کرنے میں بہت حصہ لیا تھا۔ ان کی بے وقت موت نے اِس تحریک کو ایک قائد سے محروم کر دیا۔ بہرحال اس وقت سے ابتک کے عرصے میں ایک طرف تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی تھی، دوسری طرف ہندوستان میں حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ ایسی صورت میں ملک کی سیاسی زندگی سے الگ تھلگ رہنا کسی صورت جائز نظر نہیں آتا۔" (۶)

یہ تقریر ایک نئے رویے کا اعلان تھی۔ ہندوستان سیاسی رنگ پکڑتا جا رہا تھا۔ معرکہ ستاون کی مار کھائے ہوئے مسلمان اس رنگ سے خائف تھے مگر انہیں کے بیچ ایسے لوگ پیدا ہو چکے تھے جن کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ ایجوکیشنل کانفرنس کے بطن سے ڈھاکہ میں پیدا ہوئی تھی۔ مگر دلی پہنچتے پہنچتے بچہ بالغ ہو چکا تھا اور سیاسی باتیں کر رہا تھا۔

اِس اجلاس میں مولانا شبلی بھی شریک تھے۔ حکیم صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی اور یہ طے ہوا کہ ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس ۲۶۔۲۷ اور ۲۸ مارچ ۱۹۱۰ء کی تاریخوں میں دلی میں منعقد کیا جائے۔ سو حکیم صاحب مسلم لیگ کے اجلاس سے فارغ ہوتے ہی ندوۃ العلماء کے اجلاس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے مگر یہ مرحلہ کٹھن تھا۔ قدامت پسند علماء کے نزدیک ندوۃ العلماء بھی نیچریوں کا شگوفہ تھا۔ دلی کا قدامت پسند گروہ نیچریوں پر ویسے ہی خار کھائے بیٹھا تھا، ندوۃ العلماء کا دلی میں وُرود انہیں بھلا کاہے کو بھلا لگتا۔ ادھر مولانا شبلی نے 'الندوہ' کے اداریے میں اس اجلاس کی خوشخبری دیتے ہوئے اپنی دانست میں یہ مژدہ سنایا کہ مولانا حالی اور ڈپٹی نذیر احمد بھی شریک جلسہ ہوں گے۔ یہ دونوں کے دونوں نیچری، اور ڈپٹی نزیر احمد تو وہ تھے جنھوں نے 'امہات الامتہ' لکھی تھی۔ ابھی ایک ڈیڑھ برس پہلے اس پر طوفان اُٹھ چکا تھا اور ڈپٹی نذیر احمد کافر قرار دیئے جا چکے تھے۔ مخالف اِس خبر کو لے اُڑے۔ دبا ہوا طوفان پھر اُٹھ کھڑا

ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ "ارکانِ ندوہ نے بلکہ درحقیقت حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے مولوی نذیر احمد صاحب اور مخالفین کے درمیان اس بات پر مصالحت کرائی کہ کتاب کے نسخے اُن لوگوں کے سپرد کر دیے جائیں اور آئندہ اس کی اشاعت بند کر دی جائے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے وہ نسخے فریق مخالف کے پاس بھیج دیئے۔" مگر بات اس پر ختم تھوڑا ہی ہوئی۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ کتابوں کے ڈھیر کو آگ لگائی گئی۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ مولوی عبدالحق نے مولانا شبلی پر الزام لگایا کہ یہ ان کی کارستانی تھی۔ ڈپٹی نذیراحمد کے بیٹے اور پوتے نے حکیم صاحب کو الزام دیا۔

مولانا سلیمان ندوی نے مولوی عبدالحق کو جواب دیا کہ صاحب مولانا شبلی تو موقعہ واردات پر موجود ہی نہیں تھے۔ ابھی وہ دلی پہنچے نہیں تھے، کہ یہ واقعہ گزر گیا، تو پھر یہ شوشہ حکیم صاحب کا تھا۔ مولانا سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ نہیں، خود ڈپٹی نذیراحمد کا یہ کیا دھرا تھا۔ تاجر جو ہوئے۔ "شاید مولوی صاحب کو اس کا خطرہ ہو کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی کتاب سے کوئی دوسرا نفع اُٹھا لے۔" (۷)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیرانی نے واقعہ یوں بیان کیا کہ :

> "ندوۃ العلماء کے ارکان و شرکا اِس کے جلانے پر آخر تک آمادہ نہ تھے۔ خود مولوی صاحب مرحوم کی تحریک تھی۔ اِس طرف کے تامل نے تحریک کو اصرار سے بدل دیا۔ اصرار نے شدت اختیار کی بلکہ دھمکی کی صورت جیسی کہ مولوی صاحب مرحوم کی طرف سے ایسے موقع پر ہوا کرتی تھی۔ مسیح الملک مرحوم نے بالآخر کہا کہ میں نے شیر کو کٹہرے میں بند کر دیا، آپ نکالتے ہیں۔ اس پر جلسہ کر کے غور کیا گیا اور مولف مرحوم کی تائید ہوئی۔ چنانچہ رسالے جلائے گئے۔ مٹی کا تیل لا کر دو بجے رات کو جس نے رسالوں پر ڈالا، وہ میں ہی تھا۔ اتفاق یہ کہ جلانے کے بعد آندھی نے خاکستر اُڑا دی۔ بارش نے جگہ صاف کر دی۔ اس طرح ہلاس سونگھنے کا موقعہ کسی کو نہ مل سکا۔" (۸)

مگر شاید اِس کتاب کی تقدیر ہی میں جلنا پھکنا لکھا تھا۔ پھر یہی واردات گزری۔

دوسری مرتبہ اِسے شاہد احمد دہلوی نے چھاپا۔ اس مرتبہ عظیم بیگ چغتائی کا جوشِ مردانگی اسے لے بیٹھا۔ اُنھوں نے اس کتاب کا محافظ بننے کی ٹھانی۔ شاہد صاحب سے کتاب کا سارا ڈھیر منگا کے اپنے گھر رکھ لیا اور ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ 'امہات الامتہ' ہمارے پاس ہے۔ یعنی آبیل مجھے مار۔ مولویوں نے مزاح نگار کی للکار کا خاطرخواہ جواب دیا۔ اس گھر پہ ہلہ بول دیا۔ عظیم بیگ چغتائی نے کتابوں کا ڈھیر مولویوں کے حوالے کر کے جان بچائی۔ مولویوں نے ایک مرتبہ پھر کتاب پر مٹی کا تیل چھڑکا اور دیاسلائی دکھا دی۔ (۹)

بہر حال ندوۃ العلماء کو دِلی میں آکر کوئی نہ کوئی صدقہ تو دینا ہی تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے صدقے کا انتظام کیا۔ 'امہات امتہ' کے جلنے سے دشمنوں کا جی ٹھنڈا ہو گیا۔ اِس کے بعد ندوۃ العلماء کے اجلاس میں کسی نے چوں نہیں کی۔ قدامت پسند اپنی باری لے چکے تھے۔ اب حکیم صاحب کی باری تھی۔ اِس اجلاس میں صدر وہی تھے۔ ان کا خطبہ صدارت کیا تھا قدامت پسندوں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا:

"میرا خیال یہ ہے کہ ابتدائے اسلام سے غدر ۱۸۵۷ء تک جس قدر تکفیر کے فتوے لکھے گئے ہیں اگر انہیں ایک جلد میں جمع کیا جائے تو ہرگز اس جلد کی ضخامت اس جلد کے برابر نہ ہو سکے گی جو ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک' کے کفر کے فتوؤں کی ہو گی۔ یہ وبائے تکفیر صرف اشخاص تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ان سے ترقی کرکے گروہوں تک متعدی ہو گئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ شیعہ سینوں کو اور سنی شیعوں کو، مقلدین، اہل حدیث کو اور اہل حدیث، مقلدین کو کافر بنانے لگے...... اس تکفیر نے مسلمانوں میں باہمی منافرت پیدا کر دی جس سے ہمیں بے انتہا نقصانات پہنچے۔ ادھر لکھنؤ میں کئی مرتبہ شیعہ اور سینوں کے درمیان شرمناک قصے پیش آئے تو ادھر دہلی میں بھی مقلدین اور اہل حدیث نے کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی، بلکہ دہلی لکھنؤ پر شرف لے گئی کہ یہاں صرف ولاالضالین اور امین بالجہر پر آپس کی رشتے داریاں منقطع ہو گئیں ...... ندوۃ العلماء کے ساتھ اس وجہ سے مخالفت اور بھی زیادہ

تھی کہ وہ آپس کے جھگڑوں کو مٹانا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد تھا اور ہے کہ شیعہ، سنی، مقلد، اہل حدیث سب ایک جگہ بیٹھ کر اپنی اصلاح و فلاح کے متعلق تدابیر اختیار کریں اور اختلافی مسائل میں کوئی جھگڑا نہ کریں۔ یہ مقصد اگر کم بینی کی وجہ سے برا سمجھا جا سکتا ہے تو تمام اسلامی فرقوں کو علی التساوی اسے برا سمجھنا چاہیے لیکن جہاں تک مجھے علم ہے، ندوہ کی مخالفت کرنے والے اور اِس کے ہر ایک اجلاس کو برہم کرنے کی عملی کوشش کرنے والے صرف سنی علما ہی ہیں۔ تو خدا کا شکر ہے کہ یہ مخالفت اب روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔"

مخالفت کرنے والے علماء سے انہوں نے طنزبھری اپیل کی کہ:

"آپ اسلام پر رحم کریں۔ آپ اس درخت پر تیر نہ ماریں جس پر آپ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔"

اور ان کلمات پر خطبہ کا اختتام کیا:

"حضرات، میں علامہ شبلی کو تمام جلسہ کی طرف سے مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی کوششوں کو خدائے تعالیٰ نے مقبول کیا۔"

کوششیں علامہ شبلی ہی کی نہیں حکیم صاحب کی بھی مقبول ہوئی تھیں۔ قدامت پسند علما کی سرتوڑ مخالفت کے باوجود اجلاس بہت کامیاب رہا اور دلی شہر نے لشتم پشتم نئی قومی سیاست اور نئی اصلاحی تحریکوں سے رشتہ استوار کرلیا۔

حواشی

۱۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد اول۔ ص ۱۰
۲۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد اول۔ ص ۱۱
۳۔ کلیات نثر حالی۔ مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی۔
۴۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد اول۔ ص ۸۸
۵۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد اول۔ ص ۸۸
۶۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد اول ص ۹۰
۷۔ حیات شبلی۔ ص ۴۹۵
۸۔ حیات شبلی۔ ص ۴۹۶
۹۔ بحوالہ مولوی نذیر احمد احوال و آثار، مولفہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۰۔ گنجینہ گوہر صفحہ ۱۲۵

طبی محاذ اور مخالفوں کی یلغار

انگریزی زبان، کوٹ پتلون، کرکٹ، انگریز کے چلائے ہوئے سب سکے چل گئے مگر ڈاکٹر ابھی تک نہیں چل پائے تھے۔ میجر جنرل سر سلیمن نے ہندوستان کے بارے میں اپنے مشاہدات قلمبند کرتے ہوئے یہ بات لکھی تھی کہ "ہندوستان کے لوگ کیا چھوٹے کیا بڑے ہمارے معالجوں سے زیادہ اپنے معالجوں پر بھروسہ رکھتے ہیں .... پڑھا لکھا طبقہ بلکہ سب ہی طبقے یہ کہتے ہیں کہ صاحب ہمیں آپ کے ڈکٹروں کی ضرورت نہیں، صرف سرجنوں کی ضرورت ہے۔" (۱) وہ ۱۸۴۴ء تھا اور اب ۱۹۱۰ء جا رہا تھا۔ صورت حال میں زیادہ فرق نہیں ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت بہت سے اداروں کو تباہ و برباد کر گئی، مگر وید اور حکیم سخت جاں نکلے۔ وہ ہنوز مرجع خلق تھے۔ دُکھی خلقت اپنی دُکھ بیماری کی بپتا لے کر ان کے پاس جاتی اور دوا دارو لے کر واپس آتی۔

وہ زمانہ ۱۸۵۷ء کے ساتھ گزر گیا جب فاضل اطباء طب کے طلبہ کو اپنے گھروں پر درس دیتے تھے اور یوں چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا تھا۔ اَب چراغ سے چراغ دوسرے طور جل رہا تھا۔ درس گاہیں کھل گئی تھیں۔ تکمیل الطب لکھنؤ میں، مدرسہ طبیہ دلی میں۔ پھر وہ طبیب موجود تھے جو اپنی ذات میں ادارہ تھے کہ دُور دُور سے روگی چل کر ان کے مطب میں پہنچتے اور شفایاب ہو کر واپس ہوتے۔ اس گزرے زمانے میں بھی دلی میں کیسا کیسا طبیب موجود تھا۔ ایک طرف حکیم نابینا بیٹھے تھے کہ بنیائی ساری آنکھوں سے اُتر کر اُنگلیوں میں آ گئی تھی۔ دوسری طرف شریف منزل میں حکیم اجمل خان براجمان تھے۔ کہاں کہاں سے چل کر مریض یہاں پہنچتا تھا۔ ہندوستان

کے دُور دراز شہروں سے، کابل سے، سمرقند و بخارا سے۔ غریب امیر سب کو یکساں توجہ سے دیکھنا اور بغیر کسی فیس کے۔ جس مریض کے لیئے پاس رکھا ہوا صندوقچہ کھل گیا اُسے دوا بھی مفت مل گئی۔ ایسے مریض بھی آتے تھے کہ حکیم صاحب کی اس ادا کو نہ سمجھ پاتے تھے اور فیس دینے پر اصرار کرتے تھے ایک سادہ دل دیہاتی مریض نے پگڑی کھول کر اٹھنی نکالی اور حکیم صاحب کے سامنے رکھ دی۔ حکیم صاحب نے کہا کہ عزیز اٹھنی اپنے پاس رکھ، اس کی ضرورت نہیں۔ دیہاتی سمجھا کہ دلی کا بڑا حکیم ہے، زیادہ فیس مانگتا ہے۔ اَنٹی میں سے ایک اٹھنی نکال اور دو اٹھنیاں سامنے رکھ دیں۔ حکیم صاحب نے متانت کے ساتھ دونوں اٹھنیاں واپس کر دیں۔ دیہاتی حیران ہوا اور بولا کہ یہ نیا حکیم دیکھا ہے کہ علاج کرتا ہے مگر کچھ نہیں لیتا۔ ہمارے گاؤں کا حکیم تو جب تک ایک سیر گیہوں نہ لے لے نبض پہ ہاتھ نہیں رکھتا۔ پھر بولا "اچھا حکیم جی میں اچھا ہو جاؤں۔ ایک من گیہوں لے کے آؤں گا اور تمہاری کوٹھی بھر دوں گا۔"

(۲)

ایک کوچوان دمہ سے ہانپتا کانپتا آیا۔ جیب سے پڑیا نکالی۔ بولا کہ :

"حکیم صاحب میرے ساتھ بہت ہو گئی۔ آج میں سنکھیا کھاؤں گا اور اس در پہ جان دیدوں گا۔" حکیم صاحب نے کوچوان کو دیکھا، تامل کیا۔ پھر بولے کہ "سنکھیا کھا کے کیوں مرتا ہے۔ مرنا ہی ہے تو دوا کھا کے مر۔" یہ کہہ کر تین پڑیاں دیں۔ پہلی پڑیا کے ساتھ قے کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ دوسری پڑیا نے قیامت ڈھائی۔ وہ قے ہوئی کہ جان لبوں پر آ گئی۔ تیسری پڑیا نے جان ہی تو نکال دی۔ نبض ساقط ہو گئی۔ ایک سخت قے ہوئی جس کے ساتھ بلغم کا ایک سخت ٹکڑا باہر آیا اور پھر مریض بیہوش ہو گیا۔ مگر جب دو گھنٹے بعد ہوش میں آیا تو دمہ ہمیشہ کے لیئے ختم ہو چکا تھا۔ (۳)

جنم جنم کے روگی دُکھی دُور دُور سے چل کر آتے اور دھرنا دے کر بیٹھ جاتے۔ کوئی فریاد کرتا اور پاؤں پکڑ لیتا۔ کوئی خودکشی کی دھمکی دیتا۔ ہر رنگ کا آدم، کوئی دیس کا کوئی پردیس کا، کوئی ہندو کوئی مسلمان کوئی امیر کبیر کوئی مفلس و قلاش، شریف منزل میں صبح و شام ایک خلقت امنڈتی۔ ایسے حکیم کے ہوتے ہوئے ڈاکٹروں

کا چراغ کیا جلتا۔ اس سے تو یونانی طب ہی کی ساکھ بنی تھی۔ ایک دفعہ وائسرائے کا پرائیوٹ سیکرٹری بھی آ کر اپنی آنکھوں سے مطب کا یہ نقشہ دیکھ گیا۔ جا کر عرض کیا کہ حضور شہر میں ایک حکیم عجب پیدا ہوا ہے کہ دُکھی خلقت کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا ہے۔ روگیوں کا اژدہام رہتا ہے۔ غریب امیر سب کو درد مندی سے دیکھتا ہے اور مفت علاج کرتا ہے۔ سامنے ایک صندوقچہ رکھا ہے۔ اس میں سے پڑیا نکال کر مریض کو پیسہ دھیلا لیئے بغیر دیتا ہے۔ مریض پڑیا پھانکتا ہے اور چاق چوبند ہو جاتا ہے۔

مگر ڈاکٹر بھی سات سمندر پار کر کے آئے تھے۔ یوں تو واپس جانے والے نہیں تھے۔ اُن کے قدم جمانے کے لیئے کچھ نہ کچھ تدبیر تو ہونی تھی۔ آخر ایک تدبیر سوچی گئی۔ بمبئی کی میڈیکل ایسوسی ایشن نے ۲۵ فروری ۱۹۱۰ء کو صوبائی حکومت کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ یونانی اور ویدک طبیں علاج معالجہ کے ناقص اور وحشیانہ طریقے ہیں۔ پس ایک ایسا قانون بنایا جائے کہ طبی حقوق و اختیارات فقط ڈاکٹروں کو حاصل ہوں۔ حکومت جیسے انتظار میں بیٹھی تھی، فوراً ایسا قانون بنانے پر تیار ہو گئی۔

عام وید اور حکیم تو بس مریضوں کا علاج کرنا جانتے تھے۔ انہیں کیا پتہ چلتا تھا کہ زمانہ ان کے ساتھ کیا چال چل گیا۔ نئے قانون سے پیدا ہونے والی خرابی کی تشخیص حکیم صاحب نے کی۔ وہ ندوۃ العلماء کے اجلاس سے فارغ ہوتے ہی مجوزہ قانون کے خلاف سرگرم ہو گئے۔ قومی سیاست میں تو محاذ آرائی بعد میں شروع ہوئی، طب کے محاذ پر معرکہ پہلے ہی پڑ گیا۔ ادھر میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ بنانے کی تیاریاں تھیں، ادھر اس کے خلاف تحریک منظم ہو رہی تھی۔

اس تحریک کے ساتھ وید اور یونانی طبیب برطانوی سامراج کے خلاف مزاحمت کا نشان بن گئے۔ حکیم اور وید جو اب تک ایک دوسرے سے بے تعلق اپنے اپنے طریقے سے مریضوں کا علاج کرتے تھے ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ پنڈت ٹھاکر دت شرما موجد امرت دھارا (لاہور)، حکیم فیروزالدین ایڈیٹر رسالہ "رفیق الاطباء" لاہور، حکیم رفیق احمد بریلوی، منشی مان سنگھ دہلوی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے سب سے پہلے حکیم صاحب کی آواز پر لبیک کہی اور مجوزہ قانون کے خلاف میدان میں اُترے۔ (۴)

حکیم صاحب نے مئی ۱۹۱۰ء میں اعلان کیا کہ ویدوں اور طبیبوں کی ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ جون میں انہیں رامپور جانا پڑا کہ نواب صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ وہاں سے واپس آئے تو ان کی اپنی طبیعت خراب ہو گئی۔ ادھر نواب صاحب رامپور نینی تال جا بیٹھے تھے اور حکیم صاحب کو بلاوے پہ بلاوا بھیج رہے تھے۔ سو وہ بار بار نینی تال گئے اور آئے مگر طبی کانفرنس کی تیاریاں اسی سرگرمی سے جاری تھیں۔

۲۶ اور ۲۷ نومبر ۱۹۱۰ء کی تاریخوں میں طبی کانفرنس منعقد ہوئی۔ راما تھیٹر میں چار سو وید اور حکیم اکٹھے تھے۔ شہر شہر سے آئے تھے اور مجوزہ میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔ مظفر نگر کے رئیس راجہ سکھبیر سنگھ اجلاس کے صدر تھے۔ مجوزہ ایکٹ کے بہت بخیے اُدھیڑے گئے۔ احتجاج کیا گیا کہ دیسی طبوں کے ساتھ کیوں بدسلوکی کی جا رہی ہے اور ڈاکٹروں میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے کہ ویدوں اور حکیموں کو پیچھے ڈھکیل کر انہیں امتیازی حیثیت دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مطالبہ یہ کیا گیا کہ "حکومت ایک ایسا میڈیکل ایکٹ ترتیب دے کہ جو ہر قابل معالج کے لیئے قطع نظر اس سے کہ وہ طب مغرب سے متعلق ہے یا طب مشرق کا حامل یکساں طور پر مفید ثابت ہو۔"

اس میڈیکل ایکٹ کے ساتھ آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کا آغاز ہوا۔ یہیں سے حکیم صاحب کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مدرسہ طبیہ میں یونانی کے ساتھ ویدک کی تعلیم کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ اخراجات کا اضافہ پیش نظر تھا جس کے لیئے اسی سال ہندوستانی دواخانے کی بنیاد رکھی گئی۔

آغاز خوب تھا۔ اتحاد کا کیا خوب مظاہرہ ہوا۔ مگر کانفرنس کے ختم ہوتے ہی اختلافات شروع ہو گئے۔ لکھنؤ کے طبیب اور مزاج کے نکلے۔ اس شہر کی ناک حکیم عبدالعزیز تھے۔ انہیں پہلے ہی اس کانفرنس کے بارے میں تامل تھا۔ خود کانفرنس میں نہیں آئے۔ جب بہت اصرار کیا گیا تو اپنے صاحبزادے حکیم عبدالرشید کو بھیج دیا۔ بس کانفرنس کے ختم ہوتے ہی دلی اور لکھنؤ کا پرانا قضیہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب نہ وہ دلی تھی نہ وہ لکھنؤ تھا مگر پرانی لاگ ڈاٹ برقرار تھی۔ شوشہ چھوڑا گیا کہ یہ سارا میلہ اس لیئے لگا

ہے کہ دلی والے لکھنؤ پر برتری حاصل کر لیں۔ ادھر ویدا ینٹھ گئے کہ صاحب ہم تو برائے بیت ہیں، یہ میلہ تو حکیموں کا ہے۔ حکیم صاحب کبھی لکھنؤ والوں کو مناتے ہیں کہیں ویدوں کو گلے لگاتے ہیں۔ وید تو خیر من گئے مگر لکھنؤ والے اپنی بات پر جمے رہے۔ حکیم صاحب لکھنؤ پہنچے اور تجویز پیش کی کہ اچھا آپ بڑے بن جائیے۔ طبی کانفرنس کا اگلا اجلاس لکھنؤ میں منعقد کرتے ہیں۔ مگر لکھنؤ والوں نے اس کی بھی مخالفت کی۔

حکیم عبدالعزیز کو دو اندیشے بیک وقت ستا رہے تھے۔ ایک اندیشہ یہ تھا کہ اس طبی تحریک کی آڑ میں ویدک، یونانی سے آگے نکل جائے گی۔ دوسرا اندیشہ یہ تھا کہ دلی کو لکھنؤ پر برتری حاصل ہو جائے گی۔ ان کی طرف سے لکھنؤ میں اجلاس کے انعقاد کی تجویز کی پرزور مخالفت ہوئی۔ بہرحال شہر میں بھلے لوگ بھی تھے۔ ایک حکیم عبدالولی تھے جو اس تجویز کے حق میں تھے۔ حامیوں کے زور پر اجلاس کے لیئے استقبالیہ کمیٹی قائم کر دی گئی۔ خان بہادر حکیم نظیر حسن خاں اور پنڈت گدادھر وید سیکرٹری منتخب ہوئے۔ حکیم عبدالولی نے اس کی حمایت میں ایک انجمن حمایت الطب قائم کر ڈالی جس میں شہر کے اور ممتاز اطباء شریک ہوئے مگر حکیم عبدالعزیز شریک نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد انجمن طبیہ کے نام سے الگ کھڑی کی۔

طبی کانفرنس کے حامی گروہ نے ایک جلسہ کرنے کی ٹھانی۔ اعلان ہوا کہ جلسہ سے مولانا شبلی خطاب فرمائیں گے۔ مخالف گروہ بھی لنگر لنگوٹے کس کے میدان میں کود پڑا۔ قیصر باغ کی بارہ دری میں جلسہ کا اہتمام ہوا۔ حکیم عبدالولی، حکیم نظیر حسن خاں، حکیم منے آغا اور پنڈت گدادھروید جیسے شرفائے شہر اکٹھے ہوئے۔ اُدھر حکیم عبدالعزیز کی طرف سے لچوں لفنگوں کی ایک پلٹن جلسہ گاہ میں آن دھمکی۔ اس پلٹن نے صدر کے انتخاب پر جھگڑا ڈال دیا۔ منتظمین نے لاکھ کہا کہ تم باہر والے ہو۔ تمہیں کیا کہ ہم کسے صدر بناتے ہیں۔ لیکن کسی میں شرافت ہوتی تو وہ سنتا۔ جھگڑا اتنا بڑھا کہ لپاڈگی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر حکیم عبدالولی نے جلسہ کے ختم کا اعلان کر دیا۔

ادھر دلی میں بھی ایک حکیم مخالفت پر کمربستہ تھے۔ یہ حکیم رضی الدین خاں

تھے جو اپنے آپ کو بہت بڑا حکیم سمجھتے تھے اور انگریزوں کی انہیں سرپرستی حاصل تھی۔ خیر سے ایک اخبار کی کمک بھی انہیں مل گئی۔ یہ اخبار "کرزن گزٹ" تھا کہ ایڈیٹر اس کے مرزا حیرت تھے۔ مرزا حیرت کیا خوب آدمی تھے۔ گورا رنگ، غلافی آنکھیں، سفید لمبی ڈاڑھی۔ دلی میں سب سے پہلے اُنھوں نے چھاپے کی مشین لگائی تھی۔ مشین لگائی اور "کرزن گزٹ" جاری کیا۔ جیسے مرزا حیرت ویسا اُن کا کرزن گزٹ۔ ہنگامہ پرور آدمی تھے۔ اُن کے پرچے کی رونق بھی ایک ہنگامے پہ موقوف تھی۔ آج ایک سے لڑے کل دوسرے سے بھڑ گئے۔ جس کے بارے میں جو جی چاہا لکھ دیا۔ مولانا حالی، مولانا شبلی اور خواجہ حسن نظامی کو نہ چھوڑا، پھر کسے چھوڑتے۔ پتہ چلا کہ مولانا شبلی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھ رہے ہیں بس ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔ یہ ثابت کرنے پر تل گئے کہ مولانا شبلی قرآن اور حدیث سے نابلد ہیں۔ "دینیات میں آپ کا درجہ ایک طفل مکتب سے بھی زیادہ نہیں ہے۔" (۵) امام جامع مسجد کو بخارا کا قصائی لکھ دیا۔ نواب فیض احمد خاں کو واجد علی شاہ کا طبلہ نواز ٹھہرایا۔ ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی سے اُلجھ پڑے۔ بس اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا۔ خواجہ حسن نظامی نے ان پر ایک بدمعاش چھوڑ دیا۔ مرزا صاحب اپنی کتابوں کی دکان پر بیٹھے تھے۔ وہ بدمعاش وہاں پہنچا اور ایسا جوتا کھینچ کر مارا کہ مرزا حیرت کا منہ پھر گیا۔ (۶) 'کرزن گزٹ' یہاں آ کر فیل ہو گیا۔

مرزا حیرت نے ایک مرتبہ بحث میں ایسا تاؤ کھایا کہ واقعہ کربلا ہی سے انکار کر بیٹھے۔ اس واقعہ کو فرضی ثابت کرنے کی کوشش میں پوری کتاب لکھ ڈالی۔ مگر اس زمانے میں بھی جمعہ کے جمعہ امام کی شہادت پر تقریر کرتے تھے اور ایسی تقریر کرتے تھے کہ ایک خلقت سننے آتی تھی۔ لوگوں کی روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ (۷) اسی انکارِ شہادت کے زمانے میں کہیں ایک دفعہ مرزا صاحب بیمار پڑ گئے۔ حکیم صاحب انہیں دیکھنے گئے۔ وہاں یہ ذکر بھی نکل آیا۔ حکیم صاحب نے ان سے تھوڑی بحث کی اور ملامت کی کہ آلِ رسول ؐ سے یہ گستاخی آپ کو زیب نہیں دیتی۔ "اسی دن سے مرزا حکیم صاحب کی مخالفت میں آستین چڑھا کر تیار ہو گئے۔" (۸)

حکیم رضی الدین تو تھے ہی مرزا حیرت بھی ساتھ مل گئے۔ یک نہ شد دو شد

حکیم صاحب کے خلاف پوری مہم شروع ہو گئی۔ حکیم صاحب نے جس کام میں ہاتھ ڈالا بس وہ کام اُن کی تنقید کا ہدف بن گیا۔ حکیم صاحب نے طبی کانفرنس قائم کی تو یہ طبی کانفرنس کے مخالف ہو گئے۔ حکیم صاحب نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک میں حصہ لیا تو یہ بزرگ اس تحریک کے پیچھے پڑ گئے۔ اس تحریک کے سلسلہ میں حکیم صاحب نے دلی میں ایک جلسہ کا انتظام کیا۔ دونوں بزرگوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ جلسہ تو خیر ۵ مارچ ۱۹۱۰ء کو ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا۔ نواب وقارالملک نے صدارت کی۔

انہیں دنوں حکیم صاحب کو لندن کا سفر درپیش ہوا۔ 'کرزن گزٹ' نے اس سفر کو بھی ایک سکنڈل بنا دیا۔ قصہ یہ تھا کہ لندن میں جشن تاجپوشی کی تیاریاں تھیں۔ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم دنیا سے سدھار چکے تھے۔ اب تاج جارج پنجم کے سر پہ سجنے کو تھا۔ نواب صاحب رامپور نے جشن میں شرکت کی غرض سے عزم سفر باندھا اور حکیم صاحب کو ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ حکیم صاحب تیار ہو گئے۔ مگر نواب صاحب جاتے جاتے رُک گئے۔ حکیم صاحب کا عزم سفر برقرار رہا۔

'کرزن گزٹ' یہ خبر لے اُڑا۔ خوب خاکہ اُڑایا کہ لیجئے حکیم جی اب لندن جائیں گے اور دربار میں حاضری دیں گے۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ مگر حکیم صاحب کی اپنی وضع تھی۔ 'کرزن گزٹ' کا جواب خاموشی سے دیتے تھے۔ اس موقعہ پر بھی نہ جواب میں کوئی وضاحتی بیان جاری کیا، نہ کسی الزام کی تردید کی۔ رخصت ہوتے وقت یاروں کو خدا حافظ کہا۔ رخصتی اعلان خدا حافظ ہی کے عنوان سے اخباروں میں شائع ہوا:

"میں چار مہینے کے لیئے ولایت جا رہا ہوں۔ ۱۰ مئی ۱۹۱۱ء کو دہلی سے روانہ ہو کر رامپور ہوتا ہوا۔ ۲۰ مئی کو جہاز ایجپٹ پر انگلستان روانہ ہو جاؤں گا۔"

سفر کا مدعا حکیم صاحب نے صحت کی خاطر تبدیلی آب و ہوا بتایا۔ ساتھ ہی یہ مقصد بھی پیش نظر بتایا کہ یورپ کی طبی ترقیوں کا مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے تاکہ واپس آکر طب یونانی کے فروغ کے لیئے کچھ کام کیا جا سکے۔

اعلان تو یہی کیا تھا کہ دلی سے روانگی ۱۰ مئی کو ہو گی مگر انہیں دنوں آنکھیں دکھنے کو آگئیں۔ سفر پانچ دن کے لیئے ملتوی ہو گیا۔ ۱۵ کو دلی سے روانہ ہوئے ۳۰ مئی کو 'ایجپٹ' پر سوار ہو گئے۔

اس سفر پر مرزا حیرت بجا حیران ہوئے اور 'کرزن گزٹ' نے صحیح شور مچایا۔ لندن ان دنوں ہندوستان کی خلقت کے لیئے ایک نیا شہر طلسم تھا۔ اس خلقت نے طلسماتی شہروں کے بہت قصے سنے تھے۔ مگر یہ طلسماتی شہر قصے کہانیاں تھے۔ اس خلقت نے یکایک ایک نئے شہر طلسم کی خبر پائی تھی کہ سچ مچ موجود تھا۔ کوئی کوئی قسمت کا دھنی سات سمندر پار کر کے اس نئے افسانوی شہر میں پہنچتا۔ حیران ہوتا کہ یا الٰہی یہاں زمین و آسمان کس رنگ کے ہیں اور یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں۔ ہندوستان کا مسافر لندن پہنچ کر الف لیلہ کا ابوالحسن بن جاتا۔ دیس واپس پہنچتا تو سندباد جہازی سے بڑھ کر افسانے سناتا۔ ہندوستان میں اب ایک نئی الف لیلہ جنم لے رہی تھی۔

لندن میں جشن تاجپوشی کی دھوم دھام تھی۔ ویسٹ منسٹر ایبے میں دربار آراستہ تھا۔ ملک معظم جارج پنجم تخت پر رونق افروز تھے۔ حکیم صاحب نے دربار دیکھا دربار والے دیکھے۔ آنکھوں میں چکا چوند ضرور تھی۔ مگر جب دربار سے گزر کر ہسپتال میں پہنچے تو واقعی الف لیلہ کا ابوالحسن بن گئے۔ دلی کا حکیم یورپ میں بستی بستی گھوم کر ہسپتالوں اور طبی تجربہ گاہوں کو دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ یاالٰہی شفاخانے ایسے ہوتے ہیں اور طبی تجربہ گاہوں کا ایسا نقشہ بھی ہوتا ہے۔ پیرس کا شفاخانہ واہ واہ سبحان اللہ، اپنی جگہ ایک پوری بستی۔ جتنے قسم کے بیمار اتنے ہی وارڈ، ہر وارڈ گویا ایک حویلی۔ برلن کا شفاخانہ عجب ثم العجب۔ بیمار کو اگر اپنے وارڈ سے نکلنا اور اپنے کمرے سے منتقل ہونا ہو تو کیا مجال کہ قدم زمین پہ لگیں۔ ہاتھ گاڑی بستر کے برابر لگ جاتی اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی۔ تمام رنگ رنگ کے کوئی گرم، کوئی ٹھنڈا، کوئی بھاپ والا کوئی بجلی والا۔ ایک عمارت میں کلیں عجیب نظر آئیں۔ مشینیں دُخانی طاقت سے چلتی ہیں۔ ایک مشین بالکل اونٹ کی مثال۔ بیمار ایک کاٹھی کے ذریعہ اس پر بیٹھ جاتا۔ مشین حرکت کرتی تو ایسے لگتا کہ وہ اُونٹ پر سفر کر رہا ہے۔ حکیم صاحب متحیر ہوئے۔ پوچھا کہ اے صاحبو یہ کل کس قماش کی ہے، کیا اس کا مقصود

ہے۔ جواب ملا کہ اے اجنبی کیا تجھے نہیں معلوم کہ اونٹ کی سواری معدے اور جگر کا علاج ہے۔ یہ مشین اسی مثال پر معدے اور جگر کے مریضوں کے لیئے بنائی گئی ہے۔

لندن دیکھا، لندن کا دربار دیکھا، اور لندن کا چیرنگ ہسپتال دیکھا۔ وہاں کیا دیکھا کہ دِلی سے گیا ہوا ایک نوجوان ڈاکٹری کرتا ہے نام تھا مختار احمد انصاری، بڑے بھائی دلی میں حکیم تھے اور حکیم نابینا کہلاتے تھے۔ چھوٹے بھائی لندن پہنچے اور ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان دنوں لندن کے چیرنگ کراس ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے وطن سے آئے ہوئے حکیم کی بہت آؤ بھگت کی۔ ہسپتال کی سیر کرائی، وہاں کی ایک ایک چیز دکھائی۔ اس ہسپتال میں سرجن کرنل سٹینگلے بائلڈ تھے کہ سرجری اور تشخیص میں طاق تھے اور ملک معظم کے انریری سرجن تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے کہا، اس فخر روزگار ڈاکٹر سے بھی مل لو۔ سو ملاقات ہوئی۔ مگر اس ملاقات میں عجب معرکہ پیش آیا کہ اس کی خبر دلی تک پہنچی اور داستان بن گئی اور پھر زمانے کے ساتھ یہ داستان ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوئی۔ وادی (۹) نے ننھے پوتے (۱۰) کو اپنے گھٹنے سے لگا کر بٹھایا اور کہانی سناتے سناتے ایک نئی کہانی شروع کر دی۔ "بیٹے تمہارے دادا بہت بڑے حکیم تھے۔ ولایت والے بھی ان کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ولایت کے ڈاکٹر سے ان کی شرط لگ گئی اور تمہارے دادا شرط جیت گئے۔"

"دادا جان نے شرط میں کیا جیتا۔" ننھے پوتے نے حیران ہو کر پوچھا۔ دادی اماں بولیں: "وہ ڈاکٹر بہت بڑا ڈاکٹر تھا۔ بادشاہ کا علاج کرتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے اس سے تمہارے دادا کی ملاقات کرائی اور اسے بتایا کہ ہمارے ہندوستان میں حکیم لوگ مریض کی نبض دیکھ کر اس کا سارا حال معلوم کر لیتے ہیں۔ یہ بات سن کے وہ ڈاکٹر ہنسا اور بولا کہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ مریض موجود ہے۔ ابھی امتحان کر لیتے ہیں، اتفاق کی بات کہ اسی روز ڈاکٹر بائلڈ ایک آپریشن کرنے والے تھے۔ تمہارے دادا سے اس ڈاکٹر نے کہا کہ اس مریض کی نبض دیکھ کر بتاؤ کہ اسے مرض کیا ہے۔ تمہارے دادا نے مریض کی نبض دیکھی، آنکھوں کی رنگت دیکھی، پیٹ کو دبا کے دیکھا۔ پھر کہا کہ کرنل صاحب آپ کے مریض کے فم معدہ پر پرانا ورم ہے جو سخت ہو گیا ہے اس ورم کی وجہ سے فم معدہ ایک طرف کو جھک گیا ہے۔ کرنل بائلڈ یہ تشخیص سن کر

مسکرایا اور بولا کہ حکیم صاحب، اصل میں اس مریض کے پتہ پر ورم ہے اور پتہ ناکارہ ہو چکا ہے۔ یہ سن کر ڈاکٹر انصاری کے تو منہ پہ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بیچارے دِل ہی دل میں شرمندہ ہو رہے تھے کہ میں نے اچھی ملاقات کرائی۔ اپنے وطن کے نامی گرامی حکیم کی کرکری ہو جائے گی اور یونانی طب کی بھی عزت خاک میں مل جائے گی۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ادھر وہ کرنل بھی اپنے زعم میں تھا۔ بولا کہ،میں ابھی آپریشن کر رہا ہوں۔ پتہ چل جائے گا کہ مشرق کتنے پانی میں ہے۔ یہ کہہ کے کرنل آپریشن کرنے کے لیئے تیار ہوا۔ تمہارے دادا باہر برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے۔ آپریشن میں پون گھنٹہ لگا۔ پونے گھنٹے تک ڈاکٹر انصاری کا اُوپر کا دم اُوپر، نیچے کا دم نیچے۔ آخر بائلڈ باہر نکل کے آیا اور ہنس کے کہنے لگا کہ حکیم صاحب ہم آپ کو مان گئے۔ آپ کی تشخیص صحیح نکلی۔ اس خوشی میں آج رات کو ہماری طرف سے آپ کی دعوت ہے۔ اس کے بعد تمہارے دادا اور کرنل بائلڈ میں بہت دوستی ہو گئی۔ ڈاکٹر انصاری پھولے نہ سماتے تھے کہ ان کے وطن کی عزت بڑھی اور یونانی طب سرخرو ہوئی۔"

ہندوستان کا مسیحا لندن سے سرخرو واپس ہوا۔ یورپ کے دیسوں کی سیر کرتا ہوا قسطنطینہ پہنچا۔ یہاں آ کر دیکھا کہ نواب بھوپال کی بیگم نواب سلطان جہاں بیگم آئی ہوئی ہیں۔ بیگم صاحبہ نے حکیم صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ منصوبہ یہ بنا کہ عراق، شام اور عرب کا سفر اکٹھے کیا جائے۔ مگر دفعتاً دلی سے تار آیا کہ گھر میں چوری ہو گئی۔ اس تار نے سفر عرب کے منصوبے میں کھنڈت ڈال دی۔ حکیم صاحب نے بیگم بھوپال سے معذرت کی اور دِلی کی راہ لی۔

حکیم صاحب اگست ۱۹۱۱ء میں واپس دلی پہنچے۔ حکیم صاحب لندن سے کیا آئے یہاں کا رنگ ہی بدلا ہوا پایا۔ مخالفت کا بازار دلی سے لکھنؤ تک گرم تھا۔ طبی کانفرنس اس برس لکھنؤ میں ہونی ٹھہری تھی۔ لکھنؤ کا قدامت پسند گروہ اس پر سخت برہم تھا۔ اس گروہ کو اس کانفرنس سے جدت کی بو آ رہی تھی۔ اُن کی دانست میں یہ کیا کم جدت بلکہ بدعت تھی کہ ویدوں اور حکیموں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ پھر وہ یہ بھی کہتے پھر رہے تھے کہ یہ سارا ڈھونگ اس لیئے رچایا جا رہا ہے کہ دلی کو لکھنؤ پر برتری حاصل ہو جائے۔ یوں دلی اور لکھنؤ کی پرانی رقابت بروئے کار لائی گئی۔ طبی

کانفرنس کامیاب ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی مگر حکیم صاحب بھی اپنی دُھن کے پکے تھے۔ اُنہوں نے مخالفوں سے افہام و تفہیم کی بہت کوشش کی۔ اس میں تو وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ مگر کانفرنس کو بہرحال انہوں نے کامیاب بنا لیا۔

طبی کانفرنس لکھنؤ میں ۱۲ سے ۱۴ نومبر ۱۹۱۱ء تک کی تاریخوں میں منعقد ہوئی۔ حکیم عبدالعزیز کہ مخالفوں کے سرغنہ تھے کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے۔ وہ اپنی پارٹی سمیت کانفرنس سے روٹھے رہے۔ مگر باقی سب حکیم، وید اور معززین شہر کانفرنس میں شریک ہوئے۔ حکیم صاحب نے یہاں اپنے سفرِ یورپ کے مشاہدات سنائے اور لکھنؤ کے ویدوں اور حکیموں نے لندن، پیرس اور برلن کے شفاخانوں کے حالات اس انداز سے سنے جیسے وہ سندباد جہازی سے اجنبی جزیروں کے محیرالعقول قصے سن رہے ہوں۔ اب لکھنؤ اُن کی مٹھی میں تھا۔ اُنہوں نے مخالفوں کا کیا خوب شکریہ ادا کیا۔ کہا کہ "واقعی بعض مخالف احباب اور اعزا نے اپنا قیمتی وقت اس مخالفت میں صرف کیا ہے اور ایک حد تک ذاتی روپیہ صرف کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ ایسی حالت میں سخت ناانصافی ہو گی اگر ہم ان حضرات کے شکر گزار اور ممنون نہ ہوں۔ کیا یہ بات طبی کانفرنس (۱۱) کے حق میں بہتر نہیں ہے یا نہیں ہوئی کہ محض اس مخالفت کے طفیل میں اس کے ساتھ لوگوں کی دلچسپیاں زیادہ ہو گئیں۔ اور اس کی شہرت کی رفتار ایک ہی سال میں چار برس کے برابر ہو گئی۔"

اس اجلاس کے کچھ دنوں کے بعد حکومت ہند نے طب یونانی اور ویدک کے خلاف جو ایکٹ کا مسودہ تیار کیا تھا منسوخ کر دیا۔

حواشی

۱۔ ریمبلز اینڈ ری کلیکشنز صفحہ ۱۰۰
۲۔ تذکرہ مسیح الملک صفحہ ۹۵
۳۔ حیات اجمل مرتبہ حکیم رشید احمد خاں صفحہ ۱۴۳
۴۔ حیات اجمل مرتبہ حکیم رشید احمد صفحہ ۱۱۸

۵- کرزن گزٹ- مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۴
۶- ساقی شاہد احمد دہلوی نمبر ۴۱۱
۷- میرے زمانے کی دلی- صفحہ ۱۱۸
۸- حیات اجمل، مرتبہ حکیم رشید احمد خاں- صفحہ ۸۴
۹- اجمل اعظم کی اہلیہ اختر جہاں بیگم
۱۰- حکیم محمد نبی خاں جمال سویدا
۱۱- یہ طبی کانفرنس آج بھی پاکستان طبی کانفرنس کے نام سے قائم ہے- یہ عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ چھ برس سے اس کانفرنس کے صدر بھی حکیم اجمل خاں کے پوتے ہیں-

اِندر پرستھ میں مکھی

شہنشاہ جارج پنجم کی آمد آمد تھی۔ جشن تاجپوشی کی تیاریاں تھیں۔ راجوں مہاراجوں کے کیمپ لگ رہے تھے، شامیانے تن رہے تھے۔ کیمپ سب سے بڑا نظام حیدر آباد کا، سب سے خوبصورت راجہ کشمیر کا۔ مگر سب سے بڑھ چڑھ کر شاہی شامیانہ تھا کہ وہاں بادشاہ سلامت کو رونق افروز ہونا تھا اور راجوں مہاراجوں کو ان کے حضور پیش ہونا تھا۔ نواب صاحب بہاولپور نے کس عقیدت سے یہ شامیانہ تیار کرا کے بھیجا تھا، مگر قسمت کی بات کہ اُسے آگ لگ گئی۔ (۱) جھٹ پٹ دوسرا شامیانہ کھڑا کر دیا گیا۔

ادھر دلی میں یہ اہتمام تھے، اُدھر لندن سے خلقت نے اپنے بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ کو لاکھوں دُعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ بادشاہ سلامت ملکہ معظمہ کے ساتھ ۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو بمبئی کے ساحل پر اترے۔ ۷ دسمبر کو بصد کروفر دلی میں ورود کیا۔ ۱۲ دسمبر کو دھوم دھام کے ساتھ دربار منعقد کیا۔ مژدہ سنایا کہ اب دلی دارالسلطنت بنے گی۔ ساتھ ہی تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کی نوید بھی سنا دی۔

یہ ۱۹۱۱ء تھا۔ ۱۸۵۷ء بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ مگر وہ داغ پھر تازہ ہوا۔ سکھ بینڈ کے ساتھ آٹھ سو بوڑھوں کا ایک رسالہ آہستہ آہستہ مارچ کرتا ہوا بادشاہ سلامت کے سامنے آیا۔ یہ وہ سکھ اور دوسرے سپاہی تھے جن کے ہاتھوں دلی خون میں نہائی تھی۔ اب وہ بوڑھے پھونس ہو چکے تھے مگر ان کے واسطے سے ۱۸۵۷ء کی فتح کی یاد تازہ کی جارہی تھی۔ اعلان ہوا کہ غدر کے ہیرو حضورِ شاہ میں آئے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے اُن سے ہاتھ ملایا اور ہمکلام ہوئے۔

فاتحین کو اپنی فتح یاد تھی۔ شکست کھانے والے اپنی شکست کو بھول چکے تھے۔ مبارک سلامت کا غل تھا۔ اسمٰعیل میرٹھی کہہ رہے تھے۔

ہو مبارک تجھ کو اے ہندوستان
جارج پنجم کا یہ عہد زرنگار

اور پنڈت برج موہن کیفی و تاتر یہ دُعا کر رہے تھے۔

جارج پنجم رہیں تاحشر سلامت یا رب
خرم وشاد رہیں راج رہے ان کا اٹل

حکیم صاحب لندن کے دربار تاجپوشی میں شریک ہو چکے تھے۔ اب وہ دلی کے دربار میں شریک ہوئے۔ شہنشاہ جارج پنجم سے شرف ملاقات بھی حاصل کر لیا۔ اس زمانے میں اس سے بڑا شرف اور کیا ہو سکتا تھا۔ اخباروں میں خبر چھپ گئی۔ حکیم صاحب کی عزت بڑھ گئی۔ حکیم صاحب نے دربار کی تقریبات کے انتظامات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دلی کے پایہ تخت بننے پر مسرت کا اظہار کیا۔

۱۲ دسمبر کو دلی کے پائیہ تخت بننے کا اعلان ہوا۔ ۱۵ دسمبر کو بادشاہ سلامت نے نئی دلی کا سنگ بنیاد رکھا۔ بادشاہ سلامت تو چلے گئے، ادھر شہر کا نقشہ بدلنے لگا۔ شہر کا نقشہ زمانے کے ساتھ پہلے ہی بدل چکا تھا۔ لارڈ کرزن کے دربار سے آج کے شاہی دربار تک کیا کچھ بدل گیا تھا۔ لارڈ کرزن کے دربار کے موقعہ پر جلوس کی دھوم دھام ہاتھیوں سے تھی۔ اس رعایت سے اس دربار کو دلی والوں نے ہاتھیوں کا دربار کہنا شروع کر دیا۔ جارج پنجم کے دربار کے موقعہ پر ہاتھی غائب تھے۔ موٹروں کا زورشور تھا۔ سو یہ دربار موٹروں کا دربار مشہور ہو گیا۔

موٹروں کے دربار کے بعد سے دلی موٹر سے مانوس ہوتی چلی گئی۔ پرانی سواریاں معدوم ہو رہی تھیں۔ نئی سواریاں زور پکڑ رہی تھیں۔ ہاتھی ہی رخصت نہیں ہوا، رتھ بھی غائب ہو گئی۔ پالکی پس منظر میں چلی گئی۔ اب دِلی کی سڑکوں پر موٹریں فراٹے بھر رہی تھیں۔ عام لوگ ٹریموے کی طرف لپک رہے تھے۔ بائیسکل بھی خوب چل پڑی تھی۔ اکہ کو پیچھے دھکیل کر تانگہ آگے آ گیا تھا۔

سواری ہی نہیں روشنی بھی زمانے کی تبدیلی کا پتہ دے رہی تھی۔ کرزن دربار

کے دنوں میں گیس کی روشنی سے رستے منور ہوئے تھے۔ اب کے دربار کے ساتھ بجلی کی روشنی سے شاہراہیں جگمگ ہوئیں۔ پھر بجلی کی روشنی پھیلتی ہی چلی گئی۔ لوگوں کا چلن بھی بدلتا چلا جا رہا تھا۔ لباس میں اب کتنا فرق آ گیا تھا۔ سر سے پگڑی غائب، چوگوشیہ ٹوپی ندارد۔ فیلٹ کیپ ہندوؤں کے سروں پر، ترکی ٹوپی مسلمانوں کے سروں پر۔ ترکی ٹوپی مسلمانوں کے نئے شعور کی علامت بن کر دلی میں رچ بس چکی تھی۔ مگر علی گڑھ سے ہو کر آنے والے صرف ترکی ٹوپی ہی نہیں لائے تھے، کرکٹ بھی ساتھ لائے تھے۔ دلی کے اکھاڑوں پر زوال آیا ہوا تھا۔ شرفاء کے بیٹے پوتے اکھاڑوں سے کرکٹ کی فیلڈ کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔

شریف منزل میں نہ کرکٹ راہ پا سکی نہ ترکی ٹوپی کو داخلہ ملا۔ حکیم محمود خاں کے زمانے میں اس گھرانے کی جو سج دھج قائم ہوئی تھی اس میں آگے چل کر اجمل خان نے تھوڑی سی ترمیم ضرور کی، انگرکھے نے سنور کر اچکن کی وضع لے لی اور چوگوشیہ ٹوپی تھوڑا بدل کر کشتی نما ٹوپی بن گئی مگر یہ بعد کی بات ہے۔ ان دنوں تو ان کی سج دھج بھی وہی تھی جو سب شریف خانیوں کی تھی، برمیں انگرکھا، پیر میں سلیم شاہی جوتی، سر پہ عمامہ۔ اور طور یہ تھا کہ صبح چار بجے اُٹھنا، تاروں کی چھاؤں میں مسجد جانا، فریضہ سحری ادا کرنا، قرآن کی تلاوت کرنا۔ پھر واپس آ کر مطب میں بیٹھنا۔ گرمیوں میں صبح کے وقت ایک گلاس ستو پی لیتے تھے۔ اسے صبح کا ناشتہ سمجھ لیجئے۔ جاڑوں میں ناشتہ نام کی کوئی چیز معمول میں داخل نہیں تھی۔ مطب میں نہار منہ جا کر بیٹھنا، ساڑھے پانچ بجے سے ساڑھے دس بجے تک بیٹھے رہنا۔ اس کے بعد کھانا کھانا۔ شریف منزل میں ساڑھے دس بجے دسترخوان بچھتا اور دِن کا کھانا کھایا جاتا اور کھانے میں کیا ہوتا، قلیہ۔ کوئی ترکاری وغیرہ۔ رات کے دسترخوان پر دال کا ہونا ضروری تھا کہ حکیم واصل خاں اول کے وقت سے یہ ریت چلی آ رہی تھی۔ رات کے کھانے میں دال قیمہ کوفتے یا شامی کباب۔ روٹیاں پتلی پتلی ورق جیسی۔ موٹی روٹی حکیم صاحب کو مطلق قبول نہیں تھی۔ جب نیا خانساماں رکھا جاتا تو خاص طور سے پوچھا جاتا کہ سیر آٹے میں کتنی روٹیاں پکا لیتے ہو۔ جو خانساماں سیر میں اسی روٹی پکانے کی حامی بھرتا اُسے ملازم رکھا جاتا۔ دسترخوان وسیع تھا۔ مہمان جو دن رات اُترتے رہتے تھے۔

مطب کا نقشہ یہ تھا کہ حکیم صاحب گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ پر مریض، دوسرے ہاتھ پر نسخہ لکھنے والے (شاگرد) یہ نسخہ لکھنے والے پانچ سات کی تعداد میں ہوتے۔ جو یہاں آ کر نسخہ لکھنے کی تربیت حاصل کرتے۔ اس وقت وہ نسخہ لکھتے نظر آتے۔ مطب کے بعد حکیم صاحب گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر انہیں سمجھاتے کہ کونسا نسخہ کیوں لکھا گیا۔ مطب میں حکیم صاحب نے اپنی نشست بیچ کے در میں رکھی تھی اس مقصد سے کہ مریضاؤں کی ڈولیاں در کے قریب رکھی جا سکیں اور بیٹھے بیٹھے ان کی نبض دیکھی جا سکے۔

مطب الگ، دیوان خانہ الگ۔ ویسے دیوان خانے اب دلی میں گنتی کے رہ گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دِلی میں ایک سے ایک بڑھ کر دیوان خانہ تھا۔ مگر اب انہیں انگلیوں پر گن لو۔ ایک دیوان خانہ نواب فیض احمد خاں کا، ایک دیوان خانہ لالہ سری رام کا، ایک دیوان خانہ لالہ پارس داس خزانچی کا، ایک دیوان خانہ حکیم اجمل خان کا۔ باقی تو سب بیٹھکیں تھیں۔ حکیم صاحب کا دیوان خانہ ایک دالان در دالان تھا۔ در و دیوار پر سفیدی پھری ہوئی، گرداگرد روغنی حاشیہ، چھت میں جھاڑ فانوس لٹکے ہوئے، دیواروں پر کچھ بزرگوں کی قلمی تصاویر، کچھ طغرے کچھ کتبے، فرش پر دری، دری پر چاندنی، درمیان میں ایرانی قالین بچھا ہوا۔ دیواروں کے برابر برابر گاؤ تکیے رکھے ہوئے، ان پر پھُول دار غلاف چڑھے ہوئے، حقہ پاندان، پیک دان قرینے سے دھرے ہوئے۔ دہلیز میں پائے دانوں کی جگہ مرگ چھالیں، دروازوں پر کھاروے کے پردے۔ (۲)

دیوان خانے میں دن کی محفل اور طرح کی، رات کی محفل اور طرح کی۔ دن کے اوقات میں یہاں قومی رہنما آتے جاتے نظر آتے۔ ان دنوں یہ سب رہنما مسلمان ہوتے۔ حکیم صاحب ابھی کانگریس سے دُور تھے۔ ہندو رہنماؤں سے ان کا ربط ضبط ابھی نہیں ہوا تھا۔ دن کی رخصتی کے ساتھ قومی شخصیتیں رخصت۔ ادھر گھڑی نے آٹھ بجائے اور اُدھر ایک نئی محفل آراستہ ہونی شروع ہوئی۔ نواب فیض احمد خان، سید احمد بخاری امام جامع مسجد، نواب سراج الدین احمد خان سائل، نواب شجاع الدین احمد خان تاباں، نواب امین الدین خان والئی لوہارو، لالہ جگل کشور وکیل، لالہ ہزاری مل جوہری، کیا کیا صاحب ذوق لوگ تھے کہ یہاں اکٹھے ہوتے۔

قومی اور سیاسی مسائل کی بساط دن کی محفل کے ساتھ لپیٹی گئی۔ اب محفل شب آراستہ ہے۔ نئے شرکائے محفل نئے مشاغل۔ کبھی کوئی علمی بحث چھڑ گئی، کبھی شعر و ادب پر گفتگو شروع ہو گئی۔ کبھی موسیقی کبھی داستان۔ کسی کسی شب میر باقر علی داستان گو کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا۔ میر باقر علی کیا خوب بزرگ تھے دُبلے پتلے دھان پان، درمیانہ قد، چھوٹی سفید ڈاڑھی۔ دلی کے آخری داستان گو تھے۔ اس فن کا عروج اور زوال دونوں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ عروج کے زمانے میں رؤسا و اُمراء کی محفلوں میں بلائے جاتے۔ ٹھسے کے ساتھ جاتے۔ داستان سناتے اور دولت سمیٹ کر لاتے۔ پھر وہ زمانہ بھی دیکھا کہ داستان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا۔ میر صاحب نے اس ناقدری کے زمانے میں بھی اپنی آن قائم رکھی۔ اُجلے لباس میں ملبوس، بااخلاق، وضعدار۔ پیٹ پالنے کے لیئے کچھ دستکاری کے کام سیکھ لیئے تھے۔ اب چھالیاں بیچتے تھے اور داستان سناتے تھے۔ کسی کے گھر جا کر سناتے تو دو روپے لیتے۔ پھر لوگوں نے بلانا چھوڑ دیا، انہوں نے جانا چھوڑ دیا۔ گھر میں بیٹھ کر سناتے تھے۔ ٹکٹ لگا رکھا تھا۔ ایک آنے کا ٹکٹ خریدو اور داستان سن لو۔ وقتاً فوقتاً شریف منزل کی محفل شب میں بلائے جاتے۔ افیون کی کٹوری سامنے رکھی ہے۔ گھول کر پیتے جاتے ہیں اور داستان سناتے جاتے ہیں۔ نشہ جتنا چڑھتا جاتا ہے اتنا ہی بیان چمکتا جاتا ہے۔

شاعروں میں اس محفل میں سب سے بڑھ کر نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی تھے۔ گورا رنگ، نکلتا ہوا قد، چوڑا چکلا سینہ، بھرواں سنہری ڈاڑھی، دائیں ہاتھ میں چھڑی، بائیں ہاتھ میں سگار، بر میں اونچی چولی کا انگرکھا، آڑا پاجامہ، پاؤں میں وارنش کا پمپ، سر پہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی جسے اپنے ہاتھ سے کاڑھتے تھے۔ اچھی کڑھائی کرتے تھے، اچھی پتنگ بناتے تھے، اچھا مانجھا سونتتے تھے۔ ہنڈیا بھی خوب پکاتے تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ (۳)

نواب سائل کے بھائی تھے نواب شجاع الدین احمد خان تاباں۔ شکل و شباہت میں ایک بھائی کو اُٹھاؤ دوسرے کو بٹھاؤ۔ مگر مزاج الگ الگ تھے۔ ایک سب آگ، ایک سب پانی۔ استاد تاباں ایک غصیلے، بات بات پر بھڑکتے تھے اور ایسے بھڑکتے کہ گالیوں پر اُتر آتے تھے۔ بڑے بھائی تھے، بات بات پر چھوٹے بھائی کو رگیدتے تھے۔

سائل صاحب داغ کے شاگرد۔ استاد تاباں داغ کے نام پر بلیوں اُچھلتے تھے۔ بھائی پر برسنے کے لیئے یہی بہانہ کافی تھا۔

مولانا شبلی ایک دفعہ دلی آئے تو حکیم صاحب سے کہا کہ تاباں صاحب سے ملاقات ہونی چاہیے۔ حکیم صاحب بھی دوراندیش تھے۔ خود ہمراہ نہ گئے کسی دوسرے کو ساتھ کر دیا۔ تاباں صاحب نے مولانا شبلی کی بہت تواضع کی۔ تواضع کے بعد اپنے کلام سے تواضع کی۔ مولانا شبلی اپنے وقت کے نامی گرامی نقاد، "شعرالعجم" کے مصنف، آسانی سے کاہے کو داد دینے لگے تھے۔ خاموش سنتے رہے۔ تاباں صاحب پر ایک رنگ آئے دوسرا رنگ جائے۔ ایک شعر خاص طور پر مخاطب کر کے سنایا۔ مولانا شبلی نے مروت میں فرمایا: "اچھا شعر کہا۔" بس پھر کیا تھا اُستاد بکھر گئے۔ "ابے لنگڑے شبلی، میں نے شعر تین دن میں کہا، تو نے ایک منٹ میں کیسے سمجھ لیا۔ بیٹا شعرالعجم نباشد، یہ شعر ہے شعر...." (۴) بیچارے مولانا شبلی اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔

شاعروں کا یہ جمگھٹا بلاوجہ نہیں تھا۔ حکیم صاحب کو خود بھی تو شعر کہنے کا شوق تھا۔ شریف خانیوں میں وہ شاید پہلے شاعر تھے۔ ان کے اجداد نے تو طب سے معاملہ رکھا تھا، شاعری سے کبھی میل نہیں کھایا۔ بلکہ حکیم عبدالمجید خاں کو تو بقول حکیم مولوی جمیل الدین مرحوم شاعری سے نفرت تھی۔ مگر حکیم صاحب شروع ہی سے اس طرف مائل تھے۔ ابتدائے عمر کی داستان حکیم جمیل الدین نے یوں سنائی ہے:

> "ایک دفعہ نواب صاحب لوہارو کی کوٹھی میں مشاعرہ ہوا، جس میں داغ، حالی، راسخ، طالب وغیرہ مشہور شعراء شریک تھے تو اپنے بھائی مرحوم اور والد مرحوم سے چھپ کر اور مجھے ساتھ لے کر پہنچ گئے اور آخر تک بیٹھے رہے۔ اس وقت وہ غالباً کسی زبان میں شعر نہ کہتے تھے۔"

مگر اب تو وہ باقاعدہ شاعر تھے۔ شیدا تخلص کرتے تھے اور غزل کہتے تھے اُردو میں بھی فارسی میں بھی۔ مگر طبیعت کی انکساری شاعر ہونے کا دعویٰ کرنے سے روکتی تھی۔ مشاعرے میں تو کیا پڑھتے، نجی محفلوں میں بھی سنانے سے کتراتے تھے۔ بس جو دوست شریف منزل میں اکٹھے ہوتے تھے اُنھیں سنا کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ آگے چل کر ان کا دیوان بھی چھپا اور لالہ سری رام نے اپنی تذکرہ شعراء

میں اُنہیں شاعر کی حیثیت سے جگہ بھی دی۔ "حکیم اجمل خاں شیدا نے زود گو اور جدت پسند طبیعت پائی تھی۔ نبض شناس معانی تھے۔ شعر کے حسن و قبح خوب پرکھتے تھے۔" (۵)

شاعری اپنی جگہ طب اپنی جگہ۔ رات کو حضرت شیدا دہلوی، دن میں حاذق الملک حکیم اجمل خاں۔ البتہ دن کی مصروفیات ہنگامہ خیز تھیں۔ مطب، طبی کانفرنس، قومی مسائل، مختلف اسلامی درس گاہیں، دوست احباب اور اہل خاندان کے معاملات، پھر ایک طرف جدید اُصول پیش نظر رکھتے ہوئے طب یونانی کے ارتقاء کے لیئے مدرسہ طبیہ کو ایک عظیم طبیہ کالج میں منتقل کرنے کی دھن دوسری طرف حکومت وقت کی دِلی کو دارالسلطنت بنانے کی تیاریاں۔ پرانے نقوش مٹائے جا رہے تھے، نئے نقوش جمائے جا رہے تھے ویسے اس نگر نے آگے بھی ایسے زمانے بہت دیکھے تھے جب آنے والوں نے پچھلوں کے نقوش مٹائے اور اپنا نقشہ جمانے کا اہتمام کیا۔ کتنوں نے نئے نئے نام سے اپنا شہر بسایا اور اپنا کوٹ تعمیر کیا۔ آج بھی اس شہر کے اندر ایسے کتنے ہی شہر مٹے مٹے نقشوں اور کھنڈروں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ ایک راجدھانی کتنی راجدھانیوں کا مدفن بنی ہوئی تھی۔ ان راجدھانیوں کا بسنا اُجڑنا کسی تاریخی عمل ہی کا حاصل ہونا چاہیے مگر بد شگنیوں کی بھی ایک تاریخ ان سے وابستہ چلی آتی تھی اور دلی والے اس تاریخ پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔

بد شگنیوں کا سلسلہ اندر پرستھ کے وقتوں سے چلا آتا تھا۔ جب اشومیدھ یگیہ ہو چکا اور فتح کا ڈنکا بھی بج چکا تو کہتے ہیں کہ اس سندر پوتر نگر میں کہیں سے ایک مکھی آ گئی۔ جن سورماؤں نے کورو کشیتر میں رن ڈالا تھا وہ ایک مکھی سے ہار گئے۔ یدھشٹر مہاراج نے اپنے بھوجن پہ مکھی کو بیٹھے دیکھا۔ اس سے انہیں ایسی گھن آئی کہ کٹم کو ساتھ لے اندر پرستھ سے نکل گئے۔ (۶) اور اندر پرستھ سے کیا گئے کہ جہاں سے گئے۔

پرتھی راج کی دلی کے بیچ کھڑی ہوئی لوہے کی لاٹھ خوش عقیدہ ہندوؤں کے حساب سے وہ کیلی تھی جو اس راجہ نے زمین کے راجہ باسک کے پھن میں گاڑی تھی کہ نہ راجہ باسک اس کی راجدھانی کی تہہ سے سرکے گا نہ اُس کے راج کو زوال ہو گا۔ مگر پرتھی راج نے اپنے پاؤں میں آپ کلھاڑی ماری۔ کیلی کو نکلوا کے دیکھا کہ کیا

سچ مچ وہ پھن میں گڑی ہوئی ہے۔ بس اس سے شگن بگڑ گیا، راجہ باسک لہرا کر آگے نکل گیا اور پر تھی راج کے راج پات کا پٹڑا ہو گیا۔

غیاث الدین نے تغلق آباد کے نام سے ایک نیا شہر کھڑا کیا۔ مگر پھر کیا ہوا۔ روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء نے یہاں اپنی باولی کھدوانے کا ڈول ڈالا۔ سلطان نے اس کام پر پابندی لگا دی۔ حضرت صاحب نے بددُعا کی کہ تغلق کے شہر میں گیدڑ بسیرا کریں۔ (۷) سو آخر کو وہاں گیدڑوں ہی نے بسیرا کیا۔ محمد تغلق کو ایک لہر آئی کہ دارالسلطنت دولت آباد لے چلو۔ دارالسلطنت کے ساتھ شہر کی خلقت کو بھی چلنے کا حکم ہوا۔ خلقت گھر سے بے گھر ہو گئی۔ شہر خالی ہو گیا۔ مگر ایک لنگڑا پھر بھی رہ گیا۔ اسے گاڑی کے پیچھے باندھ کر روانہ کیا گیا۔ لنگڑا گھسٹ گھسٹ کر رستے میں خاک ہو گیا مگر اس کی ایک ٹانگ بہرحال دولت آباد پہنچ گئی۔ (۸)

ایک بدشگنی بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی پر ہوئی کہ وہ رات کے اندھیرے میں تخت پر بیٹھے تھے۔

یہ سب پرانی داستانیں تھیں۔ اب ان نئی دانش والوں کا راج تھا جو نیک و بدشگون کے قائل نہیں تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء میں اس شہر کی شکل بگاڑ کر کلکتہ چلے گئے تھے کہ وہی شہر ان کا دارالسلطنت تھا۔ چاندنی چوک کی نہر مغلوں کی شادابی کی علامت تھی کہ ادھر مغل راج ختم ہوا اور ادھر یہ نہر خشک ہو گئی۔ مگر نہر کے آثار باقی تھے اور اس کے کنارے کھڑے ہوئے آم، جامن، برگد، نیم اور مولسری کے پیڑ ہنوز ہرے بھرے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اس نہر کے آثار مٹا دیے جائیں اور درخت کاٹ دیئے جائیں کہ اب شاہجہاں کی دلی انگریزوں کی دلی ہوا چاہتی تھی۔

انگریز حاکموں نے اور باتوں کے سوا ایک یہ بات بھی سوچی تھی کہ کلکتہ میں بنگالیوں نے بہت اُودھم مچا رکھا ہے۔ دِلی چلو کہ وہاں جو شورش بپا ہوئی تھی ۱۸۵۷ء میں بپا ہوئی۔ اب راوی چین لکھتا ہے۔ حکومت کے کاروبار میں اب وہاں کوئی کھنڈت نہیں پڑے گی۔ مگر ہوا یہ کہ کلکتہ سے حاکم بعد میں چلے شورشیں بپا کرنے والے پہلے چل پڑے۔ مولانا محمد علی نے کلکتہ سے 'کامریڈ' کی بساط لپیٹی اور دلی میں آ کر ڈیرا کیا۔ یہاں آ کر 'کامریڈ' کے ساتھ ایک اُردو روزنامہ 'ہمدرد' کا بھی ڈول ڈال دیا۔ یک نہ

شدودشد۔ ادھر ڈاکٹر انصاری بھی لندن سے فارغ التحصیل ہو کر دلی واپس آن پہنچے تھے۔ وہ اب محض ڈاکٹر نہیں تھے۔ سیاست بھی انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ خود حکیم صاحب بھی اس طرف کھینچ رہے تھے۔

ہوا یہ کہ دارالسلطنت بننے کے ساتھ دِلی پہلے مسرور ہوئی، پھر مضطرب ہوتی چلی گئی۔ اضطراب کی پہلی لہر جنگ طرابلس کے ساتھ اُٹھی۔ سن ستاون کا خون رنگ نہ لا سکا مگر طرابلس کے شہیدوں کے لہو کی گرمی ہندوستان تک پہنچی۔ دِلی میں خلقت مضطرب ہو کر جامع مسجد میں اکٹھی ہوئی۔ جلسہ ہوا۔ حکیم صاحب صدر بنے۔ مقرروں نے گرم تقریریں کیں۔ دِلی نے کتنے زمانے کے بعد اپنے خطیبوں کو گرم اور اُونچے لہجہ میں بولتے سنا تھا۔ یہ گرمی رنگ لائی۔ لوگوں سے اور کچھ بن نہ پڑا تو انہوں نے اپنی ترکی ٹوپیاں جلا ڈالیں۔ دِلی کے دوپلی ٹوپی والوں نے کتنی مزاحمت کے بعد علی گڑھ کے نیچریوں کی ٹوپی کو قبول کیا تھا۔ مگر ابھی وہ سرچڑھی ہی تھی کہ پھر نظروں سے گر گئی۔ یہ ٹوپی ان دنوں اٹلی سے درآمد ہوتی تھی۔ اس سے وہ رسوا ہوئی۔ سروں سے اُترنے لگی اور مسجد فتحپوری کے سامنے ڈھیر ہونے لگی۔ پہلے مسجد میں جلسہ ہوا۔ پھر ٹوپیوں کے ڈھیر میں آگ لگائی گئی۔ (۹) دِلی نے دو سال کے اندر اندر آتش زدگی کی دو وارداتیں دیکھ لیں۔ کل اس شہر میں امہات الامتہ، جلی تھی، آج ترکی ٹوپی جل رہی تھی۔

حکیم صاحب کے یار دوست حیران تھے کہ حکیم صاحب کس راہ پہ چل پڑے۔ سب یار دوست اور مزاج کے لوگ تھے۔ حکومت وقت کی وفاداری کے قائل تھے۔ نواب فیض احمد خاں وضعدار آدمی تھے۔ دوست کو راہ سے بے راہ ہوتے دیکھا اور چپ رہے۔ امام صاحب جامع مسجد نے اس بدلتے طرز عمل پر خاصا روکا ٹوکا۔ خود حکیم صاحب کا طور کل تک اور تھا۔ خطاب پا چکے تھے۔ دلی کے صدر مقام بننے کی تجویز کا خیرمقدم کر چکے تھے۔ حکام کے حلقہ میں اثر و رسوخ رکھتے تھے مگر آدمی کو بدلتے ہوئے دیر تھوڑا ہی لگتی ہے۔ اب ان کے قدم اس راہ پر اُٹھ رہے تھے جو انہیں انگریز حاکموں اور ان کا دم بھرنے والوں سے دُور لیئے جا رہی تھی۔ حکیم صاحب طبی محاذ پر گرمی دکھاتے دکھاتے جنگ طرابلس کے محاذ پر بھی سرگرم ہو چکے تھے۔

اسی ہنگامہ میں رامپور سے بلاوا آ گیا۔ حکیم صاحب رامپور چلے گئے۔ اگست اور ستمبر میں زیادہ وقت رامپور میں گزرا۔

رامپور سے واپس آئے تو دیکھا کہ ایک نئے اضطراب نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور مولانا محمد علی ایک نئے جوش کے ساتھ گرج برس رہے ہیں۔ یہ جنگ بلقان کا ردِ عمل تھا۔ ترکی ہار رہا تھا۔ قسطنطنیہ دشمن کی زد میں تھا۔ ہندوستان کے مسلمان پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ پہلے غم و غصے کی لہر دوڑی۔ پھر لوگ ترکی کی امداد کے لیئے کمربستہ ہوئے۔ مولانا محمد علی نے پہلے خود کشی کی ٹھانی، پھر چندے کی اپیل کی۔ جواب میں علی گڑھ کے طلبہ نے پلاؤ زردہ اور فیرنی کھانی چھوڑ دی اور تھرڈ کلاس میں سفر کرنے لگے۔ بیبیوں نے کانون سے بالیاں اتاریں اور چندے میں دے دیں۔ پشاور کی ایک نیک بی بی نے گود کا بچہ چندہ مانگنے والوں کی جھولی میں ڈال دیا اور کہا کہ اسے ترکی کے نام پہ نیلام کر دو۔

مولانا محمد علی نے تجویز پیش کی کہ ایک طبی وفد ترکی بھیجا جائے۔ حکیم صاحب نے تائید کی۔ ڈاکٹر انصاری کمربستہ ہو گئے کہ میں وفد لے کر جاؤں گا۔ مگر دِلی ہی کے اندر کچھ مخالفین بھی پیدا ہو گئے۔ اور مخالفت بھی شہر کی سب سے بڑی مسجد سے شروع ہوئی۔ اصل میں مولانا محمد علی بھی تو ننگی تلوار بن کر دلی میں داخل ہوئے تھے۔ 'کامریڈ' شروع ہوتے ہی جامع مسجد اور مسجد فتحپوری کی انتظامی کمیٹیوں پر برس پڑے۔ امام صاحب جامع مسجد ایک تو اسی پہ بھرے بیٹھے تھے۔ پھر ویسے بھی وہ کسی ایسی بات کو پسند نہیں کر سکتے تھے جس سے سرکشی کی بو آتی ہو۔ ترکی کی حمایت محض ترکی کی حمایت تو نہیں تھی۔ اس سے برطانیہ کی مخالفت کے بھی پہلو نکلتے تھے۔ بس اسی واسطے سے حکیم صاحب کی زندگی میں بھی ایک موڑ آ گیا۔ اب تک تو وہ برطانوی حکومت کے وفاداروں میں شمار ہوتے تھے۔ حکام سے ربط ضبط تھا۔ خطاب پا چکے تھے۔ دلی کے دارالسلطنت بننے کو برکاتِ سلطنت انگلشیہ میں شمار کیا اور خوش ہوئے۔ جن سے یاری دوستی تھی وہ بھی ایسے تھے جن کا اس زمانے کے حساب سے سیاسی چال چلن بالکل درست تھا۔ نواب فیض احمد خاں اور امام صاحب جامع مسجد دونوں ان کے بہت گہرے دوست تھے۔ لیکن بس دیکھتے دیکھتے ان کے تیور بدل گئے۔ امام صاحب نے تو حق دوستی ادا کیا اور نئی

روش پر روکا ٹوکا۔ مگر حکیم صاحب نے دوست کی ایک نہ سنی۔ امام صاحب حکیم صاحب سے بگڑ بیٹھے۔ نواب فیض احمد خاں وضعدار نکلے کہ دوست کے بدلتے تیور دیکھ کر بس چپ ہو گئے۔

جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے پرانی دوستیوں میں رخنہ ڈالا، اور نئی دوستیوں کو جنم دیا۔ حکیم صاحب اب مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری سے قریب ہوتے جا رہے تھے اور ڈاکٹر انصاری سے تو اتنے قریب ہوئے کہ ایک جان دو قالب بن گئے۔ ایک حکیم دوسرا ڈاکٹر۔ دونوں علاج معالجہ کی حد سے بڑھ کر کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ ابھی رستہ ٹٹول رہے تھے کہ ترکوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس قیامت میں دونوں نے اپنا رستہ پہچانا اور ایک دوسرے کو بھی پہچانا۔

حکیم صاحب نے طبی وفد کے لیئے چندہ بہت سرگرمی سے جمع کیا۔ ان کی سرگرمی سے اکیلی دلی سے ساٹھ ہزار کے لگ بھگ رقم جمع ہو گئی۔ دوسرے شہروں میں الگ مہم جاری تھی۔ دسمبر کے مہینے میں وفد ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں سدھارنے کے لیئے تیار ہوا۔ جامع مسجد کے اندر باہر سروں کا سمندر اُمنڈا ہوا تھا۔ مولانا محمد علی اور حکیم صاحب نے الوداعی تقریریں کیں۔ مولانا شاہ ابوالخیر نقشبندی نے دُعا کی۔ دُعا کے لیئے اُٹھنے والے ان بزرگ ہاتھوں کے ساتھ پوری دلی کے ہاتھ دُعا کے لیئے اُٹھ گئے اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ دلی نے نعروں، دُعاؤں اور آنسوؤں کے ساتھ وفد کو رخصت کیا۔

دلی اب کتنی بدل گئی تھی۔ یہ وہی دلی تھی جو آدھی صدی پہلے ۱۸۵۷ء میں دم بھر کے لیئے بھڑکی اور بجھ گئی۔ تب سے وہ بجھی بجھی چلی آ رہی تھی۔ انگریز حاکموں کو اس کی یہی کیفیت تو بھا گئی تھی کہ کلکتہ سے ڈیرے تنبو اُٹھا کر اس شہر کی طرف ہو لیئے۔ مگر ادھر ان کے آنے کی خبر گرم ہوئی ادھر دلی پھر سے گرم ہونے لگی۔ مسلمانوں کو کچھ تقسیم بنگال کی تنسیخ نے بھڑکایا، کچھ جنگ بلقان نے گرمایا۔ تقسیم بنگال پر مسلمان خوش ہوئے تھے کہ اس طور انہیں اپنا ایک اکثریتی صوبہ بنتا نظر آیا مگر کرزن صاحب نے ان کے بھلے کے لیئے تو یہ کام نہیں کیا تھا، اپنے سامراجی اغراض کے تحت یہ فلیتہ لگایا تھا۔ بنگالی ہندو نے اس پر طوفان کھڑا کر دیا۔ حاکموں نے سوچا کہ

تقسیم کی تنسیخ کر کے ہندوؤں کو رضامند کیا جا سکتا ہے تو کیا برا سودا ہے۔ باقی مسلمانوں کی خوشی کیا اور ناخوشی کیا۔ سو شاہ جارج پنجم یہاں آ کر تقسیم کی تنسیخ کر گئے۔ مسلمان مُنہ دیکھتے رہ گئے۔اور علامہ اقبال نے جل کر لکھا۔

مندمل زخم دل بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافرد مومن گئی
تاج شاہی آج کلکتہ سے دہلی آگیا
مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی

زخم دل بنگال مندمل ہو گیا تھا مگر دہشت پسندوں نے جو راہ پکڑی تھی وہ نہیں چھوڑی۔ کلکتہ سے مولانا محمد علی ہی نہیں آئے، دہشت پسند بھی چھپ چھپ کر دلی پہنچے، اور گھات لگا کر بیٹھ گئے۔

آج دسمبر کی ۲۳ تھی۔ لارڈ ہارڈنگ کی آمد آمد تھی۔ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر صاحب آج دِلی کو پنجاب کے حساب سے نکال کر انہیں سپرد کرنے والے تھے کہ اس شہر کو سنبھالو اور دارالسلطنت بناؤ۔ صبح کا وقت تھا۔ استقبال کرنے والے سٹیشن پر اکٹھے تھے۔ کلکتہ کی گاڑی ۱۱ بجے دلی پہنچی۔ لارڈ ہارڈنگ اور ان کی لیڈی صاحبہ نے گاڑی سے اُتر کر دِلی کی زمین پر قدم رکھا۔ استقبال کرنے والوں نے ان کی راہ میں آنکھیں بچھائیں۔ جلوس آراستہ تھا۔ ہاتھی تیار کھڑا تھا۔ لارڈ صاحب اور لیڈی صاحبہ نے ہاتھی پر رونق فرمائی۔ جلوس روانہ ہوا۔

جنم جنم کی اس راجدھانی نے کتنے راجوں مہاراجوں کو کتنے سلاطین و فاتحین کو آراستہ و پیراستہ ہاتھیوں پر سواری کرتے اور شان و شوکت سے گزرتے دیکھا تھا۔ اب وہ سب پر شوکت سواریاں ماضی کی داستان تھیں۔ حقیقت حال یہ تھی کہ سات سمندر پار سے آیا ہوا ایک سفید فام حاکم ہاتھی پر سوار بصد طمطراق دِلی کی شاہراہوں سے گزر رہا تھا۔ شاہراہوں پر جھنڈیاں لگی تھیں، یونین جیک لہراتا تھا۔ سب سے زیادہ چاندنی چوک آراستہ تھا۔ نہرپٹ چکی تھی، درخت کٹ چکے تھے۔ یہ شاہراہ اب کتنی وسیع ہوگئی تھی۔ گھنٹہ گھر کے قریب ایک پرچم لہرا رہا تھا جس پر سنہری لفظوں میں لکھا تھا جنم جنم کی راجدھانی میں خوش آمدید'۔ خلقت اُمنڈی ہوئی تھی۔ چھوٹے بڑے نووارد

حاکموں کی سواری دیکھنے کے لیئے اکٹھے تھے۔ جلوس چاندنی چوک میں داخل ہو چکا تھا۔ گھنٹہ گھر پر، پہنچا۔ لہراتے پرچم کے نیچے سے گزرا۔ یہاں سے گزر کر چند قدم چلا تھا کہ لارڈ صاحب کی سواری پر ایک گولہ آ کر گرا۔ جس کی قضا آئی تھی وہ فی الفور چل بسا۔ جس کو ہلاک کرنا مقصود تھا وہ بچ گیا۔ پیچھے مودب کھڑا ہوا جمعدار مر گیا۔ لارڈ ہارڈنگ صرف زخمی ہوئے اور بیہوش ہو گئے۔ (۱۰)

جلوس چلتے چلتے رُک گیا اور بیس منٹ تک رکا کھڑا رہا۔ مگر لارڈ ہارڈنگ کو ذرا ہوش آیا تو انہوں نے ایگزیکٹو کونسل کے سینیر ممبر سر گائی فلیٹ وڈولسن کو اپنا قائم مقام بنا کر جلوس کی روانگی کا حکم دیا۔ لارڈ ہارڈنگ اپنی پشت اور گردن پر زخم لے کر موٹر میں بیٹھ لیڈی صاحبہ کے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس روانہ ہوئے۔ جلوس لال قلعہ کی طرف چلا۔ (۱۱)

جلوس کی آن بان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ لال قلعہ میں داخل ہوا۔ مگر قلعہ میں جو معززین استقبال کے لیئے کھڑے تھے انہوں نے تعجب کے ساتھ دیکھا کہ برات دولہا کے بغیر لال قلعہ میں داخل ہوئی ہے۔

وفادارانِ سلطنت برطانیہ نے اس واقعہ پر برہمی کا اظہار کیا۔ کانگریس نے بھی اس واقعہ پر ناخوشی ظاہر کی۔ حکیم صاحب کے ایک تو لارڈ ہارڈنگ سے ذاتی مراسم تھے۔ پھر دہشت پسندی ان کے مزاج کے خلاف بات تھی۔ وہ بھی اس واقعہ پر ناخوش تھے۔ مگر زبانِ خلق کچھ اور کہہ رہی تھی۔ چوک میں سیلانیوں نے یہ خبر سنی اور کہا کہ اماں یہ تو سرمنڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ بیبیوں کا ماتھا ٹھنکا۔ گھر گھر چہ میگوئیاں تھیں "اے بی! یہ کیسا ازغیبی گولہ پھٹا۔ تخت کے لیئے یہ اچھا شگن نہیں ہے۔" پھر کسی بی بی کو شامیانے کا جلنا یاد آ گیا۔ "اچھی بی میں نے تو شامیانے کے جلنے کی خبر سن کے ہی سر پیٹ لیا تھا، شگن تو وہیں سے بگڑ گیا تھا۔"

راجدھانی کے واسطے سے دلی میں جو انگریز کی دھاک جمنی تھی وہ جمنے سے پہلے ہی اکھڑ گئی۔ نئے اندر پرستھ میں سورماؤں کے براجنے کے ساتھ ہی مکھی بھی آ گئی۔

حواشی

۱- امپیریل کورنیشن دربار (جلد دوم) صفحہ ۳۰
۲- یہ دلی ہے صفحہ نمبر
۳- مولوی حفیظ الرحمٰن واصف : برہان دہلی نومبر ۴۹ھ صفحہ ۳۰۱
۴- شاہد احمد دہلوی : ساقی کا شاہد احمد دہلوی نمبر صفحہ ۴۰۰
۵- خم خانہ جاوید (جلد پنجم) صفحہ ۱۴۰
۶- واقعات دارالحکومت دہلی (حصہ اول) صفحہ ۶
۷- دہلی، اے ہسٹوریکل سکیچ - صفحہ ۲۱
۸- دہلی، اے ہسٹوریکل سکیچ- صفحہ ۱۲۴
۹- مولانا احمد سعید : وطن کی آزادی میں دہلی کا حصہ- مطبوعہ دلی کالج میگزین (دلی نمبر)
۱۰- امپیریل کورونیشن دربار (جلد دوم) ضمیمہ ۴ صفحہ ۲۶-۲۷

طبی محاذ سے قومی محاذ کی طرف

۱۹۱۳ء شروع ہو چکا تھا۔ سال کے پہلے مہینے میں حکیم صاحب طبی کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ پہلی، دوسری اور تیسری فروری کی تاریخوں میں کانفرنس منعقد ہوئی۔

طبی کانفرنس سے فراغت ہوئی تو مسلم لیگ کا اجلاس سر پر آ کھڑا ہوا۔ قومی محاذ گرم تھا۔ جو اہل درد، دُعاؤں اور نعروں کے سائے میں ترکی سدھارے تھے ابھی واپس نہیں آئے تھے۔ مگر ان کے خط پہ خط چلے آ رہے تھے۔ ترکوں پر جو گزر رہی تھی اُس کی خبریں مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ ان سے طبیعتوں میں غصہ اور دلوں میں جوش پیدا ہوتا چلا جا رہا تھا اور مسلم لیگ کے اجلاس میں منشی احتشام علی کہہ رہے تھے کہ یورپ کی طاقتوں کے طرزِ عمل نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ مسلمانوں کی آنکھیں کھل رہی تھیں اور مسلم لیگ کے تیور بدل رہے تھے۔ اُس نے دوسری سیاسی تحریکوں سے ربط و ضبط پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ مسلم لیگ کے اس اجلاس میں کانگریسی رہنما بھی نظر آ رہے تھے۔ کانگریس کے صدر پنڈت بشن نرائن بھی شریک تھے اور مسز سروجنی نائیڈو بھی شریک تھیں۔

مسلم لیگ کا یہ اجلاس ۲۲ اور ۲۳ مارچ کو لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ سید وزیر حسن سکرٹری تھے۔ منشی احتشام علی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ حکیم صاحب بھی لکھنؤ پہنچے۔ اجلاس میں شریک ہوئے اور لیگ کے نائب صدر چنے گئے۔ (۱)

یہاں سے حکیم صاحب حیدر آباد کے لیئے روانہ ہوئے۔ طبی عملہ کے علاوہ

دیگر احباب بھی ہمراہ تھے۔ سب سے بڑھ کر حضرت سائل دہلوی تھے، ایک دلی کا نامی گرامی حکیم، دوسرا دلی کا نامی گرامی شاعر۔ شہر کے بیماروں اور شاعروں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دن کو مریضوں کا تانتا بندھا رہتا۔ رات کو شاعری کے بیمار قطار اندر قطار پہنچتے۔ ہر طرح کا شاعر آتا اور اپنا کلام سناتا۔ ایک ریختی گو بھی روزانہ محفل میں شریک ہوتے اور اپنی ریختی سنا کر اور حکیم صاحب سے داد لے کر رخصت ہو جاتے۔ بہرحال گیارہ دن ایک ہنگامہ سا برپا رہا۔ پھر واپس دلی آئے (۲) تو آتے ہی بیمار پڑ گئے۔

طبیعت ذرا سنبھلی تو سوچا کہ چل کر چند دن اوکھلے میں رہا جائے کہ کچھ تبدیلی آب و ہوا ہو جائے گی۔ ایک ہندو دوست نے وہاں اپنا مکان حکیم صاحب کے حوالے کر دیا۔ حکیم صاحب مع اہل خانہ شریف منزل سے اُٹھ کر اس مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہاں بھی یار احباب اسی طرح جمع ہونے لگے جیسے شریف منزل کے دیوان خانے میں ہوتے تھے۔ نواب فیض احمد خان، نواب صاحب لوہارو، نواب سائل، استاد تاباں۔ وہی یاروں کے جمگھٹے اور وہی شعر د شاعری کی محفلیں۔ وہی میر باقر علی داستان گو کا آنا اور داستان سنانا۔

حکیم صاحب کی طبیعت بحال ہو چلی تھی۔ تاباں کو دیکھ کر دِل میں گدگدی پیدا ہوئی۔ سائل صاحب کو اشارہ کیا۔ سائل صاحب نے اشارہ سمجھ لیا، مودب ہو بیٹھے اور بولے، "بھائی صاحب! گستاخی معاف، ہمارے استاد حضرت داغ نازک خیالی اور جذبات آفرینی میں اپنی مثال آپ تھے اور کیا قادرالکلام تھے کہ ایک گھنٹے میں پچاس پچاس شعر بلا تکلف لکھ ڈالتے تھے۔"

تاباں صاحب فوراً تاؤ کھا گئے "اے اُس کو اور تجھ کو کیا خبر کہ شعر کیا ہوتا ہے اور کیسے کہا جاتا ہے۔ کیا قلم برداشتہ لکھنا اور برملا کہنا بھی کوئی معیارِ سخندانی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کہہ مصرعہ، ابھی میں گرہ لگاتا ہوں۔"

سائل صاحب بھی بلا نکلے۔ فوراً ایک مصرعہ بصد اَدب عرض کیا، ادھر استاد تاباں بھی بند نہیں تھے۔ فوراً گرہ لگائی اور شعر پورا کیا۔

عدو میرا، نہ تو میرا، نہ چرخِ فتنہ جو میرا
شفق بن کر چڑھا ہے چرخ کے سر پر لہو میرا

بس پھر کیا تھا، محفل پھڑک گئی۔ حکیم صاحب نے کھڑے ہو کر استاد کو گلے لگایا، مگر استاد کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ آگ بگولہ ہو رہے تھے، غصے سے کانپ رہے تھے۔ یاروں نے جلدی جلدی پنکھا جھلا، پانی کے چھینٹے دیئے مگر تاباں صاحب یوں تو ٹھنڈے ہونے والے نہیں تھے۔ بھائی کو جی بھر کر بے نقط سنائیں اور اپنا دِل ٹھنڈا کیا۔ (۳)

کچھ اوکھلے اور قطب صاحب کی آب و ہوا تے اپنا اثر دکھایا، کچھ ان صحبتوں نے طبیعت میں جولانی پیدا کی۔ اب حکیم صاحب بالکل تندرست تھے اور طبی محاذ پر پھر سے سرگرم ہو چکے تھے۔ ۷ جون کو انجمن طبیہ کا ایک جلسہ دلی کے چیف کمشنر ہیلی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسئلہ مدرسہ طبیہ کو طبیہ کالج بنانے کا درپیش تھا۔ حکیم صاحب نے اس سلسلہ میں جو کوششیں کی تھیں، اُن کی تفصیل بیان کی اور عطیات دینے والوں کا اعلان کیا۔ سب سے زیادہ رقم نواب صاحب رامپور کی طرف سے عطا ہوئی تھی، یعنی پچاس ہزار روپے (۴) عطیات دینے والوں میں بالعموم ریاستوں کے والیوں کے نام تھے مگر دو نام مختلف نظر آئے۔ ایک جسٹس شاہ دین کا نام، جنھوں نے ایک ہزار روپے چندہ دیا تھا اور ایک نواب وقار الملک کا نام جنھوں نے سو روپے نذر کئے تھے۔ (۵)

جون کے ختم ہوتے ہوتے غلغلہ ہوا کہ ترکی کو سدھارنے والے واپس آتے ہیں اور مولانا شبلی نے شکرادا کیا کہ

ادا کرتے ہیں ہم شکر جنابِ حضرتِ باری
کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری

مگر ادھر ڈاکٹر انصاری نے ہندوستان میں قدم رکھا اور ادھر ایک نئی قیامت برپا ہوئی۔ یکم جولائی کو کانپور میں یہ واقعہ گزرا کہ ایک مسجد سڑک کی تعمیر کی زد میں آگئی۔ سڑک کی خاطر مسجد کے ایک حصہ کو ڈھا دیا گیا۔ مسلمان مضطرب ہوئے۔ اضطراب کی لہر کانپور سے اُٹھی اور پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پولیس نے مظاہرین پر گولی چلائی اور کتنے بے گناہوں کو شہید کیا۔ تب شہر شہر صف ماتم بچھی۔ مولانا محمد علی کی زبان و قلم نے آگ برسانی شروع کر دی، اور مولانا شبلی نے گریہ کیا۔

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمہ بلقان سے جگر شق ہے

بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرہ خوں
کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

کانپور کے مظلوموں کے لیئے شہر شہر چندے جمع ہونے لگے۔ دلی میں حکیم صاحب بھی چندے کے لیئے نکل کھڑے ہوئے۔ کئی مرتبہ روپوں کا ڈھیر لے کر دلی سے کانپور پہنچے۔ ڈاکٹر انصاری نے بیان کیا "وہ قریب قریب ہر ہفتے مجھے ہمراہ لیکر دلی سے کانپور جایا کرتے تھے۔" (۶)

اکابرین کہاں کہاں سے کھنچ کر کانپور پہنچ رہے تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان دلی سے، مسٹر مظہرالحق پٹنہ سے، علامہ اقبال اور مرزا اجلال الدین لاہور سے۔ کوئی چندہ لیکر پہنچا، اور کوئی اسیروں کے مقدمے کی پیروی کرنے۔

علامہ اقبال کانپور سے واپس ہوئے تو لاہور جاتے جاتے دلی میں اُتر پڑے۔ حکیم صاحب شاعر کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کرنے لگے۔ تقریب منعقد ہوئی اور میرٹھ کے ہفت روزہ "توحید" نے اپنی ۱۶ ستمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں خبر دی:

"کانپور سے واپس ہو کر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر دہلی میں کئی روز مقیم رہے۔ حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب نے ان کے اعزاز میں عمائد شہر کو مدعو کیا تھا۔ شعر و شاعری کی وہ دلچسپ صحبت گرم رہی کہ دہلی کے دورِ گذشتہ کا لطف آ گیا۔ حاذق الملک کی غزل بھی پڑھی گئی۔ معلوم ہوا حکیم صاحب شعر گوئی میں بہت اچھا ملکہ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال نے فرمایا: "حاذق الملک حکیم ہیں، محض طبیب نہیں ہیں۔" یعنی ان کو حکمت جیسی بے مثل نعمت کا حصہ ملا ہے۔" (۷)

علامہ اقبال کئی دن دلی میں رہے۔ حکیم صاحب نے شعر سنے شعر سنائے۔ علامہ لاہور روانہ ہو گئے۔ شعر و شاعری موقوف، حکیم صاحب پھر چندہ جمع کرنے دلی کے کوچوں میں گشت کرنے لگے۔

حکیم صاحب نے چندہ جمع کرتے کرتے ایک قدم اور اُٹھایا۔ ڈاکٹر انصاری بتاتے ہیں: "انہوں نے نواب صاحب رامپور کو جن کے تعلقات اس زمانہ کے گورنر سر جمیز

مسٹن سے بہت گھرے تھے اور نواب صاحب ہی کے ذریعہ سے لارڈ ہارڈنگ سے اس معاملہ کے سلجھانے میں پوری سعی اور کوشش کی۔" (۸)

مخالفوں نے اس کوشش کو کچھ اور ہی رنگ دے دیا۔ افواہ اُڑی کہ حکیم صاحب کے گھر پر نواب صاحب رامپور کی سرپرستی میں ایک جلسہ ہو گا جس میں مسجد کانپور کے لیئے تحریک چلانے والوں کی مذمت کی جائے گی۔ دلی کی دیواروں پر حکیم صاحب کے خلاف اشتہار لگ گئے۔ احتجاجی تار آنے لگے کہ صاحب اس جلسہ پہ خاک ڈالیئے۔ (۹)

جلسہ بیشک منعقد ہوا مگر مختلف رنگ سے۔ 'ہمدرد' کے رپورٹر نے خبر دی کہ "نواب صاحب کا ایڈریس نہایت معقول تھا، اور ہمیں تعجب ہوا کہ جب یہ افتتاحی کارروائی ہے تو ناحق ایسی بے بنیاد باتیں شہر میں اُڑ گئی تھیں۔ (۱۰)

مخالفوں نے اس جلسہ کو بھی اُلٹنے کی بہت کوشش کی۔ سوال اُٹھایا کہ اس جلسہ میں آخر راجہ محمود آباد اور نواب وقار الملک کیوں نہیں ہیں؟ یہ سوال اُٹھنا تھا کہ ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوئی موافقت میں بول رہا ہے، کوئی مخالفت میں چلا رہا ہے اور کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ آخر سر شفیع نے تجویز پیش کی کہ ایک اور جلسہ بلایا جائے۔ اس پر اتفاق ہو چلا تھا کہ کسی نے سوال کھڑا کیا کہ جلسہ کا داعی کون ہو گا؟ اور پھر ایک طوفان بپا ہو گیا۔ بہت سوں کی رائے تھی کہ نواب صاحب رامپور داعی بنیں۔ سر رضا علی نے شوشہ چھوڑا کہ راجہ محمود آباد کو بھی داعی بنایا جائے۔ اور پھر کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے۔ آخر اس صورتحال کو حکیم صاحب نے سنبھالا۔ 'ہمدرد' کے رپورٹر نے بیان کیا کہ "آنریبل محمد شفیع اور حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب نے رضا علی صاحب سے کچھ کان میں گفتگو کی اور ان کو باہر علیحدہ لے گئے۔ اس کے بعد رضا علی صاحب پھر کمرے میں واپس آئے اور نواب محمد اسحٰق خاں صاحب سے ان کی غصہ بھری تقریر میں مداخلت کرتے ہوئے، جو برابر جاری تھی یہ کہا کہ آپ مجھ سے علیحدگی میں ایک بات سن لیں۔ اور یہ دونوں صاحب باہر چلے آئے اور پھر جب یہ صاحبان واپس آئے تو کسی نے یہ بات پیش کی کہ چلئے فیصلہ ہو گیا کہ نواب صاحب رامپور پریزیڈنٹ اور داعی بنائے جائیں اور راجہ صاحب محمود آباد سیکرٹری۔" (۱۱)

جیسے تیسے یہ قضیہ طے ہوا اور مخالفوں کا مُنہ بند ہوا۔ حکیم صاحب کی کوشش ٹھکانے لگی۔ وسط اکتوبر میں لارڈ ہارڈنگ کانپور پہنچے، مسلمانوں سے افہام و تفہیم کی اور تنازعہ کو نمٹایا۔ مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس میں اس تصفیہ کو سراہا اور لارڈ ہارڈنگ کے تدبر کی داد دی۔ مسلم لیگ کا یہ ساتواں سالانہ اجلاس تھا جو ۳۰ اور ۳۱ دسمبر کو آگرہ میں منعقد ہوا۔ حکیم صاحب آگرہ جا کر اس میں شریک ہوئے اور لیگ کے عہدیدار چنے گئے۔

۱۹۱۳ء سفر آگرہ کے ساتھ ختم ہوا۔ حکیم صاحب دلی واپس آئے پھر جلدی ہی امرتسر چلے گئے کہ وہاں طبی کانفرنس ہو رہی تھی۔ طبی کانفرنس سے فراغت پا کر واپس دلی آئے۔ چار دن چین سے بیٹھے تھے کہ پھر سر پہ سفر سوار ہوا اور قدم لکھنؤ کی طرف اُٹھ گئے۔ وہاں طبیہ کالج کی تحریک کے سلسلہ میں ۳۱ مارچ ۱۹۱۴ء کو ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ جلسہ قیصرباغ کی بارہ دری میں منعقد ہوا۔ یوپی کے اُس وقت کے گورنر سرجیمز مسٹن بہادر نے صدارت کی۔ نواب صاحب رامپور کو اس جلسہ میں تقریر کرنی تھی۔ مگر وہ خود نہ آئے، ان کی تقریر آ گئی۔ جلسہ کامیاب رہا۔ مگر لکھنؤ بھی اپنی قدامت پسندی میں پکا تھا۔ جلسہ تو شان سے ہو گیا مگر جب چندہ دینے کا مرحلہ آیا تو لکھنؤ والوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔

طبی کانفرنس کے قصے قضئے اپنی جگہ، آخر یہ دیارِ لکھنؤ تھا۔ حکیم صاحب اتنے بے ذوق تو نہ تھے کہ مصحفی و آتش کے شہر میں آ کر بس جلسے کر کے چلے جاتے، محفل شب یہاں بھی آراستہ ہونے لگی۔ دِن میں طبی کانفرنس کے معاملے، چندے کی باتیں، رات کو شعر و شاعری کی محفل۔ "روزانہ جناب صفی صاحب اور دیگر مشاہیر شعراء سے مجلس گرم ہوتی تھی۔ کچھ ایسے نواب صاحبان بھی تشریف لاتے تھے جن کی دولتیں اور جاہ و حشمت حوادثِ زمانہ کی نذر ہو چکا تھا، مگر ان کا لباس، اُن کی زبان، اُن کے اخلاق، اُن کا تخیل اور نازک دماغی اُسی شاہانہ ٹھاٹ کے ساتھ اُن کے پچھلے زمانے کے تمدن و تہذیب کا نشہ آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتی تھی۔" (۱۲)

انہیں دنوں ندوۃ العلماء کا قضیہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں مولانا شبلی اور انتظامیہ کے درمیان ایک مدت سے ٹھنی ہوئی تھی۔ پچھلے برس اپریل میں معاملات کو سنبھالنے

سنوارنے کی غرض سے مجلس اصلاح ندوہ کے نام سے ایک جماعت بھی قائم ہوئی تھی مگر اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اب حکیم صاحب نے ایک قدم اُٹھایا۔ اُنھوں نے "ملک کے اہل الرائے حضرات کو دہلی میں ایک مشورے کی مجلس میں شرکت کی دعوت دی جو ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کو ہونی قرار پائی۔" (۱۳)

۱۰ مئی کے آتے آتے اہل الرائے حضرات دلی میں جمع ہوئے، کچھ اس کیمپ کے اور کچھ اُس کیمپ کے۔ مولانا شبلی آئے اور حسب دستورِ قدیم شریف منزل میں آکر ٹھہرے۔ دوسری طرف سے انتظامیہ کے کچھ کل پرزے، کچھ ان کے حالی موالی آن پہنچے۔ انہوں نے کوشش کی کہ یہ جلسہ ہی نہ ہونے پائے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کی خدمت میں ایک درخواست داغ دی کہ اس جلسہ میں فساد کا اندیشہ ہے اس لیئے اس کے انعقاد کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ پھر مولویوں سے مل ملا کر مولانا شبلی کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کرا دیا۔ ۹ مئی کی شب کو شریف منزل میں جو مجلس مصالحت ہوئی اس میں انتظامیہ کے ارکان آکر اعلان کر گئے کہ ارکانِ ندوہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ کل کے جلسہ میں شریک نہیں ہوں گے۔

جلسہ بہرحال ہوا۔ ۱۰ مئی کی صبح کو مولانا ثناء اللہ امرتسری کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ جنہوں نے جلسہ میں شریک نہ ہونے کا اعلان کیا تھا وہ بھی آن دھمکے۔ مولانا محمد علی کو شروع میں تامل تھا، پھر وہ بھی شریک ہو گئے اور ایسے شریک ہوئے کہ سب سے زیادہ غصیلی تقریر انہوں ہی نے کی۔ اصل میں یہاں علی گڑھ گروپ بھی آیا ہوا تھا۔ وہ انتظامیہ کا حامی تھا اور اصلاحی تحریک کا مخالف۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے انتظامیہ کی حمایت میں تقریر کر ڈالی۔ اب مولانا محمد علی کہاں رُکنے والے تھے، بس کھڑے ہو گئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ :

"اگر استبدادِ مجسم دیکھنا ہو تو ادھر دیکھو۔"

اور پھر ایسے گرجے برسے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ان کی حمایت میں خواجہ غلام الثقلین بولے، مولانا آزاد بولے۔ مرزا حیرت، جالب دہلوی، مولانا عبدالوہاب بہاری اور پھر خود حکیم صاحب۔ ایک سے ایک بڑھ کر بولا۔ کانفرنس اپنے اصلاحی مقصد میں کامیاب رہی۔ علامہ سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ کانفرنس کا انتظام حکیم صاحب نے

معقول کیا تھا۔ اور یہ کہ حکیم صاحب بیچ میں نہ ہوتے تو اس جلسہ کا انعقاد ہی ممکن نہ ہوتا۔ (۱۴)

مولانا محمد علی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں پر بلاوجہ نہیں برسے تھے۔ اصل میں اس وقت علی گڑھ بھی تو دو کیمپوں میں بٹا ہوا تھا۔ جھگڑے کا پس منظر یہ تھا کہ حکومت نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی منظوری تو دے دی تھی، لیکن یونیورسٹی کا آئین اس طریقہ کا بنایا گیا کہ یونیورسٹی پر حکومت کو پورا اختیار حاصل ہو گیا۔ مسلمانوں کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے کالج اور سکول اس یونیورسٹی سے ملحق ہوں۔ یہ مطالبہ یکسر رد کر دیا گیا۔ اس کے خلاف سخت ردِ عمل ہوا، صرف علی گڑھ ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں ایک علیگی احرار کا گروہ قائم ہو گیا۔ اس گروہ میں نواب وقارالملک، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور حکیم صاحب شامل تھے، ان کے مخالف گروہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان، نواب مزمل اللہ خاں، نواب اسحق خان اور سر علی امام تھے۔ احراریوں کا گروہ کہتا تھا کہ ایسی یونیورسٹی کو جو ہمارے خوابوں اور آدرشوں ہی کی حامل نہ ہو ہم لیکر کیا کریں گے۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ جو ملتا ہے لے لو۔ ڈاکٹر انصاری کا بیان ہے کہ نواب وقار الملک کے علیحدہ ہو جانے اور علی برادران کی نظربندی کے بعد اکیلے حکیم صاحب احراریوں کے لیڈر رہ گئے۔ کالج کے ٹرسٹیوں کے جلسہ میں انہوں نے اپنے گروہ کی رہنمائی اس خوبی سے کی اور اپنا موقف اس سنجیدگی اور قابلیت سے پیش کیا کہ یونیورسٹی کے آئین میں ان کی ساری ترمیمیں منظور کی گئیں۔ آخر میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی تاکہ وہ ان ترمیموں کی روشنی میں ممبر تعلیمات سے ملے اور آئین کو پھر سے مرتب کرے۔ اس کمیٹی میں ایک نواب اسحق خاں کے سوا باقی جو لوگ لیئے گئے وہ سب احراری تھے یا کانگریسی یعنی حمید اللہ خان (نواب بھوپال) مظہرالحق، محمد علی جناح، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر ولی محمد۔ ڈاکٹر انصاری کہتے ہیں :

> "حکیم صاحب اس کمیٹی کے ممبر صرف اس لیئے نہ تھے کہ انگریزی زبان نہ جاننے کی وجہ سے انہوں نے خود ہی اس ذمہ داری کو قبول نہ کیا تھا لیکن وہ برابر ہمارے مشوروں میں شریک رہتے تھے اور اپنی سنجیدگی اور

گہری نظر کی وجہ سے بہت مفید ثابت ہوتے تھے۔"

علی گڑھ کالج اس جھگڑے سے گزر کر مسلم یونیورسٹی بنا چاہتا تھا۔ ادھر مدرسہ طبیہ کو طبیہ کالج بنانے کے لیئے دوڑ دھوپ ہو رہی تھی۔ انجمن طبیہ کے جلسہ میں حکیم صاحب نے اعلان کیا کہ کالج کے لیئے دو لاکھ کی رقم جمع ہو چکی ہے، اب عمارت کے لیئے آٹھ لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔

ادھر یہ منصوبہ بندیاں تھیں۔ اُدھر دفعتاً وقت نے پلٹا کھایا۔ ۱۹۱۴ء کے آٹھویں مہینہ میں برطانیہ اور جرمنی میں ٹھن گئی۔ جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ندوہ العلماء کا قضیہ، مسلم یونیورسٹی کا قضیہ، طبیہ کالج کی تحریک، سب قصے قضئے پس منظر میں چلے گئے۔ ایک بڑا واقعہ نمودار ہو گیا تھا۔ ہندوستان کو، ہندوستان کے مسلمانوں کو اب نئے مسائل درپیش تھے۔ ۴ اگست کو جنگ کی خبر آئی۔ دلی میں بیٹھے ہوئے مسلمان رہنماؤں نے ہفتے ڈیڑھ ہفتے آپس میں صلاح مشورہ کیا، اور ۱۶ اگست ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ کر ڈالا۔ مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم صاحب سب نے تقریریں کیں اور جنگ کے ہنگام حکومت سے تعاون کا اعلان کیا۔ انھوں نے بیشک حکومت سے تعاون کیا اور حکیم صاحب نے جنگ کے امدادی کاموں میں اچھی خاصی سرگرمی دکھائی۔ مگر یہ تعاون مسلمانوں کے زیادہ کام نہ آیا۔ یکم نومبر ۱۹۱۴ء کو ترکی، جرمنی کا طرفدار بن کر جنگ میں کود پڑا۔ بس پھر کیا تھا، ہندوستان میں مسلمانوں کی وفاداریاں فی الفور مشکوک ہو گئیں۔

حواشی

۱۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان۔ جلد اول۔ ص ۲۸۱
۲۔ حیات اجمل۔ مرتبہ حکیم رشید احمد خاں۔ ص ۹۳-۱۹۲
۳۔ حیات اجمل، مرتبہ حکیم رشید احمد خاں، ص ۱۹۷
۴۔ اخبار الصناوید (جلد دوم) ص ۴۵۴
۵۔ اسیرت اجمل۔ ص ۸۱

۶- حیات اجمل، مرتبہ قاضی عبدالغفار، ص ۱۳۵
۷- اوراق گم گشتہ، ص ۲۴
۸- حیات اجمل، مرتبہ قاضی عبدالغفار، ص ۱۳۶
۹- اخبار ہمدرد، مورخہ ۵ اکتوبر ۱۳ء بحوالہ علی برادران، ص ۳۸۳
۱۰- اخبار ہمدرد، مورخہ ۵ اکتوبر ۱۳ء بحوالہ علی برادران، ص ۳۸۴
۱۱- ہمدرد، مورخہ ۵ اکتوبر ۱۳ء بحوالہ علی برادران، ص ۳۸۶
۱۲- حیات اجمل، مرتبہ حکیم رشید احمد خاں- ص ۲۲۷
۱۳- حیات شبلی- ص ۶۵۶
۱۴- حیات شبلی، ص ۷۹۸

جنگ اور تحریکیں

جب اس مرد مجاہد کو چار برس جمعیتہ الانصار میں کام کرتے کرتے گزرے تب ایک روز حضرت شیخ الہند نے اسے اپنے حضور طلب کیا اور ارشاد فرمایا کہ اے عبیداللہ! اس شہر میں تیرا کام ختم ہوا- یہاں سے نکل اور دلی کی راہ لے کہ وہ شہر تیرا منتظر ہے-

مرید نے شیخ کی ہدایت پر سر تسلیم خم کیا- رخت سفر باندھا اور دیو بند سے نکل دلی کی راہ لی، پھر اس بزرگ نے خود دلی کا سفر اختیار کیا- اس دیار میں پہنچ کر ایک مدرسہ قائم کیا- نظارۃ المعارف اس کا نام رکھا-

> "۱۳۲۱ھ (۱۹۰۴ء) میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی- اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک بھی شریک تھے-" (۱)

دیو بند میں بیٹھے ہوئے شیخ کی آنکھیں کیا دیکھ رہی تھیں کہ اس نے مرید کو دلی پہنچنے کی ہدایت کی- کسی نے نہ جانا کہ کیوں اس بزرگ نے اس شہر میں پہنچ کر ایک ادارہ قائم کیا اور کیا حکیم اجمل خان کے کان میں کہا- بہرحال نظارۃ المعارف قائم ہوگیا اور حکیم صاحب اس کے سرپرست بن گئے- ۱۳۲۱ھ میں دلی کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں تھی- مگر ۱۹۱۲ء میں دلی برطانوی راج کا دارالسلطنت بنا اور دیکھتے دیکھتے یہ شہر سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا- مسلمانوں کے رہنما اب یہاں اکٹھے ہو رہے تھے- شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے پھر دلی کا سفر کیا اور مولانا عبیداللہ سندھی نے غایت اس سفر کی یوں قلمبند کی:

"حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیو بند میں رکھ کر پہلے تعارف اپنی جماعت سے کرایا، اسی طرح دہلی پہنچ کر نوجوان قیادت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔" (۲)

اور ڈاکٹر انصاری کے کان میں کیا کہا گیا تھا کہ انہوں نے مولانا عبید اللہ سندھی کا تعارف مولانا ابو الکلام آزاد سے کرایا اور مولانا ابو الکلام آزاد نے ان کا تعارف مولانا محمد علی سے کرایا۔ (۳)

پھر ڈاکٹر انصاری نئی سیاسی قیادت اور روایتی مذہبی قیادت کے درمیان ربط و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ "ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا خدا بھلا کرے جو علمائے دیو بند اور تعلیم یافتگان علی گڑھ کے ملانے میں ایک مضبوط کڑی ثابت ہوئے۔ وہ جب ہلال احمر کا وفد لے کر گئے تو اس میں علمائے دیو بند بھی شریک ہوئے اور اسی کام کو مکمل کرنے والے ہمارے مسیح الملک تھے۔ اس مرحلہ کے طے ہونے پر مسیح الملک اور ڈاکٹر انصاری نے دہلی میں اس کام کو عملاً شروع کر دیا اور اس میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی ہوئی، چنانچہ مولانا محمد علی قومی لیڈر بن گئے۔" (۴)

اب ۱۹۱۵ء تھا ترکی جنگ میں شامل ہو چکا تھا اور ہندوستانی مسلمان برطانوی راج کی نظروں میں مشکوک ہو گئے تھے۔ الہلال، ہمدرد، کامریڈ اور زمیندار کی ضمانتیں ضبط، مولانا ظفر علی خان نظر بند، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ شیخ الہند پھر دیو بند سے چل کر دلی پہنچے۔ مرشد نے مرید کو ہدایت کی: "اے عبید اللہ! دلی میں تیرا کام ختم ہوا۔ اس قریے سے نکل اور کابل کی سمت جا۔"

مرید نے مرشد سے ہدایت پائی اور سفر پر کمربستہ ہوا۔ روانہ ہونے سے پہلے حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور مولانا ابو الکلام آزاد سے ملاقات کی اور انہیں شیخ الہند کے حکم سے مطلع کیا۔ ان چاروں نے اس حکم پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور مولانا عبید اللہ سندھی کو اپنا نمائندہ تسلیم کیا۔ (۵)

پھر یوں ہوا کہ مولانا شوکت علی خاموشی سے فتح پوری مسجد پہنچے اور مولانا کے ایک رفیق کے ہاتھ میں ایک پلندہ تھما کر آ گئے۔ اس میں پانچ ہزار کی رقم تھی، یہ رقم

اس خفیہ فنڈ سے آئی تھی جو حکیم صاحب اور ان کے رفقاء نے اکٹھا کیا تھا۔ (۶)
مولانا عبید اللہ سندھی چپکے سے فتح پوری مسجد سے نکلے اور نامعلوم سفر پر روانہ ہو گئے۔

"اپریل ۱۹۱۵ء کے شروع میں دہلی سے سندھ چلا آیا۔ چار مہینے مختلف مقامات پر گزرے۔ دوستوں سے آخری ملاقات اور ضمناً راستے کے خطرات سے محفوظ رہنے کی تدابیر میں مصروف رہا۔ بفضلہ تعالٰی بلوچستان سے گزر کر ۱۵ اگست کی نماز مغرب سرحد افغانستان میں پڑھی اور توکل علے اللہ بغیر کسی پاسپورٹ حاصل کیے افغانستان میں داخل ہوا۔ (۷)

مولانا عبیداللہ سندھی نے چلتے چلتے ایک خط اپنے ایک معتمد احمد علی کو دیا کہ جاؤ اور یہ خط ابو الکلام کو پہنچاؤ۔ خط مکتوب الیہ تک پہنچا۔ اس میں لکھا تھا کہ اے عزیز میں کابل پہنچ کر کوشش کروں گا کہ امیر تمہیں کابل آنے کی دعوت دے، ادھر تم حکیم اجمل خاں سے بات کرو کہ وہ امیر کے خبر نویس مقیم راولپنڈی سے بات چیت کریں کہ وہ امیر سے اس خاکسار عبید اللہ کے لیے سفارش کرے۔ (۸)

۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو شیخ الہند نے مولوی محمد میاں انصاری کو ہمراہ لیا اور چپکے سے حجاز روانہ ہو گئے۔

ایک نامعلوم شخص احمد علی سے آ کر ملا اور اسے ایک رقعہ دیا۔ رقعہ میں لکھا تھا کہ حامل رقعہ ہذا تمہیں زبانی پیغام دے گا۔ اس کے کہے پر اعتبار کرو، یہ نامعلوم شخص مولانا ابو الکلام آزاد کا معتمد ملازم تھا۔ اس نے پیغام دیا کہ مولانا سفر پر کمربستہ ہیں۔ ان کے سفر کا بندوبست کیا جائے۔ (۹)

سفر کا یہ منصوبہ پروان نہ چڑھ سکا۔ ابھی سفر کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی کہ مولانا ابو الکلام نظر بند ہو گئے۔

شیخ الہند حجاز پہنچ کر حجاز کے ترک فوجی حاکم غالب پاشا سے ملے اور ترکی کے وزیر جنگ جمال پاشا سے گفت و شنید کی اور ہندوستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں ان کے تعاون کا وعدہ لیا۔ غالب پاشا سے ایک چٹھی لکھوائی جس میں ہندوستانی مسلمانوں کو جہاد کی تلقین کی گئی تھی۔ یہ چٹھی "غالب نامہ" کہلائی۔ مولوی محمد میاں "غالب

نامہ" لے کر ہندوستان روانہ ہوئے۔ "غالب نامہ" کی نقلیں ہندوستان اور قبائلی علاقہ میں تقسیم ہوئیں۔ (۱۰) یہ کام انجام دیتے ہوئے مولوی محمد میاں چلتے چلتے کابل جا پہنچے۔

شیخ الہند نے ایک تحریر انور پاشا اور جمال پاشا سے حاصل کی۔ ان دونوں وزیروں نے اس تحریر میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی سے ہمدردی کا اظہار کیا اور ترکی کی طرف سے حمایت اور امداد کا یقین دلایا۔ اس دستاویز کو ہندوستان بھیجنے کا اہتمام اس طرح ہوا کہ کپڑے رکھنے کا ایک صندوق بطور خاص بنوایا گیا۔ اس کے تختوں کو اندر سے کھود کر اس میں یہ دستاویز رکھ دی گئی، پھر تختوں کو اس طرح ملایا گیا کہ جوڑ ظاہر نہ ہو۔ صندوق میں کچھ پرانے کپڑے، کچھ نئے کپڑے، کچھ تھان، ریشمیں، کچھ غیر ریشمیں بھرے گئے۔ لے جانے والے کو سمجھایا گیا کہ اپنے مکان پر پہنچ کر اس دستاویز کو نکالنا اور فلاں شخص کو دینا کہ فلاں فوٹو گرافر سے اس کے فوٹو بنوائے اور یہ فوٹو فلاں فلاں کو پہنچا دے۔ (۱۱)

مولوی محمد میاں کے کابل پہنچنے کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی نے سوچا کہ اپنی کارکردگی سے شیخ الہند کو مطلع کیا جائے اور گزارش کی جائے کہ اب وقت آگیا ہے کہ حکومت ترکی سے باقاعدہ امداد کی بات چیت کی جائے اور ان سے کوئی معاہدہ کیا جائے۔ ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کو زرد ریشمی کپڑے پر بصد احتیاط خطوط لکھے گئے۔ ساتھیوں میں سے ایک ساتھی کی ڈیوٹی لگی کہ یہ خطوط لے کر ہندوستان جاؤ اور حیدر آباد (سندھ) پہنچ کر شیخ عبدالرحیم کو پہنچاؤ۔ شیخ موصوف کو لکھا گیا کہ کسی قابل اعتبار حاجی کے ہاتھ اسے شیخ الہند کی خدمت میں بھجوا دو۔ کوئی معتبر وسیلہ میسر نہ آئے تو خود جاؤ اور حضرت کی خدمت میں پیش کرو، مگر خطوط لے جانے والے ساتھی نے دغا کی۔ یہ خطوط شیخ عبدالرحیم کے پاس پہنچنے کی بجائے انگریزی حکومت کے پاس پہنچ گئے۔ یہ اگست ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے کہ یہ خطوط انگریزی حکومت کے ہاتھ پڑے اور سارا راز فاش ہوگیا۔

مگر اس واقعہ سے پہلے ہی بہت کچھ ہوچکا تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی مئی ۱۹۱۵ء ہی میں گرفتار ہوچکے تھے۔ مولانا آزاد نومبر میں گرفتار ہوئے۔ نظارۃ المعارف کی حیثیت مشکوک ہوچکی تھی۔ اس کے ساتھ اب حکیم صاحب بھی مشکوک لوگوں میں شامل تھے۔ کل جسے جنگ کے امدادی کاموں میں سرگرمی دکھانے پر تمغہ قیصر

ہند ملا تھا آج اس کے پیچھے خفیہ پولیس لگی ہوئی تھی۔

۱۹۱۵ء کے ختم ہوتے ہوتے مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ حکیم صاحب اس اجلاس میں شریک ہونے بمبئی پہنچے۔ اس اجلاس کے روح رواں محمد علی جناح تھے کہ ابھی قائداعظم نہیں بنے تھے، بس مسٹر جناح تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست علمبردار۔ انہیں کی تجویز پر مسلم لیگ کا یہ اجلاس بمبئی میں انہیں تاریخوں میں ہو رہا تھا جن تاریخوں میں اسی شہر میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہونا تھا۔ سرکار پرستوں نے بہت مخالفت کی مگر ان کی ایک پیش نہ گئی۔ ۳۰ دسمبر کو اجلاس شروع ہوا۔ مظہرالحق صدر تھے اور کانگریس کے ممتاز رہنما مہمان بنے بیٹھے تھے۔ ان میں گاندھی جی بھی تھے اور مسز سروجنی نائیڈو اور مسز اینی بیسنٹ بھی۔ (۱۱)

اجلاس کا پہلا دن خیریت سے گزرا۔ مگر دوسرے دن طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ طوفان اس وقت اٹھا جب جناح صاحب ایک قرارداد پیش کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ (۱۲) مخالف پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ کہیں ان کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی کہ جناح صاحب ایک تجویز پیش کرنے والے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں افہام و تفہیم ہو جائے۔ بس پھر کیا تھا قیامت ہی تو آگئی۔ ادھر جناح صاحب کھڑے ہوئے اور ادھر شور و شغب برپا ہوا۔ جلسہ درہم و برہم ہوگیا۔ صدر نے جلسہ ملتوی کیا، پھر تاج محل ہوٹل میں جلسہ کا انتظام ہوا۔ اب جناح صاحب نے اطمینان سے اپنی قرارداد پیش کی۔ قرارداد یہ تھی کہ اس کے پیش نظر کہ حکومت کی نئی تشکیل ہونے والی ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے ایک اصلاحی کمیٹی مقرر کی جائے جو اصلاحات کی سکیم مرتب کرے اور جسے دوسری سیاسی جماعتوں سے صلاح مشورہ کرنے کا اختیار ہو، قرارداد منظور ہوئی۔ کمیٹی چنی گئی، حکیم صاحب اس کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ (۱۳)

مسلم لیگ کے اجلاس سے فراغت پا کر حکیم صاحب واپس دلی آئے۔ کچھ دن دلی میں رہے، پھر رامپور چلے گئے کہ وہاں طبی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر رجسٹریشن ایکٹ کے خلاف آواز بلند کی۔

اب طبیہ کالج کا منصوبہ بھی پروان چڑھنے لگا تھا۔ مارچ ۱۹۱۶ء میں حکیم صاحب

نے کسی نہ کسی طور کالج کے لیے ایک قطعہ اراضی حکومت سے حاصل کر لیا۔ یہ قطعہ اراضی قرول باغ میں تھا۔ ۲۹ مارچ کو لارڈ ہارڈنگ نے قرول باغ پہنچ کر کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔

انہیں دنوں طبیہ کالج کا نصاب بھی تیار ہوا۔ نصاب کے متعلق بھی دو نقطہ نظر تھے۔ قدامت پسند اطبا کہتے تھے کہ یونانی طب اپنی جگہ پر مکمل ہے، اس میں کسی ترمیم و اضافے کی ضرورت نہیں، مگر دوسرا نقطہ نظر یہ تھا کہ مغربی طب نے اس میدان میں جو تحقیقات اور اضافے کیے ہیں، ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔ یہ تو واضح ہو ہی چکا ہے کہ حکیم صاحب موخر الذکر نقطہ نظر کے حامی تھے سو اسی حساب سے نصاب تیار ہوا۔ اگست کے آتے آتے طبیہ کالج کی آیورویدک شاخ بھی قائم ہو گئی۔

جون کے مہینے میں حکیم صاحب دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے اجمیر گئے۔ انہوں نے وہاں اس پر اطمینان کا اظہار کیا کہ مدرسہ نے تصوف کو نصاب تعلیم میں شامل کر رکھا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے مشورہ دیا کہ :

> "یہ علم محض علم کی طرح مدرسہ میں نہ پڑھایا جائے بلکہ اس کی تعلیم ایک ایسی ذات کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے جس کا علم ہمدوش عمل ہو ورنہ صرف تعلیم سے اس کی غایت حاصل نہیں ہو سکتی۔"

ادھر نظارۃ المعارف کی فکر بھی ان کی جان کو لگی ہوئی تھی۔ نظارۃ المعارف کی حیثیت اب مشکوک ہو گئی تھی۔ اسے جاری رکھنا اور اس میں دلچسپی لینا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مگر حکیم صاحب نے انہیں دنوں نظارۃ المعارف کا ایک جلسہ کر ڈالا۔ نظارۃ المعارف کا یہ پہلا جلسہ عام تھا جو ۲۶ جون ۱۹۱۶ء کو منعقد ہوا خود حکیم صاحب نے اس کی صدارت کی اور اعلان کیا کہ :

> "روئے زمین پر کوئی ایسا مسلمان نہیں ہو سکتا جو اغراض و مقاصد نظارہ سے سر مو تجاوز یا انحراف کرے اور پھر وہ اسلام کا دعویٰ بھی کر سکے۔"

ادھر یہ ہوتا تھا، ادھر زمانہ مسلمانوں کے ساتھ ایک نئی چال چل گیا۔ جنگ کا

پانسہ پلٹ گیا۔ انگریز ہارتے ہارتے جیت گیا۔ شریف مکہ حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت ترکوں کو لے بیٹھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ جلسے جلوس شروع ہوگئے۔ ۶ جولائی ۱۹۱۶ء کو دلی کی مسجد فتح پوری میں ایک ہنگامہ خیز جلسہ ہوا۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی تو جیل میں تھے مگر حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری موجود تھے۔ وہ اس جلسہ میں پیش پیش تھے۔

ترک ہارے تو شیخ الہند کے منصوبے پر بھی پانی پھر گیا۔ اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط پکڑے گئے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں شیخ الہند مکہ معظمہ سے گرفتار ہوئے تھوڑے دنوں کے بعد مالٹا بھیج دیئے گئے۔

مسلم لیگ کانگریس سے پہلے ہی قریب آ چکی تھی۔ اس فضا میں مسلمانوں کا پارہ اور چڑھ گیا۔ مسلم لیگ اور کانگریس میں اور قرب پیدا ہوگیا۔ لکھنؤ میں دسمبر میں دونوں جلسے پہلو بہ پہلو ہوئے۔ لیگ کے جلسہ کی صدارت جناح صاحب کر رہے تھے۔ جو لوگ نائب صدر چنے گئے ان میں حکیم صاحب بھی تھے، دیار لکھنؤ پہنچ کر کانگریس اور مسلم لیگ آپس میں بالکل ہی گھل مل گئیں۔ دونوں کے نمائندوں نے آپس میں ایک سمجھوتہ کیا۔ یہ سمجھوتہ میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہوا۔

اب ہندو مسلم اتحاد کی فضا تھی۔ آپس کی رنجشیں دور ہوگئیں تھیں۔ میل جول بڑھتا جا رہا تھا۔ اجلاس لکھنؤ کے بعد یعنی وسط مارچ ۱۹۱۷ء میں جب طبی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کی صدارت پنڈت مدن موہن مالویہ کر رہے تھے اور جب ۲۴ مارچ ۱۹۱۷ء کو مدرسہ طبیہ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو وہاں سر سنکرن نائر صدر تھے۔ حکیم صاحب ہندو مسلم اتحاد کو سیاسی محاذ سے طبی محاذ تک لے گئے تھے۔

حکیم صاحب طبی کانفرنس سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ایک اور خیال دامنگیر ہوا۔ یہ کہ دلی میں ایک اسلامیہ کالج قائم ہونا چاہیے۔ اس خیال نے دیکھتے دیکھتے ایک منصوبے کی شکل اختیار کر لی۔ حکیم صاحب نے اسلامیہ کالج کا خاکہ تیار کیا اور پھر دلی کے سرکردہ مسلمانوں کو قائل کرنا شروع کر دیا ہر دوسرے تیسرے دن شریف منزل میں اس مقصد سے جلسہ ہوتا۔ حکیم صاحب لوگوں کو جمع کرتے، جلسہ کرتے اور خود اس کی کارروائی قلمبند کرتے۔ سرمائے کا تخمینہ ساڑھے چار لاکھ روپے لگایا گیا۔ ڈیڑھ

لاکھ کی رقم تو انھوں نے دیکھتے دیکھتے جمع کر لی بقیہ تین لاکھ کے لیے اپیل جاری کی گئی۔

اسلامیہ کالج کا منصوبہ پروان چڑھنے لگا تھا کہ اضطراب کی ایک نئی لہر اٹھی اور ملک میں پھیلتی چلی گئی۔ مسز اینی بیسنٹ رہا ہوگئی تھیں۔ وہ خاتون جیل سے نکل کر آفت کی پڑیا بن گئی۔ لوگ اپنے مقبول و محبوب رہنماؤں کی نظر بندی پر پہلے ہی کڑھ رہے تھے۔ مسز اینی بیسنٹ نے رہائی کے لیے آواز اٹھائی تو بس لاوا ابل پڑا۔ جلسے جلوس نکلے۔ اینی بیسنٹ وائسرائے سے رہائی کا مطالبہ کرنے کے لیے دلی جا پہنچیں۔ مختلف ممتاز رہنما قرب و دور سے چل کر وہاں پہنچے اور منتظر رہے کہ ملاقات کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ یہ ۱۹۱۷ء کا ذکر ہے نومبر کا مہینہ تھا ۳-۴-۵ نومبر کی تاریخیں تھیں۔ بہت سے قومی رہنما دلی میں اکٹھے تھے۔ کبھی ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر اکٹھے ہوتے، کبھی شریف منزل میں سر جوڑ کر بیٹھتے۔ بس اسی میں ایک انجمن قائم ہوگئی، جس نے انجمن نظربندان اسلام کا نام پایا۔ راجہ محمود آباد صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن سیکرٹری، حکیم صاحب خزانچی۔

اب اسلامیہ کالج کا خیال پیچھے رہ گیا۔ اسلامیہ کالج کے لیے جو چندے وصول ہوئے وہ بھی آخر عطا کرنے والوں کو واپس کر دیئے گئے۔ اب تو بس نظر بندوں کی رہائی کی مہم تھی اور حکیم صاحب تھے۔

نظر بندوں کی رہائی کی مہم نے دلوں کو بہت گرمایا۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں ہی کے جلسوں نے بہت جوش پیدا کیا۔ وہ ۱۹۱۷ء کی آخری تاریخیں تھیں اور کلکتہ شہر تھا۔ پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اگلی پچھلی سب کرسیاں بھری ہوئی تھیں مگر ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ یہ صدارت کی کرسی تھی۔ اس کرسی کے برابر ایک بڑی سی تصویر سجی تھی۔ یہ مولانا محمد علی کی تصویر تھی۔ ایک برقعہ پوش بزرگ بی بی پنڈال میں داخل ہوئیں۔ مجمع میں شور پڑا کہ بی اماں آگئیں اور رئیس الاحرار زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔ یہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی کی بی اماں تھیں کہ تحریک خلافت کے آتے آتے پورے ہندوستان کی بی اماں بن گئیں۔ بی اماں سٹیج پر لا کر بٹھائی گئیں۔ پھر ایک شخص اٹھا اور خالی کرسی کے برابر ایک کرسی پر قائم مقام صدر بن کر بیٹھا اور آغاز کلام یوں کیا

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

یہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس تھا۔ گرم جوشوں نے اپنے سب سے ممتاز نظر بند کو اجلاس کا صدر چنا تھا۔ صدارت کی کرسی خالی تھی اور صدارت کرنے والا چھندواڑے میں نظر بند تھا۔ مگر اس شخص کے سوا بھی بہت سی صورتیں تھیں جنہیں نظریں اس اجلاس میں ڈھونڈ رہی تھیں اور نہیں پا رہی تھیں۔ یہ لوگ یہاں سے دور دور کے شہروں میں قید کے رنج کھینچ رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں پنجاب میں، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی چھندواڑے میں، مولانا حسرت موہانی فیض آباد میں، مولانا ابو الکلام آزاد رانچی میں، اور ان سب سے دور مولانا محمود الحسن مالٹا میں۔ حکیم صاحب نے سٹیج پر آ کر تقریر کی اور نظربندوں کے لیے آواز اٹھائی۔

یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر کانگریس کا اجلاس آراستہ تھا۔ وہاں مسز اینی بیسنٹ صدارت کر رہی تھیں اور نظربندوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں جگہ دل ایک ہی رنگ سے دھڑک رہے تھے اور آوازیں ایک ہی طرح سے اٹھ رہی تھیں، مگر اس کو کیا کہا جائے کہ انہیں دنوں آرہ کے مقام پر ہندو مسلم فساد ہوگیا۔ جس میں مسلمانوں نے جان و مال کا بہت نقصان اٹھایا۔ آرہ سے خبر نکلی اور کلکتہ پہنچی۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک برہمی پیدا ہوئی۔ سوچا جانے لگا کہ اس فساد کی مذمت اور نقصان اٹھانے والے مسلمانوں کی حمایت میں ایک قرارداد اجلاس میں پیش کی جائے۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری نے سر جوڑ کر سوچا کہ کانگریس کے اجلاس میں بھی ایسی ہی قرارداو منظور ہو جائے تو مناسب ہو۔ کانگریس اور مسلم لیگ جب سب قومی معاملات میں ہمنوا ہیں تو اس معاملہ میں بھی انہیں ہمنوا ہونا چاہیے۔ اس مقصد سے مسز اینی بیسنٹ کے مکان پر کانگریسی رہنماؤں کو اکٹھا کیا گیا اور ان کے سامنے یہ تجویز رکھی۔ دو کے سوا سب ہندو رہنماؤں نے تجویز کی مخالفت کی۔ یہ دو شخص تھے گاندھی جی اور سی۔ آر۔ داس (۱۴) تجویز نامنظور ہوئی۔ کانگریس میں اس بارے میں قرارداد پیش نہ ہو سکی۔ مگر مسلم لیگ میں سر رضا علی نے فساد کرنے والے ہندوؤں کی مذمت میں اور نقصان اٹھانے والے مسلمانوں کی حمایت

میں قرارداد پیش کی اور ساتھ ہی کانگریس پر بھی برس پڑے کہ اس نے اس معاملہ میں چپ سادھ لی۔ (۱۵)

مسز اینی بیسنٹ کے گھر پر ہونے والے جلسہ میں گاندھی جی نے جس فراخ حوصلگی کے ساتھ تجویز کی حمایت کی تھی اس نے حکیم صاحب کو بہت متاثر کیا۔

وہاں سے واپس ہوئے تو ڈاکٹر انصاری سے کہا کہ یہ شخص راست باز اور اولوالعزم ہے۔ (۱۶) ڈاکٹر انصاری نے تو یہی لکھا ہے کہ "اس جلسہ میں ان سے (گاندھی جی) پہلی ملاقات ہوئی۔ () مگر گاندھی جی کا بیان مختلف ہے۔ "مجھے ۱۹۱۵ء سے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔" (۱۷)

گاندھی جی سے حکیم صاحب کی ملاقات ۱۹۱۵ء سے چلی آتی تھی مگر بس دور دور کی ملاقات تھی۔ مسز اینی بیسنٹ کے گھر پر جو ملاقات ہوئی وہ بھی بس دور کی ملاقات تھی کہ ایک جلسہ میں دونوں شریک تھے۔ اس کے چند ماہ بعد ایک جلسہ میں پھر ان دونوں کی مڈبھیر ہوئی۔ مگر یہاں بھی وہ ایک دوسرے کے قریب نہیں آئے۔ ایک اجلاس تھا جو لارڈ چیمسفورڈ نے جنگ میں ہندوستانی رہنماؤں کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے بلایا تھا۔ یہ اجلاس دلی میں ۲۷ اپریل ۱۹۱۸ء کو ہوا۔ گاندھی جی اور حکیم صاحب دونوں اس میں مدعو تھے۔

گاندھی جی نے اس اجلاس کی یادداشت یوں قلمبند کی:

"میں دلی گیا مگر اجلاس میں شرکت پر مجھے اعتراضات تھے۔ ایک اعتراض تو یہی تھا کہ اس کانفرنس میں علی برادران مدعو نہیں تھے۔ وہ اس وقت جیل میں تھے۔ میں ان سے بس ایک یا شاید دو دفعہ ملا تھا' یہ الگ بات ہے کہ ان کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ حکیم اجمل خاں سے بھی ابھی میرا زیادہ قرب نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ پرنسپل اور چارلی اینڈریو نے مجھ سے ان کی بہت تعریفیں کی تھیں۔" (۱۸)

بہرحال اس میٹنگ میں گاندھی جی بھی شریک ہوئے اور حکیم صاحب بھی۔ اس کے بعد مئی میں حکیم صاحب بمبئی چلے گئے کہ وہاں طبی کانفرنس ہو رہی تھی۔ واپس دلی آئے تو یہاں اور ہی گل کھلا دیکھا کہ حکیم محمد احمد خاں نظر بند ہیں۔ آخر کس خطا میں؟ حکیم عبدالمجید خاں کے بیٹے حکیم محمد احمد خاں صرف اور محض حکیم تھے۔

سیاسی معاملات و مسائل میں چچا کو الجھا ہوا دیکھتے تھے اور بے مزہ ہوتے تھے۔ خود اس قصے سے بے تعلق بلکہ بے خبر تھے۔ انہیں تو اخبار تک پڑھنا گوارا نہ تھا۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ اس وقت ملک میں کیا قصے چل رہے ہیں اور سرحدی علاقہ میں جانے کے اس وقت کیا معنی ہیں۔ اس علاقے سے ایک مریض کی طرف سے بلاوا آیا، وہ اپنی بے خبری میں حکومت سے اجازت لیے بغیر وہاں جا پہنچے۔ حکومت کا ماتھا ٹھنکا کہ حکیم اجمل خاں کا بھتیجا سرحدی علاقہ میں کیوں گیا ہے۔ بس اسی بنا پر حکیم محمد احمد خاں کی نقل و حرکت مشکوک ٹھہری۔ چھ ماہ کے لیے انہیں دلی میں نظربند کر دیا گیا۔

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ دلی میں انفلوئنزا کی وبا پھوٹ پڑی۔ حکیم صاحب اس وبا سے نبٹنے کے لیے مستعد ہوگئے۔ طبیہ کالج کے فارغ التحصیل طلبہ اور اہل خاندان کو اکٹھا کیا۔ انفلوئنزا کے بارے میں انہیں ایک لیکچر دیا، اس مرض کی کیفیت سمجھائی، ہدایات دیں اور مہم پر رخصت کیا۔ یہ طلبہ دلی کے محلوں میں پھیل گئے اور انفلوئنزا کے مریضوں کا رضاکارانہ علاج کرنے لگے۔

مولانا سید ابوالخیر مودودی کہ اس مہم میں شریک تھے اور کوچہ پنڈت کے طبی مرکز میں تعینات تھے، بتاتے ہیں کہ دلی کے ہر محلہ میں ایک طبی مرکز قائم کیا گیا تھا ہر مرکز میں ایک طبیب تعینات تھا۔ یہ طبیب محلّہ کے مریضوں کو دیکھنے کے لیے اس رنگ سے نکلتا کہ دواؤں سے بھرے دو ٹوکرے ساتھ ہوتے ایک عطار ہمراہ ہوتا۔ مریض کو دیکھنے کے بعد نسخہ تجویز کیا جاتا، ٹوکرے میں سے دوائیں دی جاتیں، مگر ایسے بھی بیکس مریض تھے کہ جن کا کوئی تیمار دار نہ تھا۔ وہاں عطار خود دواؤں کو جوش دیتا اور مریض کو پلاتا۔ اس علاج کی کوئی فیس نہیں تھی اور دواؤں کی کوئی قیمت نہیں لی جاتی تھی۔

انفلوئنزا کے ان مریضوں کے لیے بالعموم یہ نسخہ تجویز کیا جاتا تھا--- عناب ۵ دانے، سپستان ۷ دانے، بیدانہ ۳ ماشے، خاکسی ۳ ماشے۔ طریق استعمال یہ تھا کہ ایک پیالی بھر پانی میں انہیں ہلکا جوش دیا جاتا، بقدر ضرورت قند سپید حل کی جاتی اور صبح و شام دو وقت پلایا جاتا۔ مریض کو ہدایت کی جاتی کہ نسخہ پینے کے بعد پانچ چھ منٹ تک اپنے آپ کو ہوا سے محفوظ رکھے۔

اس نسخہ نے بہت مریضوں کو شفا بخشی۔ محلّہ محلّہ طبی مرکزوں نے سرگرمی سے کام کیا اور حکیم صاحب اپنی مہم میں سرخرو ہوئے۔

اب ۱۹۱۸ء ختم ہو رہا تھا۔ دلی پھر ہندو، مسلم رہنماؤں کا مرجع بننے کو تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے سالانہ اجلاس اس برس دلی ہی میں منعقد ہونے تھے۔ حکیم صاحب کانگریس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ سو انہیں مصروف ہونا ہی تھا۔ ستمبر سے اجلاس کی تیاریاں شروع ہوئیں اور دسمبر تک جاری رہیں۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۱۸ء کو اجلاس شروع ہوا۔ حکیم صاحب طبی محاذ سے یہاں بھی غافل نہیں تھے۔ طبیبوں اور ویدوں کے مسئلہ کو وہ کانگریس میں لے آئے تھے۔ کانگریس کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ آیور ویدک اور یونانی طب کی حمایت میں یہاں قرارداد منظور ہوئی۔

انہیں تاریخوں میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی ہو رہا تھا۔ حکیم صاحب کا ایک پاؤں کانگریس میں تھا، دوسرا پاؤں مسلم لیگ میں۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں پہنچ کر انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور دوسرے نظر بندوں کی رہائی کی قرارداد پیش کی۔ (۱۹) ادھر کانگریس میں علی برادران کی رہائی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اسی مطالبہ کے ساتھ یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ایک وفد انگلستان بھیجا جائے۔ حکیم صاحب مجوزہ وفد کے رکن منتخب ہوئے۔

کانگریس اور لیگ کے جلسوں سے فراغت پاتے ہی حکیم صاحب طبی محاذ پر سرگرم ہوگئے۔ طبی محاذ کو وہ کانگریس میں لے گئے تھے۔ اب کانگریسی رہنماؤں کو وہ طبی محاذ پر لے آئے۔ ۱۹۱۹ء کے آغاز کے ساتھ دلی میں طبیبوں اور ویدوں کا اجتماع ہوا تو اس میں پنڈت مدن موہن مالویہ بھی شریک تھے۔

حکیم صاحب دلی کے جلسہ سے نبٹ کر کراچی پہنچے کہ وہاں طبی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ یہ کانفرنس ۲۱ فروری ۱۹۱۹ء کو ہوئی۔ حکیم صاحب نے اس کی صدارت کی۔

طبی کانفرنس سے فارغ ہو کر حکیم صاحب کراچی سے دلی پہنچے۔ مگر ادھر وہ دلی پہنچے اور ادھر زمانے کا رنگ کچھ سے کچھ ہوگیا۔ رولٹ بل لیجسلیٹو کونسل میں پیش ہوچکا تھا۔ اضطراب کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ ہنگامے کے آثار تھے۔ گاندھی جی نے اعلان کر دیا تھا کہ یہ کالا قانون پاس ہوگیا تو ستیہ گرہ شروع ہوگی۔ دھمکیاں، اعلانات، مذاکرات،

صلاح مشورے، سب کچھ ہوا مگر کالے قانون کو نہ رکنا تھا نہ رکا۔

۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو رولٹ ایکٹ پاس ہوگیا۔ بس پھر کیا تھا' قیامت ہی تو آ گئی۔ گاندھی جی نے اعلان کر دیا کہ ۳۰ مارچ سے ہڑتال ہوگی۔

گاندھی جی کا اعلان طوفان خیز ثابت ہوا۔ طوفان دوسرے شہروں میں بعد میں آیا' پہلے دلی میں امنڈ پڑا۔ وجہ یہ ہوئی کہ ہڑتال کی تاریخ بعد میں ۳۰ مارچ سے بدل کر ٦ اپریل رکھی گئی، مگر کچھ تو اطلاع پہنچنے میں تاخیر ہوئی' کچھ دلی شہر عجلت پسند نکلا کہ جو طوفان باقی ہندوستان میں ٦ اپریل کو آیا وہ دلی میں ۳۰ مارچ ہی کو پھٹ پڑا۔

بازار بند' دکانیں مقفل' سواری کے نام نہ ٹریموے نہ موٹر کار نہ تانگے۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں سنسان' چاندنی چوک ویران' نہ ہزاری نہ بزاری نہ البلے گہلے پھرتے چھیل چھبیلے۔ بس جلوس نکلتے تھے اور نعرے لگتے تھے۔ مدت بعد دلی نے پھر کروٹ لی تھی۔ اس شہر میں فرنگی کا راج آج پھر معطل ہوگیا تھا۔ ایک حکیم اور ایک سوامی مل کر شہر پر راج کر رہے تھے۔ بقول گاندھی جی "اس شہر میں سوامی شردھانند اور حکیم اجمل خان کے منہ سے نکلی بات قانون کی حیثیت رکھتی تھی۔ دلی میں اب سے پہلے کبھی ایسی ہڑتال نہیں ہوئی تھی۔" (۲۰)

حکیم صاحب اور سوامی جی ایک جان دو قالب بنے ہوئے تھے۔ اکٹھے گشت پر نکلتے تھے۔ ہندو مسلمان باہم شیر و شکر تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے پانی پینا شروع کر دیا تھا۔ مسلمان سوامی جی سے اتنے خوش ہوئے کہ انہیں جامع مسجد میں لے گئے۔ سوامی جی نے شاہجہانی مسجد میں کھڑے ہو کر مسلمانوں کو خطاب کیا۔

حکیم صاحب اور سوامی جی دونوں نے بہت کوشش کی کہ احتجاج پرامن رہے' مگر پیمانہ لبریز تھا' پہلے ہی دن چھلک پڑا۔ ہڑتال ۳۰ مارچ کو شروع ہوئی اور ۳۰ مارچ ہی کو گولی چل گئی۔ گاندھی جی دلی کی طرف کوچ کر چکے تھے مگر رستے ہی میں گرفتار ہوگئے۔ ادھر امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں قیامت گزر گئی۔ دونوں خبریں دلی پہنچیں۔ دلی کا پارہ اور چڑھ گیا۔

حکیم صاحب کے پیروں میں پہیے لگ گئے تھے۔ کبھی شہر کے اس کنارے کبھی اس کنارے۔ مطب موقوف، مدرسہ طبیہ بند، حکیم کا ہاتھ اب شہر کی نبض پر تھا اور شہر

کی نبض تیز چل رہی تھی۔ گڑبڑ کبھی ایک کوچے میں کبھی دوسرے کوچے میں۔ حکیم صاحب اپنے رضا کاروں کے ساتھ مستعد رہتے۔ جس علاقے سے خرابی کی خبر آتی وہاں بھاگم بھاگ پہنچتے۔

حکیم صاحب کی یہ دوڑ دھوپ شاید محض ہنگامی صورت حال کے دباؤ کا نتیجہ نہیں تھی۔ بات یہ ہے کہ اس شہر نے بہت خون خرابے دیکھے تھے۔ کتنی بار اس کے کوچوں میں خون کی ندیاں بہیں، کتنی بار شہر برباد ہوا۔ بسنا، بس کر اجڑنا جیسے اس شہر کے مقدر میں لکھا گیا تھا۔ حکیم صاحب اس شہر کے مقدر سے ڈرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں تجربے کو اور لوگ بھول سکتے تھے، حکیم صاحب نہیں بھول سکتے تھے کہ شریف منزل کے کنویں میں وہ امانتیں ابھی تک محفوظ تھیں جن کے مالک شہر سے ایسے نکلے کہ پھر واپس نہیں آئے۔ حکیم محمود خان نے دلی والوں کی امانتیں رکھی تھیں۔ حکیم اجمل خان کی امانت میں پوری دلی تھی۔ ان کی کوشش تھی کہ امانت پر آنچ نہ آئے۔ حاکموں سے شہر بیزار تھا۔ اس نے محلّہ محلّہ سے نمائندے چن کر اپنی ایک پنچایت بنائی تھی اور اس پنچایت نے حکیم اجمل خان کو اپنا صدر چنا تھا۔ ایک صدر پانچ اس کے معاون، یہ پنچ شہر کے امن و امان کے ذمہ دار بنے ہوئے تھے۔

جلیانوالہ باغ کے سانحہ سے چیف کمشنر صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ دوسرے ہی دن انہوں نے دلی کے پنچوں اور مُڈھوں کو اکٹھا کیا۔ ٹاؤن ہال میں یہ اجتماع ہوا۔ سوامی شردھا نند بھی گئے اور حکیم اجمل خاں بھی پہنچے۔ لوگوں کے کان میں بھنک پڑ گئی۔ وہ بھی موج در موج وہاں پہنچے۔ شہر میں یہ اڑ گئی تھی کہ ٹاؤن ہال میں پہنچنے والے رہنما وہیں دھر لیے جائیں گے۔ بس پھر کیا تھا، ٹاؤن ہال کا محاصرہ ہوگیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے بالاخر حکیم صاحب سے گزارش کی کہ حکیم صاحب آپ باہر جائیں اور انہیں سمجھائیں۔ حکیم صاحب باہر نکلے۔ آگ بگولا مجمع دم کے دم میں پانی ہوگیا۔ کہاں لوگ ٹاؤن ہال پر یلغار کر رہے تھے کہاں اب وہ حکیم صاحب کو اپنے حلقہ میں لیے شریف منزل کی طرف رواں تھے۔

اسی شام کو ایڈورڈ پارک میں ایک جلسہ ہوا۔ مجمع تو بپھرا ہوا تھا ہی کہیں ایک سی آئی ڈی انسپکٹر اور ایک ہیڈ کانسٹیبل اس کے ہتھے چڑھ گئے۔ مجمع ان پر پل پڑا۔ لیجیے

اب ذمہ داریوں میں ایک اور اضافہ ہوگیا۔ حکیم صاحب کے لیے اب ان کی دیکھ بھال کے لیے بھی وقت نکالنا ضرور تھا۔ روز ہسپتال جانا اور ان دونوں مجروحین کی مزاج پرسی کرنا۔ ان میں جو شخص انسپکٹر تھا وہ حکیم صاحب ہی پر مہینوں مامور رہ چکا تھا لیکن اس کا فعل اس کے ساتھ، حکیم صاحب اپنا فرض نبھا رہے تھے۔ یہ شخص اپنے محکمہ میں معتوب ہوا۔ کارکرگی میں بھونڈے پن کا مرتکب قرار پایا اور نوکری سے نکالا گیا۔ نوکری سے نکل کر اس نے شریف منزل کا رخ کیا۔ کئی مہینے تک حاضری دیتا رہا۔ حکیم صاحب نے ایک روز خاموشی سے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اس میں ایک معقول رقم تھی۔ اس نے اس رقم سے کاروبار شروع کیا اور نئی زندگی کا آغاز کیا۔

خیر تو ایڈورڈ پارک میں جو ہوا سو ہوا۔ اگلے دن یوں سمجھو کہ ۱۵ اپریل کو سوامی شردھانند اور حکیم صاحب شہر کے گشت پر نکلے۔ دونوں دکانداروں کو سمجھاتے بجھاتے پھرتے تھے کہ بھائی بہت ہوگئی، اب دکانیں کھول لو، سوامی شردھانند قصابوں کے پاس گئے کہ دوستو تم اپنے کاروبار سے لگو۔ قصابوں نے سوامی جی کی اپیل مانی اور جانور ذبح کر کے دکانوں پر آ بیٹھے۔ اس سے اگلے دن چاندنی چوک کی دکانیں کھلنے لگی تھیں مگر کھلتے کھلتے پھر بند ہوگئیں کہ ڈپٹی کمشنر صاحب چاندنی چوک میں آ پہنچے تھے اور انہیں دیکھ کے لوگوں کا پارہ پھر چڑھ گیا تھا۔

حکیم صاحب کے دیوان خانے میں دلی کے مُڈھ اور پنچ جمع تھے اور مشورے ہو رہے تھے۔ ان مشوروں میں دن سے رات ہوئی اور آدھی رات گزر گئی۔ تب ڈپٹی کمشنر کی طرف سے ایک پیغام موصول ہوا کہ امن و امان قائم کرنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ سوامی شردھانند اس وقت گھر جا چکے تھے۔ پنچوں کا قافلہ شریف منزل سے نکل کر سوامی جی کے گھر پہنچا اور یہ پیشکش ان کے سامنے رکھی۔ سوامی جی سے صلاح مشورے ہوئے اور پھر جواب بھجوایا گیا کہ حکام اگر دخل اندازی نہ کریں تو یہ فریضہ انجام دیا جاسکتا ہے۔ حکام اس وقت تو رضامند ہوگئے اور اگلے دن پنچوں کے کہنے سننے سے بازار واقعی کھل گئے۔ مگر ادھر بازار کھلے اور ادھر پولیس آن دھمکی۔ بازار پھر بند ہونے لگے۔ پولیس نے ایک نوجوان کو کہ دکانیں بند کرانے میں پیش پیش تھا پکڑ لیا۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری ٹاؤن ہال پہنچے اور ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ اس نوجوان کو

چھوڑ دو۔ مگر ڈپٹی کمشنر کی رگ حاکمیت پھڑکی ہوئی تھی، کہا کہ یہ حکومت کے وقار کا مسئلہ ہے، مگر مسئلہ تو دلی والوں کے وقار کا بھی تھا۔ دیکھتے دیکھتے ٹاؤن ہال کے سامنے مجمع جمع ہوگیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ گولی چل گئی۔ بہت سے زخمی ہوئے۔

اگلے دن پھر دلی شہر پھٹ پڑا تھا۔ زخمیوں میں سے ایک شخص اللہ کو پیارا ہوچکا تھا۔ پچاس ہزار سوگواروں نے اس کی میت کو کاندھا دیا۔ شہر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

دلی نے تین ہفتے اسی رنگ سے گزارے۔ دلی نے بھی اور حکیم صاحب نے بھی۔ دونوں کے معمولات تلپٹ ہوگئے تھے۔ جس دیوان خانے کی وضع یہ تھی کہ دن دن سیاسی رہنما، رات کو شعر و شاعری اور علم و ادب سے شغف رکھنے والے یاروں کی محفل۔ اب اسی دیوان خانے میں سیاسی رہنما دن دن بھر، اور رات رات بھر جمع بیٹھے رہتے۔ پہلے مطب موقوف ہوا۔ پھر اس کا نقشہ یہ ٹھہرا کہ مریض اور قومی رضا کار رلے ملے بیٹھے ہیں۔ مریضوں کی بھی نبض دیکھی جا رہی ہے اور شہر کی نبض پر بھی ہاتھ ہے۔ مریض اپنا حال بیان کر رہے ہیں، قومی رضا کار شہر کا حال بتا رہے ہیں۔ بدامنی کی کوئی اطلاع موصول ہوئی اور حکیم صاحب نے مطب کو چھوڑ چھاڑ جائے واردات کا رخ کیا اور اطلاعات کا تانتا تو بندھا ہی رہتا تھا۔ سو نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ کھانا کھایا، کھایا نہ کھایا۔ رات کو گھڑی، دو گھڑی کے لیے جھپکی لی اور پھر مستعد۔

حواشی

۱۔ کابل میں سات سال، ص ۱۰۴

۲۔ کابل میں سات سال، ص ۱۰۵

۳۔ کابل میں سات سال، ص ۱۰۵

۴۔ کابل میں سات سال، ص ۴۸

۵۔ آپ بیتی (حصہ اول) ظفر حسن ایبک، ص ۹۲

۶۔ شاہراہ پاکستان، ص ۲۹۴

۷- کابل میں سات سال، ص ۲۴-۲۵
۸- لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی، ص ۱۷۴
۹- لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی ص ۱۷۴
۱۰- رولٹ رپورٹ بحوالہ لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی، ص ۱۷۶
۱۱- نقش حیات- ص ۲۲۱- تا ۲۲۳
۱۲- ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں- ص ۱۰۷
۱۳- محمد علی جناح اے پولیٹکل سٹڈی- ص ۶۴
۱۴- فاؤنڈیشنز آف پاکستان، ص ۳۵۶
۱۵- یادداشت ڈاکٹر انصاری بحوالہ حیات اجمل، مرتبہ قاضی عبدالغفار ص ۱۷۲
۱۶- محمد علی جناح، اے پولیٹکل سٹڈی، ص ۸۴
۱۷- یادداشت ڈاکٹر انصاری بحوالہ حیات اجمل مرتبہ قاضی عبدالغفار، ص ۱۷۲
۱۸- یادداشت ڈاکٹر انصاری بحوالہ حیات اجمل مرتبہ قاضی عبدالغفار، ص ۱۷۲
۱۹- مہاتما گاندھیز آئیڈیاز (مکتوب بنام حکیم اجمل خان) ص ۳۷۰
۲۰- مہاتما گاندھی، ہزاون سٹوری- ص ۲۸۲
۲۱- فاؤنڈیشنز آف پاکستان ص ۵۹۷
۲۲- مہاتما گاندھی، ہزاون سٹوری، ص ۳۰۰

تحریک خلافت کا زمانہ

اب صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ حکیم صاحب زنان خانے سے نکلے اور مطب کی طرف چلے۔ خاندان کی ایک بڑی بی نے ٹوکا۔۔ "اجن میاں، تمہارے بڑے اس وقت مطب سے فراغت پا لیا کرتے تھے۔"

حکیم صاحب نے تامل کیا، پر کچھ افسردہ سے معذرت بھرے لہجہ میں کہا "اماں بی، آپ بجا فرماتی ہیں، مگر کیا کروں صحت جواب دیتی جا رہی ہے اور آنے والوں کا تانتا رات کے دو بجے تک بندھا رہتا ہے۔ اب سویرے اٹھا نہیں جاتا۔"

وہ شخص جو تاروں کی چھاؤں میں مسجد پہنچتا اور فریضہ سحری ادا کر کے سیدھا مطب میں آ بیٹھتا، اب دن چڑھے اٹھتا اور نو بجے کے بعد مطب شروع کرتا۔ صحت گرتی جا رہی تھی اور مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان دنوں یہ عالم تھا کہ رات کو جمنے والی یاروں کی محفل موقوف تھی۔ قومی رہنما آدھی آدھی رات تک جمے بیٹھے رہتے۔ مشورے ہوتے، مسکوٹیں ہوتیں۔ حکیم صاحب رات گئے سوتے اور دن چڑھے اٹھتے۔ مگر مطب اب بھی اپنا پورا وقت لیتا، بس اوقات کسی قدر بدل گئے تھے۔ آگے مطب ساڑھے پانچ بجے شروع ہوتا اور دس بجے تک جاری رہتا۔ اب ساڑھے نو بجے شروع ہوتا اور دو بجے تک جاری رہتا۔ آگے نہار منہ مطب میں جا کر بیٹھتے اور دس بجے فراغت پانے کے بعد نوالہ توڑتے، اب مطب کے دوران چائے پینے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ کھانے کے اوقات بھی بدل گئے تھے۔ رات کا کھانا تو ہمیشہ ہی بے وقت کھایا۔ وہی طور چلا آتا تھا کہ جب ملاقاتی رخصت ہوگئے تو زنان خانے میں دبے پاؤں گئے گنجینہ کھول کر روٹی سالن نکالا اور بغیر گرم کیے اکیلے بیٹھ کر کھا لیا۔

وضع قطع بھی اچھی خاصی بدل گئی تھی۔ بر میں اب انگرکھے کی جگہ شیروانی

تھی۔ حکیم اجمل خاں کی شیروانی، خاندان شریفی کی پہلی شیروانی تھی۔

پگڑی تو پہلے ہی رخصت ہوچکی تھی، اس کی جگہ ترکی ٹوپی نے لے لی تھی، پھر ترکی ٹوپی کا رواج بھی کم ہوگیا۔ کانگریسیوں میں گاندھی کیپ مقبول ہوچکی تھی، گاندھی کیپ کا نام حکیم اجمل خاں نے تجویز کیا تھا اور یہ کشتی نما ٹوپی بھی حکیم اجمل خاں کی اختراع تھی۔ دیوان خانے میں احباب جمع تھے، ٹوپی زیر بحث تھی حکیم اجمل خان اس وقت سیاہ مخمل کی رامپوری ٹوپی پہنے ہوئے تھے وہ ٹوپی اتار کر احباب کے درمیان میں رکھی اور کہا اگر اس انداز کی ٹوپی کھدر کی بن جائے تو کیسی رہے گی، سب نے اتفاق کیا۔ اتفاق کرنے والوں میں مہاتما گاندھی بھی شامل تھے اس طرح دراصل ''اجمل کیپ'' نے ''گاندھی کیپ'' کے نام سے رواج پکڑا۔

سواری البتہ وہی پچھلے انداز کی تھی، وہی دو گھوڑوں والی فٹن اور وہی کوچوان واجد علی کہ شروع زمانے سے چلا آ رہا تھا۔

امرتسر میں جو قیامت گزرنی تھی گزر چکی تھی۔ دلی میں بھی اب امن تھا، مگر مسلمان مضطرب تھے۔ یہ اضطراب ترکی کے لیے تھا جس کی سالمیت خطرے میں تھی۔ مسلمان رہنماؤں نے آپس میں صلاح مشورے کیے اور خلافت کے مسئلہ کو موضوع بناکر ایک کل ہند کانفرنس کی طرح ڈالی گئی۔ داعیوں میں چار شخص پیش پیش تھے، مولانا عبدالباری، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور آصف علی، دعوت نامے ہندو رہنماؤں کو بھی بھیجے گئے۔ گاندھی جی بیان کرتے ہیں کہ ''مسئلہ خلافت پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کانفرنس کی ٹھہری۔ مجھے بھی عمومی دعوت نامہ موصول ہوا۔ دستخط کرنے والوں میں حکیم اجمل خان اور آصف علی بھی شامل تھے۔ لکھا تھا کہ سوامی شردھانند بھی شرکت کریں گے۔ مزید لکھا تھا کہ مسئلہ خلافت ہی پر نہیں گائے کے مسئلہ پر بھی بات چیت ہوگی۔ ''گائے کا حوالہ گاندھی جی کو کچھ بھایا نہیں۔'' گئو رکھشا کا حوالہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے سوامی شردھانند جی سے بات کی۔ پھر حکیم جی سے تبادلہ خیال کیا اور بحث کی کہ اگر خلافت کا مسئلہ جائز اور برحق ہے جو میری دانست میں ہے اور اگر حکومت نے ناانصافی کی ہے تو ہندوؤں کو مسلمانوں کا ساتھ بہرصورت دینا چاہیے۔ گائے کا سوال درمیان میں لانا جائز نہیں۔'' [1]

گاندھی جی ان دنوں کتنے وسیع الظرف تھے۔ ادھر مسلمان بھی عالی ظرفی کا مظاہرہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ دلی میں جو مسلمان سوامی شردھانند کو جامع مسجد کے اندر لے گئے تھے وہ اب اس سے بڑھ کر میل جول کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔

مختلف صوبوں میں خلافت کمیٹیاں پہلے ہی قائم ہو چکی تھیں۔ دلی کی خلافت کمیٹی کے صدر حکیم صاحب تھے۔ اس کمیٹی کے زیر اہتمام دلی میں کل ہند خلافت کانفرنس ۲۳ اور ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو منعقد ہوئی۔

۲۳ نومبر کو اے کے فضل الحق نے صدارت کی۔ اس اجلاس میں بہت گرم گرم تقریریں ہوئیں۔ ایک قرارداد منظور ہوئی کہ حکومت سے اس وقت تک تعاون روا نہ رکھا جائے جب تک وہ خلافت اور مقامات مقدسہ کے معاملہ کا فیصلہ مسلمانوں کی خواہشات کے مطابق نہ کرے۔ ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی کہ وہ عدم تعاون کے مسئلہ کا مفصل جائزہ لے اور موثر اقدامات تجویز کرے۔ اس کمیٹی کے کارکن سید حسین، فضل الحق، مولانا عبدالباری اور حکیم اجمل خاں منتخب ہوئے۔ (۲)

اس کانفرنس میں گاندھی جی بھی شریک تھے اور سوامی شردھانند بھی۔ ۲۴ تاریخ کے اجلاس کی صدارت گاندھی جی نے کی۔ گاندھی جی نے تو کہہ دیا تھا کہ گائے کے مسئلہ کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے، مگر مسلمان رہنما بہرحال اس مسئلہ کو زیر بحث لائے اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ گائے کی قربانی سے اجتناب کرو۔

اس طور ہندوستان کی سیاست میں خلافت کے مسئلہ کے ساتھ ساتھ گائے بھی داخل ہو گئی۔ مگر گاندھی جی کہتے تھے کہ خلافت بھی ایک گائے ہے، یہ مسلمانوں کی مقدس گائے ہے۔ گاندھی جی مسلمانوں کی مقدس گائے کی حمایت پر کمربستہ تھے۔ مسلمانوں نے بھی گاندھی جی کی گئو ماتا کے تحفظ کا بیڑا اٹھا لیا۔ رب کا شکر بیشک ادا کرنا چاہیے کہ اس نے گائے بنائی۔ مگر گائے نے ہندوستان میں فضیحتے بھی بہت کرائے ہیں۔ گائے کی قربانی کے سوال پر آج اس شہر میں جھگڑا کل اس شہر میں خون خرابا۔ حکیم صاحب نے سوچا کہ اس روز روز کی تکا فضیحتی کو ختم کیا جائے، اور اسے ختم کرنے کے لیے اس سے بہتر وقت نہیں آئے گا۔ وہ گائے کی حمایت میں آواز اٹھاتے ہوئے خلافت کانفرنس سے اٹھے اور مسلم لیگ کے اجلاس تک پہنچے۔ ایک ہی ماہ بعد تو مسلم

لیگ کا اجلاس ہونا تھا، اس شہر میں جہاں جنرل ڈائر نے ایک خلقت کو بھون ڈالا تھا۔

جنرل ڈائر کوس "لمن الملکی" بجا چکا۔ اب پامال خلقت سر اٹھا رہی تھی اور حریت پسند اکٹھے ہو رہے تھے۔ ۱۹۱۹ء کی آخری تاریخوں میں امرتسر میں تین اجلاس پہلو بہ پہلو منعقد ہوئے۔ مسلم لیگ کا اجلاس، کانگریس کا اجلاس، خلافت کانفرنس کا اجلاس مسلم لیگ کے اجلاس میں اس برس حکیم صاحب صدارت کر رہے تھے۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے پنڈال پاس پاس لگے تھے۔ خلافت کانفرنس نے کانگریس کے پنڈال ہی میں اپنا ڈیرا جمایا۔ جب اس کا جلسہ ختم ہوا تو اپنا جلسہ شروع کردیا۔ کانگریس کے اجلاس میں آج کیسی کیسی شخصیت اکٹھی تھی۔ مسز اینی بیسنٹ طول میں کم عرض میں زیادہ۔ بڑھاپا آ چکا تھا مگر آواز میں وہی جوانی والا جوش تھا۔ مسٹر جناح دبلے پتلے دراز قد سٹیج پر آئے اور روانی کے ساتھ انگریزی میں تقریر کی۔ گاندھی جی چادر اوڑھے سٹیج پر نموار ہوئے۔ کرسی پر بیٹھ کر تقریر کی۔ تقریر کیا کی، باتیں کیں۔

ادھر مسلم لیگ کے اجلاس میں حکیم صاحب کرسی صدارت پر بیٹھے تھے پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دفعتاً باہر ایک شور اٹھا۔ دو قیدی رہا ہو کر ابھی ابھی شہر میں داخل ہوئے تھے۔ یہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تھے کہ چھندواڑہ جیل سے چھوٹتے ہی امرتسر کے لیے چل پڑے۔ رستے میں جس جس شہر سے گزرے، وہاں پورا شہر اسٹیشن پر امنڈ پڑا۔ اب امرتسر کی خلقت امنڈی ہوئی تھی۔ علی برادران آگے آگے جلوس پیچھے پیچھے۔ پہلے کانگریس کے اجلاس میں جھانکا، پھر مسلم لیگ کے اجلاس کا رخ کیا۔ اجلاس میں یکایک ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی۔ حکیم صاحب نے اعلان کیا کہ صاحبو، ضبط سے کام لو۔ آنے والوں کو سلیقہ سے خوش آمدید کہو۔ یہ کہتے تھے کہ پنڈال کی دائیں جانب سے مولانا عبدالباری، ڈاکٹر انصاری اور مولانا حسرت موہانی دونوں بھائیوں کو اپنے حلقے میں لیے نمودار ہوئے۔ نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔

ایک بھائی کرسی صدارت کے دائیں، دوسرا بھائی بائیں اور حکیم صاحب نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ صاحبو، ہمارے محبوب رہنماؤں محمد علی شوکت علی کو مبارکباد دینے کے لیے ڈاکٹر اقبال صاحب تشریف لائے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر پنڈال نعرۂ تکبیر کے شور سے گونج اٹھا۔ علامہ اقبال اسٹیج پر نمودار ہوئے اور خراج تحسین پیش کیا:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک آخر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام قفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
این سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

پھر حکیم صاحب کھڑے ہوئے۔ ان محبوب رہنماؤں کا خیر مقدم کیا اور کہا، ”گورنمنٹ کے شاہی اعلان کے مطابق ان کی جو رہائی عمل میں آئی ہے، اس کے لیے ہم حکومت کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں، اس لیے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی پیہم درخواستوں، میموریل اور عرضداشتوں پر گورنمنٹ ان کو چھوڑ دیتی تو مسلمان سچے دل سے اور مناسب طریقے سے شکریہ ادا کرتے مگر جب مسلمان اپنی التجاؤں میں ناکامیاب رہے اور رنج و غصے کی وجہ سے خاموش ہوگئے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ ان کی درخواستیں پامال کر دی گئیں، ان کی عرضداشتوں پر کوئی توجہ نہیں کی گئی تو انہوں نے اپنی جبین نیاز کو احکم الحاکمین کے آگے خم کیا اور اپنی کوششوں کو خدا کی رضا پر چھوڑ دیا۔“

حکیم صاحب نے ایک صدارت نبٹائی اور پھر دوسری صدارت کا فریضہ انجام دینے کے لیے چلے۔ خلافت کانفرنس کی صدارت بھی تو انہیں ہی کرنی تھی۔ ادھر مولانا محمد علی جلسہ جلسہ تقریر کرتے چلے جا رہے تھے۔ جیل سے بھرے ہوئے آئے تھے، آتے ہی کانگریس کے اجلاس میں ابل پڑے۔ پھر مسلم لیگ کے اجلاس میں پہنچ کر گرجے برسے، پھر خلافت کانفرنس میں پہنچ کر نعرہ زن ہوگئے اور خلافت کانفرنس تو جیسے ان دونوں بھائیوں کی منتظر تھی۔ وہ بس آئے اور خلافت تحریک کے ساتھ شیر و شکر ہوگئے۔

یہ دونوں بھائی کیا تھے اور کیا ہوگئے۔ مسٹر شوکت علی ڈاڑھی صاف لمبی لمبی

مونچھیں، سوٹ بوٹ پہنتے تھے اور کرکٹ کھیلتے تھے۔ بھاری بھرکم جثہ، لمبا قد، روشن پیشانی۔ افیون کے محکمے میں افسر تھے۔ پھر ایسی کایا کلپ ہوئی کہ نوکری چھوڑی، خادم کعبہ بنے، پھر خلافتیے بن گئے، سوٹ بوٹ کو سلام کیا۔ مونچھیں مختصر کیں اور ڈاڑھی چھوڑ دی، کرکٹ سے کنارہ کیا اور قومی سیاست میں سر دھڑ کی بازی لگائی۔ رہا ہو کر امرتسر پہنچے تو جھٹ پٹ خلافت کمیٹی کے سیکرٹری چنے گئے۔ یہ مرتبہ ان پر خوب سجا۔ اس وقت سینتالیس کے پیٹے میں تھے۔ لمبے تڑنگے بھاری بھرکم بدن پر ڈھیلا ڈھالا کرتا، بڑے پائنچے کا پائجامہ سر پر چاند تارے والی ٹوپی، کبھی محض کرتے میں، کبھی سبز عبا میں۔ اس آن بان کے ساتھ وہ اپنی ذات میں خلافت کمیٹی بن گئے۔ لاہور کے میاں فیض الدین نقیب خلافت بن کر ساتھ ہو لیے۔ شہر شہر گھومتے تھے۔ نقیب خلافت فلک شگاف نعرے لگاتے تھے۔ خادم کعبہ مولانا شوکت علی دھواں دھار تقریر کرتے تھے۔

مولانا محمد علی بھی پہلے مسٹر بنے پھر مولانا ہوئے۔ مسٹر محمد علی، گورے چٹے، داڑھی صاف، مونچھیں چڑھی ہوئیں، کوٹ پتلون پہنے ہوئے، پھر ایسے مولانا ہوئے کہ ڈاڑھی طول پکڑتی پکڑتی سینے تک لٹک گئی۔ کوٹ پتلون کو خیرباد کہا۔ سبز عبا اور چاند تارے والی ٹوپی سے پہچانے جانے لگے۔ زبان اور قلم دونوں رواں تھے اور دونوں زبانوں پر بھرپور عبور حاصل تھا۔ کبھی انگریزی میں رواں ہیں کبھی اردو میں گرج برس رہے ہیں۔ ابھی گرج برس رہے ہیں اور ابھی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ امرتسر پہنچ کر کانگریس سے مسلم لیگ تک، مسلم لیگ سے خلافت کمیٹی تک گرجتے برستے چلے گئے۔

اب ۱۹۲۰ء شروع ہوچکا تھا اور خلافت کی تحریک میں گرمی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو ایک وفد وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ سے ملنے چلا۔ وفد میں مسلمان رہنما بھی تھے اور ہندو زعما بھی۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، گاندھی جی، مولانا عبدالباری، حسرت موہانی، سوامی شردھانند، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا ابو الکلام آزاد (۳) ۔ وفد وائسرائے کی خدمت میں پہنچا۔ وائسرائے نے لندن کا رستہ دکھایا۔ معذرت کی کہ ترکی کے معاملات میں ہمارا اختیار نہیں۔ آپ لندن جا کر ہمارے بڑوں سے بات چیت کریں۔

اب کیا کیا جائے، فوراً ایک مشاورتی جلسہ ہوا۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری، مولانا ابو الکلام آزاد، گاندھی جی، حکیم صاحب، سب سر جوڑ کر بیٹھے۔ گاندھی جی نے یہاں عدم تعاون کا پروگرام پیش کر ڈالا، کہا کہ بھائیو عرضداشتوں اور وفدوں کا سمے بیت گیا۔ اپنے اپنے خطاب واپس کرو، سرکاری نوکریوں پر لات مارو، عدالتوں، کالجوں اور اسکولوں کا بائیکاٹ کرو۔ قانون ساز اسمبلیوں کی ممبری کا خیال ترک کر دو۔

رہنماؤں پر کیا رد عمل ہوا، اس کی داستان مولانا آزاد نے یوں بیان کی، ''حکیم صاحب نے کہا کہ میں اس پروگرام پر سوچ بچار کرنے کے لیے تھوڑی مہلت چاہتا ہوں۔ جب تک میں خود اس پروگرام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو جاتا، اس وقت تک میں دوسروں کو اسے قبول کرنے کا مشورہ کیسے دے سکتا ہوں۔ مولوی عبدالباری نے فرمایا کہ گاندھی جی کی تجاویز نے کچھ اصولی سوالات پیدا کر دیئے ہیں۔ جب تک میں غور و فکر نہ کرلوں اور یہ تحقیق نہ کرلوں کہ اس باب میں احکام خداوندی کیا ہیں، اس وقت تک میں جواب دینے سے معذور ہوں گا۔ محمد علی اور شوکت علی بولے کہ ہم مولوی عبدالباری کے فیصلہ کا انتظار کریں گے۔ پھر گاندھی جی میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے بلاتامل جواب دیا کہ مجھے یہ پروگرام منظور ہے اگر لوگ واقعی ترکی کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو پھر گاندھی جی کے بتائے ہوئے پروگرام کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔'' (۴)

تاہم دوسری صورت بھی سوچی گئی، یہ کہ ایک وفد انگلستان جا کر وزیراعظم لائڈ جارج سے ملے۔ مولانا محمد علی وفد کے قائد بنے۔ مولانا سید سلیمان ندوی، سید حسین اور عبدالقاسم وفد میں شامل ہوئے۔ وفد یکم فروری ۱۹۲۰ء کو بمبئی سے روانہ ہوا۔ لائڈ جارج صاحب نے وفد کو روکھا جواب دیا کہ ترکی نے برطانیہ کے خلاف جنگ کی اور شکست کھائی۔ جو دوسرے شکست کھانے والوں سے سلوک ہوگا وہی ترکی سے بھی روا رکھا جائے گا۔ کوئی رو رعایت نہیں ہوگی۔

وفد نے بساط بھر بہت ہاتھ پیر مارے۔ مطلب یہ کہ مولانا محمد علی نے۔ وفد کے باقی ارکان کیا ہاتھ پیر مارتے۔ مولانا سید سلیمان ندوی انگریزی میں رواں نہ ہوسکے۔ سید

حسین عشق میں مار کھا جانے کی وجہ سے بجھے بجھے تھے۔ خلافت اور گائے کے ساتھ وجے لکشمی پنڈت کا بھی تو مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ گاندھی جی نے یہ مسئلہ بھی اپنے ذمے لے لیا اور کم از کم اس مسئلہ کو انہوں نے خوبصورتی سے نبٹا دیا۔ وجے لکشمی سے سید حسین کی شادی ہونے لگی تھی کہ تنت وقت پہ گاندھی جی بیچ میں کود پڑے۔ مولانا محمد علی عازم لندن تھے۔ سید حسین سے کہا گیا کہ تم بھی مولانا کے ساتھ سدھارو اور خلافت کو بچانے کی فکر کرو۔ وفد میں ایک ناکام عاشق کی شمولیت وفد کے لیے اچھا شگن ثابت نہیں ہوئی۔ مولانا محمد علی نے اس دیار میں ساڑھے آٹھ مہینے لگائے۔ بہت دوڑ دھوپ کی، بہت کہا سنا، مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

ادھر ہندوستان میں ساڑھے آٹھ مہینوں میں دنیا بدل گئی۔ وجے لکشمی پنڈت کی ایک کشمیری برہمن سے شادی ہوگئی۔ عدم تعاون کی تحریک چل پڑی۔ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو یوم خلافت منایا گیا اور گاندھی جی نے اس موقعہ پر اپنے عدم تعاون کے پروگرام کا اعلان کیا۔

گاندھی جی کے پروگرام کی پہلی شق یہ تھی کہ خطاب اور تمغے واپس کر دیئے جائیں۔ حکیم صاحب نے اپنا خطاب اور تمغہ دونوں واپس کر دیئے اور حکومت کو لکھ بھیجا کہ

> ”بحیثیت ایک حقیر مسلمان کے میں ان عزتوں سے دست کش ہوتا ہوں جو مجھے گورنمنٹ کی طرف سے عطا کی گئیں تھیں۔ میں قیصر ہند گولڈ میڈل اور دو انگلستان اور ہندوستان کی تاجپوشی کے درباروں کے تمغوں کے ساتھ ساتھ، جنہیں میں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں آج کی تاریخ سے 'حاذق الملک' کے خطاب سے بھی اپنے آپ کو سبکدوش سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ یہ بھی درخواست کرتا ہوں کہ میرا نام درباریوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔“

وہ خطاب جس کے ملنے پر اتنی خوشیاں منائی گئی تھیں اور جس پر مولانا حالی نے منظوم مبارکباد پیش کی تھی، آج عطا کرنے والوں کو واپس کر دیا گیا تھا۔ اب حاذق الملک حکیم اجمل خاں سیدھے سچے حکیم اجمل خاں تھے۔ مگر ایک خطاب گیا **دوسرا**

خطاب آیا۔ دوسرا خطاب اپنوں کی طرف سے ملا تھا۔ جمعیتہ العلماء نے اپنے اجلاس کانپور میں حاذق الملک کا خطاب واپس کرنے پر حکیم صاحب کو خراج تحسین پیش کیا اور قوم کی طرف سے مسیح الملک کا خطاب عطا کیا۔ اس خطاب کو قبول عام کی سند حاصل ہوئی۔ حاذق الملک حکیم اجمل خاں مسیح الملک۔حکیم اجمل خاں بن گئے۔

حکیم صاحب نے خطاب اور تمغے تو واپس کر دیئے تھے۔ مگر گاندھی جی کے پروگرام کے ابھی قائل نہیں ہوئے تھے۔ خلافت کمیٹی بھی ہنوز تذبذب میں تھی۔ ۲ اور ۳ جون کو الہ آباد میں خلافت کانفرنس ہوئی اور یہ پروگرام زیر بحث آیا۔ گاندھی جی راوی ہیں کہ "خلافت کانفرنس میں تحریک عدم تعاون کی قرارداد بہت بحث مباحثے کے بعد منظور ہوئی۔ میری آنکھوں میں وہ منظر اب تک پھر رہا ہے کہ الہ آباد میں اس مسئلہ پر ایک کمیٹی بیٹھی۔ رات بھر سوچ بچار کرتی رہی۔ شروع میں مرحوم حکیم اجمل خاں عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کی تحریک کو قابل عمل نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جب وہ ایک مرتبہ قائل ہوگئے تو پھر انہوں نے دل و جان سے اس کے لیے کام کیا۔ ان کی تائید و حمایت تحریک کے لیے بہت گراں قدر ثابت ہوئی۔"()

خلافت کمیٹی نے عدم تعاون کا پروگرام منظور کیا اور اعلان کیا کہ یکم اگست سے یہ تحریک شروع ہو جائے گی۔ مگر کانگریس ہنوز تذبذب میں تھی۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے ستمبر میں اپنے اپنے ہنگامی اجلاس کلکتہ میں منعقد کیے۔ ۷ ستمبر ۱۹۲۰ء کو منگل کی صبح ٹاؤن ہال میں مسلم لیگ کا ہنگامی اجلاس شروع ہوا۔ محمد علی جناح صدر تھے۔ سٹیج پر ان کے دائیں بائیں کانگریس، لیگ اور خلافت کے رہنما بیٹھے تھے۔ گاندھی جی، موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، مسز اینی بیسنٹ، مسز جناح، حکیم اجمل خاں، مولانا ظفر علی خاں، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ہال میں تین پرچم اس مضمون کے لہرا رہے تھے :

۱۔ جلیانوالہ باغ کو یاد رکھو۔

۲۔ اپنے مذہب پر عامل رہو۔

۳۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔

کرسی صدارت کے دائیں بائیں رضا کار خاکی وردی پہنے، ننگی تلواریں علم

کئے کھڑے تھے۔ اجلاس شروع ہوا، ننگی تلواریں نیام میں چلی گئیں۔ (۵)

برطانیہ نے ترکی کی قسمت کا جو فیصلہ کیا تھا اس کی جناح صاحب نے بہت مذمت کی مگر گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کے بارے میں چپ رہے۔ ادھر کانگریس کے اجلاس میں مسلمان رہنما تو اس تحریک کے حق میں تھے مگر ہندو رہنما کنی کاٹ رہے تھے۔ لالہ لاجپت رائے اور سی آر داس اعلانیہ اس کے مخالف تھے۔ اس کے بارے میں آخری فیصلہ اجلاس ناگپور پر ٹل گیا جو اواخر دسمبر میں ہونے والا تھا۔

تحریک نے دسمبر کا انتظار نہ کیا وہ تو اگست ہی میں شروع ہو چکی تھی اور اب زوروں پر تھی۔ ترکی کے بارے میں برطانوی حکومت نے جو فیصلے کئے تھے اس پر مسلمانوں میں اتنا غم و غصہ تھا کہ سر دھڑ کی بازی لگانے پہ تلے ہوئے تھے۔ عدم تعاون کی تحریک چلی۔ ساتھ میں ایک اور تحریک چل پڑی۔ یہ تحریک ہجرت تھی۔ سندھ سے شروع ہوئی اور صوبہ سرحد تک پھیل گئی۔ لوگوں نے گھر بار کو خیرباد کہا۔ مال و اسباب اونے پونے بیچا اور سر پہ کفن باندھ افغانستان کی طرف نکل گئے۔ ہندوستان اب ان کے لیے دارالحرب تھا۔ دارالحرب سے بیس ہزار کی خلقت جوش ہجرت میں نکلی اور ہرج مرج کھینچتی دارالاسلام میں پہنچی۔

انگلستان گیا ہوا وفد اپنا سا منہ لے کر اکتوبر میں واپس آ گیا۔ مولانا محمد علی غصے میں بھرے ہوئے آئے اور عدم تعاونی بن کر میدان میں کود پڑے۔ پہلا ہلہ علی گڑھ پہ بولا۔ اکتوبر کے اواخر میں خلافتیوں کی پوری پلٹن کے ساتھ اس شہر میں چھاؤنی چھائی۔ کالج کا رخ کیا۔ اس درسگاہ سے وہ مسٹر بن کر نکلے تھے اور آج مولانا بن کر داخل ہو رہے تھے۔ کورٹ کے ممبروں کا جلسہ ہوا۔ حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، تصدق حسین شیروانی، خواجہ عبدالمجید لاہوری، باری باری سب نے تقریریں کیں۔ مطالبہ کیا کہ کالج حکومت سے عدم تعاون کرے اور سرکاری گرانٹ کا بائیکاٹ کرے۔ مگر ٹرسٹیوں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ تب خلافتی رہنما ناراض ہو کر کورٹ سے نکلے اور اب وہ طلبہ سے مخاطب ہوئے۔ طلبہ سے اپیل کی کہ یونیورسٹی کو چھوڑو اور باہر نکل آؤ۔ نئے خون نے جوش کھایا۔ کم و بیش چھ سو طلبہ یونیورسٹی کو چھوڑ چھاڑ باہر نکل آئے۔

اس ہنگامہ میں ایک نئی قومی درسگاہ کے قیام کی آواز اٹھی۔ اس آواز نے جادو کا اثر کیا۔ ترت کے ترت تجویز نے جامہ عمل پہن لیا۔ کالج کے پڑوس میں کچھ خیمے کھڑے کئے، ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ یہ نیا کالج ٹھہرا، علی گڑھ کے پرانے فرزند نے نئے فرزندوں کو پکارا۔ پرانے فرزند مولانا محمد علی نے ایک سبز پرچم اٹھایا ہوا تھا۔ طلبہ اپنے بستے لے کر کالج سے نکلے اور اس پرچم تلے اکٹھے ہوگئے، پھر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے نئے کالج کی طرف روانہ ہوئے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن انہیں دنوں جزیرہ مالٹا سے رہا ہو کر آئے تھے اور دیوبند میں اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہے تھے۔ مگر خلافتیوں کی پکار پر بستر بیماری سے اٹھے اور ۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ پہنچ کر نئی درسگاہ کا افتتاح کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس کا نام رکھا گیا۔ حکیم صاحب امیر جامعہ منتخب ہوئے۔ عبدالمجید خواجہ شیخ الجامعہ بنے۔

علی گڑھ کی مہم کے بعد حکیم صاحب واپس دلی آئے۔ یہاں ایک نئی مصروفیت ان کی منتظر تھی۔ ۱۹ نومبر سے جمعیتہ العلماء کا اجلاس شروع ہونا تھا۔ حکیم صاحب اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ یہ اجلاس بھی بہت زور شور سے ہوا۔ علماء نے اعلان کیا کہ سرکار برطانیہ کی ملازمت حرام ہے اور فوج میں نوکری کرنا گناہ ہے کہ یہ نوکری مسلمان کو مسلمان پر گولی چلانے پر مجبور کرتی ہے۔

حکیم صاحب اپنا خطاب اور تمغے پہلے ہی واپس کرچکے تھے۔ اب انہوں نے ایک اقدام اور کیا۔ پس منظر ان کے اقدام کا یہ تھا کہ ۱۹۱۹ء میں دلی میں جو ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اس کا ڈنڈ دلی والوں پر پڑا۔ حکومت ایک مخصوص رقم بطور تاوان وصول کرنے کے درپے تھی۔ حکیم صاحب نے قدم یہ اٹھایا کہ تاوان دینے سے انکار کر دیا اور لکھ بھیجا کہ

> ”میں اس تاوان کو انصاف اور حق پر مبنی نہیں سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ ایک طرف دہلی کے ہندوؤں، مسلمانوں کی بہت سی قیمتی جانیں بعض حکام کی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے ضائع ہوں اور دوسری طرف وہ اس غیر متوقع تاوان کو خوشی کے ساتھ

برداشت کریں۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں اپنے وطن کے ہندو اور مسلمانوں کے واجب اور جائز احساس میں شرکت کروں اور اس ناجائز تاوان کو ادا نہ کروں۔" (۶)

آخر دسمبر کا مہینہ آن پہنچا۔ ناگپور میں ایک طرف مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا، دوسری طرف کانگریس کا ۳۰ اور ۳۱ کی تاریخوں میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا ڈاکٹر انصاری صدر ہوئے۔ حکیم صاحب نے ایک قرارداد پیش کی کہ سودیشی مال استعمال کیا جائے اور اس طور دیسی صنعت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ قرارداد منظور ہو گئی۔ (۷)

مسلم لیگ کا جلسہ بجھا بجھا تھا۔ معرکہ کانگریس کے اجلاس میں گرم ہوا۔ عدم تعاون کے موافق اور مخالف کمریں کس کس کر یہاں پہنچے تھے۔ ۱۴۵۸۲ مندوبین اکٹھے تھے۔ ان میں ۱۰۵۰ مندوبین مسلمان تھے۔ اتنے مندوبین کانگریس کے اجلاس میں نہ اس سے پہلے اکٹھے ہوئے نہ آگے چل کر کبھی اکٹھے ہوئے۔ مخالفوں کے سرغنہ سی آر داس تھے۔ وہ مشرقی بنگال اور آسام سے ڈھائی سو مندوبین کی پلٹن لے کر آئے تھے۔ سب کا خرچ اپنی جیب سے ادا کیا۔ اس چکر میں ۳۶۰ روپے خرچ کر بیٹھے۔ (۸) مگر گاندھی جی کی فوج ظفر موج کے مقابلہ میں پلٹن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پلٹن کے جرنیل نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سی آر داس نے خود عدم تعاون کی قرارداد پیش کی۔ لالہ لاجپت رائے نے تائید کی، مگر ایک شخص خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ محمد علی جناح تھے۔ عدم تعاون کے خلاف اس بھرے اجلاس میں یہ اکیلی آواز تھی۔

جناح صاحب نے تقریر میں مہاتما گاندھی کو مسٹر گاندھی کہا اور مولانا محمد علی کو مسٹر محمد علی کہا۔ مہاتما بھی مسٹر اور مولانا بھی مسٹر۔ عقیدت مندوں نے آسمان سر پہ اٹھالیا۔ ایک طرف سے شور اٹھا کہ مہاتما کہو۔ دوسری طرف سے نعرہ بلند ہوا کہ مولانا کہو۔ وہ اکیلا آدمی اپنی بات پہ اڑ گیا۔ "آپ کون ہوتے ہیں مجھے ٹوکنے والے۔ میری اپنی مرضی ہے کہ کسے کس نام سے پکاروں۔ البتہ مجھے پارلیمانی آداب کا پابند رہنا چاہیے۔ میں مسٹر محمد علی کے دعوے مولانائیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" (۹)

مولانا شوکت علی آخر بڑے بھائی تھے۔ جلال میں آ گئے۔ وہ دراز قد لحیم شحیم

بزرگ ڈنڈا سنبھال کر دبلے پتلے محمد علی جناح کی طرف بڑھے مگر عدم تشدد کے فلسفہ نے راستہ روک لیا۔ (۱۰)

معرکہ ناگپور میں حریف پسپا ہوئے۔ گاندھی جی فاتح بن کر ابھرے۔ (۱۱) اس معرکہ کے ساتھ ۱۹۲۰ء تمام ہوا۔ اب نیا سال نئے طوفانوں کو اپنے بطن میں لیے نمودار ہو رہا تھا۔

حواشی

۱۔ مہاتما گاندھی، ہزاون سٹوری۔ ص

۲۔ لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی۔ ص ۱۸۵

۳۔ شرکائے وفد کے یہ نام لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی میں بیان ہوئے ہیں۔ مگر مولانا آزاد نے انڈیا ونز فریڈم، میں یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے یادداشت پر دستخط ضرور کئے تھے، وفد میں شامل نہیں ہوئے۔ نیز ان کے حساب سے یہ وفد ۲۰ جنوری کے بعد کسی تاریخ کو وائسرائے سے ملا تھا۔

۴۔ انڈیا ونز فریڈم

۵۔ مہاتما گاندھی، ہزاون سٹوری۔ ص ۳۲۹

۶۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان (جلد اول) ص ۵۴۱

۷۔ حیاتِ اجمل، مرتبہ قاضی عبدالغفار۔ ص

۸۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان (جلد اول) ص ۵۵۴

۹۔ تاریخ کانگریس۔ ص ۵۲۹

۱۰۔ لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی۔ ص ۲۵۰

شوراشوری اور بے نمکی

بر میں کھدر کی اچکن، سر پہ کھدر کی کشتی نما ٹوپی، کھدر ہی کا آڑی تراش کا پائجامہ، یہ خلافت کے دنوں کے حکیم اجمل خاں تھے۔

مولانا محمد علی شوکت علی نے گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ بی اماں دال ترکاری پکاتیں اور بیٹوں کو کھلاتیں۔ گاندھی جی خوش تھے اور کہہ رہے تھے :

"محمد علی اور ان کے پورے گھرانے نے گوشت کھانا چھوڑ دیا۔ اب تو ان کے رسوئی گھر میں بھی گائے کے گوشت کی بوٹی نہیں آ سکتی۔"[1]

اب ۱۹۲۱ء شروع ہوچکا تھا۔ گاندھی جی نے طبیہ کالج کی عمارت کا افتتاح کیا۔ یہ وہی عمارت تھی جس کا سنگ بنیاد لارڈ ہارڈنگ نے رکھا تھا۔ مگر وہ ۱۹۱۶ء تھا۔ تب سے اب تک پلوں کے نیچے سے پانی بہت بہ گیا تھا حکیم صاحب حاذق الملک سے مسیح الملک بن چکے تھے۔ تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ عدم تعاون کا ہنگامہ تھا۔ فروری کی ۱۲ کو گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی کو ساتھ لیئے طبیہ کالج کی نئی عمارت کا افتتاح کرنے پہنچے۔ کہا کہ "میں حکیم جی کو ہندو مسلم اتحاد کا رکن اعظم سمجھتا ہوں۔ میں اس کالج کو بھی اس اتحاد کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔ اس لیئے آج مجھے اس رسم کی ادائیگی میں بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔"

اس تقریب سے فراغت پاتے ہی حکیم صاحب سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری کے ساتھ دلی سے چلے اور بمبئی پہنچے۔ وزیراعظم انگلستان نے خلافت کے نمائندوں کو ترکی کے مسئلہ پر بات چیت کرنے کے لیئے بلایا تھا۔ خلافت کمیٹی نے اسی سلسلہ میں ایک جلسہ منعقد کیا تھا۔ وفد مرتب ہوا اور روانہ ہوا۔ حکیم صاحب نے

رخصت ہونے والوں کو فی امان اللہ کہا اور دلی واپس آئے مگر جلد ہی پھر سفر پر روانہ ہوگئے۔ ۳۱ مارچ کو بیزواڑہ میں کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ گاندھی جی نے تجویز پیش کی کہ ایک "تلک سوراج فنڈ" قائم ہو اور اس میں ایک کروڑ روپے کی رقم جلد از جلد جمع ہونی چاہیے۔

۳۱ مارچ کو جلسہ ہوا اور یکم اپریل کو رہنما چندے کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے حکیم صاحب بھی ایک قافلہ لے کر اس مہم پر نکلے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور چودھری خلیق الزماں کو ہمراہ لیا اور کالی کٹ پہنچے۔ وہاں انہوں نے تین دن قیام کیا۔ (۲)

کالی کٹ موپلوں کی بستی تھی۔ حکیم صاحب وہاں صرف چندہ جمع کرنے گئے تھے۔ مگر جنگجو موپلے محض چندہ دے کے تو چپ بیٹھنے والے نہیں تھے۔ ایسے جوش میں آئے کہ پہلے چندہ دیا، پھر بغاوت کی۔ خلافت کا نعرہ ان کے اسلامی جذبے کو بھڑکا گیا۔ اگست کا مہینہ آتے آتے پھٹ پڑے۔ برطانوی حکومت کو یہاں مسلح بغاوت سے پالا پڑا، مگر موپلے انگریزوں سے ٹکراتے ٹکراتے ہندوؤں سے بھی ٹکرا گئے۔ ہندو مسلم اتحاد کے مظاہروں کے عین بیچ یہ نیا گل کھلا۔ خلافتی رہنما حیران کہ یہ کیا ہوگیا۔ بس اسی زمانے میں مولانا محمد علی گرفتار ہوئے اور ساری توجہ ادھر مرکوز ہوگئی۔ اصل میں ۸ جولائی کو کراچی میں جو خلافت کانفرنس ہوئی تھی، اس میں مولانا محمد علی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسلمان سپاہیوں سے فوج کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی جائے۔ وہاں اس مضمون کی قرارداد منظور ہوئی اور اس پاداش میں ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مختلف خلافتی رہنما باغی بنے کراچی کی عدالت میں کھڑے تھے۔ جرم ثابت ہونے کی دیر تھی پھر پھانسی کا تختہ تھا اور خلافتی رہنما تھے۔ پورے ہندوستان میں شور برپا ہوگیا۔ خلافت والوں نے جوش میں آکر ڈاڑھیاں رکھ لیں۔ علی برادران پہلے ہی ڈاڑھیاں بڑھا چکے تھے، قومی درد رکھنے والے کھنچ کھنچ کر کراچی پہنچنے لگے۔ حکیم صاحب بھی پہنچے۔ مولانا محمد علی دو دن متواتر عدالت کے کٹہرے میں کھڑے گرجتے برستے رہے۔ بغاوت کے الزام سے بچ نکلے۔ مگر دوسرے الزامات میں دو سال قید سخت کی سزا پا گئے۔

حکیم صاحب کراچی سے واپس ہوئے تو بمبئی پہنچے۔ عمر سبحانی کے یہاں مہمان ہوئے۔ کراچی سے رہنما بمبئی پہنچ رہے تے اور عمر سبحانی کے مہمان بن رہے تھے۔ اس شخص نے مہمانوں کی بہت تواضع کی۔ ایک شب محفل قوالی کا اہتمام ہوا۔ مگر اسی شب حکیم صاحب کو دل کا دوہ پڑا اور محفل قوالی ملتوی ہوگئی۔

بمبئی ان دنوں گرمایا ہوا شہر تھا۔ تحریک خلافت کا صدر مقام جو تھا۔ پرنس آف ویلز کی آمد نے آفت ڈھائی۔ وہ فرنگی شہزادہ ہندوستان کے دروازے ہی پر ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ۱۷ نومبر کو بمبئی میں اترا۔ فوراً ہی شہر میں ہڑتال ہوگئی۔ بدیشی کپڑے جلائے جانے لگے۔ مار دھاڑ، قتل و خون، بس یہ سمجھو کہ قیامت ہی تو آ گئی۔ شہزادے صاحب بمبئی سے نکل آگے چلے۔ قیامت بھی ان کے ہمرکاب چلی۔ حکیم صاحب کہہ رہے تھے کہ شہزادے کے خیر مقدم کے لیئے ہماری طبیعت حاضر نہیں ہے۔ احتجاج کے لیئے طبیعت البتہ حاضر تھی۔

یہ ۱۹۲۱ء کے آخری مہینے تھے۔ ان ڈیڑھ دو مہینوں میں جلوس بھی بہت نکلے، جلسے بھی بہت ہوئے اور حکیم صاحب نے صدارتیں بھی بہت کیں۔ جس جس جلسہ میں گئے، صدارت کرتے چلے گئے۔ "صدر ہرجا کہ نشیند صدر است" چاہے وہ ہندو مہاسبھا ہی کیوں نہ ہو۔ حکیم صاحب کے خطبہ صدارت میں گائے نے بہت جگہ گھیری۔ ہندو بھائیوں کو وہ یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ گائے کا بھی اصل دشمن فرنگی ہے نہ کہ مسلمان۔ دلیل ان کی یہ تھی کہ زیادہ گائیں انگریزی فوجوں کے لیئے کاٹی جاتی ہیں۔ مسلمان بادشاہ گائے کے گوشت سے پہلو تہی کرتے تھے مگر انگریز تو یہاں آکر گائے کے لیئے قصائی بن گیا ہے۔

ہندو مہاسبھا کا جلسہ شروع نومبر میں ہوا تھا۔ جامعہ ملیہ کا جلسہ تقسیم اسناد ایک ماہ بعد شروع دسمبر میں ہوا۔ حکیم صاحب وہاں بھی صدر تھے۔ جامعہ ملیہ نے تعلیم کا ایک برس پورا کر لیا تھا۔ یہ اس کا پہلا جلسہ تقسیم اسناد تھا۔

جب سے یہ درس گاہ قائم ہوئی تھی تب سے اب تک کے مہینوں میں بنانے والوں پر بہت کچھ بیت گئی تھی۔ شیخ الہند دنیا سے سدھار چکے تھے۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی اور تصدق احمد شیروانی رنج اسیری کھینچ رہے تھے۔ ہاں بہادر بیٹوں کی ماں

آئی بیٹھی تھیں- امیر جامعہ حکیم اجمل خان نے خطبہ صدارت کا آغاز کیا- مخاطب ہوئے : "بی اماں، اراکین جامعہ اور حضرات!"

"میری زبان، ان جذبات مسرت و تشکر کے اظہار سے قاصر ہے جو اس کم عمر پودے کو سرسبز دیکھ کر میں محسوس کر رہا ہوں جسے نہایت تشویشناک دور میں ہم لوگوں نے اس سنگلاخ زمین میں لگایا تھا-

لیکن ہم ان بدقسمت لوگوں میں ہیں جن کی ہر مسرت کے ساتھ کسی نہ کسی رنج کی آمیزش ضرور ہوتی ہے- ہماری آنکھیں آج کس قدر مایوسی کے ساتھ اس مجمع میں شیخ الہند مرحوم کو تلاش کرتی ہیں لیکن نہیں پاتیں--- آج اس جلسہ میں اسی جامعہ کے روح رواں مولانا محمد علی و شوکت علی اور اس کے مخلص معتمد تصدق احمد شیروانی بھی بوجہ معلومہ شرکت نہیں فرما سکے--- وہ اس جرم میں ماخوذ ہیں جس کا یہ جامعہ اپنے ہر رکن کو مرتکب بنانا چاہتی ہے- اگر وہ اس کام میں کامیاب ہوگئی تو اس کے بانیوں اور کارکنوں کو دنیا سے شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہ ہوگی- مجھے یقین ہے کہ اگرچہ ان برادران عزیز کے جسموں کو قید فرنگ نے یہاں موجود ہونے سے روک دیا ہے لیکن ان کا خیال اور ان کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں اور میں آپ حضرات کی طرف سے ان کی خدمت میں ہدیہ مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہیں اپنی حق دوستی کا وہ صلہ مل گیا- افسوس ہے جس کے ہم لوگ اب تک اہل تصور نہیں کئے گئے-"

اس خطبہ کے ساتھ جامعہ ملیہ کے قیام کا مقصد واضح ہو کر سامنے آیا- اس سے پہلے بہت سوں کے لیئے اور شاید مختلف خلافتی رہنماؤں کی دانست میں بھی یہ محض علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں کی انگریز پرستی کے خلاف ردعمل تھا- اب کھلا کہ یہ تو سر سید احمد خاں کے خلاف بغاوت تھی- حکیم صاحب نے کہا :

"ہمیں افسوس کے ساتھ یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اگرچہ ہمارے تعلیمی رہنماؤں کی زبان سے قومی ترقی اور ملی بہبود کے الفاظ ہمیشہ سنائی دیتے تھے، لیکن دراصل ان کے پیش نظر قوم و ملت کے مقاصد درست نہ تھے

بلکہ چند افراد کے لیئے جن کی زندگی قوم کی حیات میں ایک لمحہ کے برابر ہے، معاش مہیا کرنے کا مسئلہ تھا- ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ ایک نسل کو تکلیف ہی میں رکھ کر اپنی تعلیمی عمارت کی بنیاد استوار کرتے، اس پر قناعت کی، دیوار کچھ تو اٹھ جائے خواہ بنیاد کتنی ہی کج کیوں نہ سہی- میں اس دور کے تعلیمی پیشوا سر سید احمد خان کے متعلق کوئی تفصیلی رائے اس وقت ظاہر کرنا نہیں چاہتا- میں تسلیم کرتا ہوں کہ انہوں نے جس پُر آشوب زمانے کا نظارہ کیا تھا اور مسلمان خاندانوں کی جو تباہی ان کی آنکھوں کے سامنے گزری اس کے بعد ایک انسانی دماغ کے لیئے ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ سے مال اندیشی دور بینی کا دامن چھوٹ جائے اور وہ مقاصد حقیقی کی پابندی اور ان کے دور رس اثرات کا خیال رکھنے کی بجائے وقتی و عارضی ضروریات کے پورا کرنے کو اپنا فرض سمجھنے لگے-

--- میرا گمان ہے کہ اگر انھیں (سر سید احمد خاں) موقع ملتا تو وہ اپنی اس غلطی کی جو ایک غیر قومی تعلیم دے کر اور پھر اس کو ایک غیر قومی حکومت کے زیر اثر کرنے میں ان سے سرزد ہوئی تھی، ضرور تلافی کرتے اور انصاف یہ ہے کہ ایک آزاد کلیہ اسلامی کے قیام کا خیال اس غلطی کے مہلک اثرات سے جلد سے جلد محفوظ ہو جانے کے لیئے تھا لیکن انسان خدا کے پاس سے زندگی کا ایک محدود اور معین زمانہ لے کر آیا ہے اور وہ مجبور ہے کہ اپنے کام کا بہت سا حصہ اپنے جانشینوں کے لیئے چھوڑ جائے- افسوس ہے کہ اس معاملہ میں جانشینوں نے بجائے ابتدائی غلطی کی اصلاح کے اسے استقلال بخشا اور ہمیشہ کے لیئے تعلیم کے اصل مقصد کو پس پشت ڈال کر اسے چند سرکاری ملازمتوں کے حصول کا ذریعہ بنا دیا-"

اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے اقدام کی وضاحت حکیم صاحب نے اس طرح کی :

"اس کے علاوہ چونکہ ہماری تعلیم کا مقصد ملازمین و محکومین کی ایک جماعت پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ ہم طالب علم میں علوم کا ذوق پیدا کرنا اور

اس کے اعمال پر اس کا اثر دیکھنا چاہتے ہیں، اس لیئے ایک غیر زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے غیر فطری طریقہ کار کا سدباب مقصود ہے۔

یہ اس در پردہ غلامی کی کیسی عبرت انگیز مثال ہے کہ ایسے صریح امر میں بھی ہندوستانی ابتک اس فریب میں مبتلا رہے اور اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ غیر زبان میں تعلیم دے کر قوم کے قوائے ذہنیہ کو کس طرح شل کیا جا رہا ہے اور ہم کس طرح اتنے عرصے سے ذہنی و دماغی خودکشی میں برابر مصروف ہیں اور ایک لمحہ کے لیئے یہ غور نہیں کرتے کہ بلا اپنی مادری زبان کو ترقی دیئے ہوئے کسی قوم کا کار زار عالم میں کامیاب ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ بارے الحمدللہ کہ ہمیں ہوش آیا اور اب ہم نے اپنے جدید نظام تعلیم میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے اور اس طرح ان تمام مکارانہ کوششوں سے اپنے آپ کو مامون کر لیا ہے جو مذہب سے ناواقفیت، تاریخ ملیہ سے بیخبری اور غیر زبان میں تعلیم حاصل کر کے معارف علوم سے بالکل نابلد رہنے کے باعث ہمیں ہمیشہ کے لیئے مغرب کے تمدن مادی کی غلامی میں ڈال دیتی تھیں۔"

جامعہ ملیہ کا پہلا جلسہ تقسیم اسناد بخیر و خوبی تمام ہوا مگر ابھی دو اور صدارتیں حکیم صاحب کی منتظر تھیں۔ کانگریس کا سالانہ اجلاس اور خلافت کمیٹی کا سالانہ اجلاس۔ کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت اس برس سی آر داس کو کرنی تھی مگر داس جی جیل چلے گئے۔ تب نظر انتخاب حکیم صاحب پر پڑی۔

۱۹۲۱ء کی آخری تاریخوں میں احمد آباد مرجع خاص و عام بن گیا۔ کانگریس کا اجلاس آراستہ ہوا۔ مندوبین کے لیئے خیمے شامیانے نصب ہوئے۔ دو لاکھ کا کھدر صرف ان خیموں شامیانوں میں صرف ہوگیا۔ حکیم صاحب نے خطبہ صدارت اردو میں پڑھا۔ کانگریس کی تاریخ میں یہ سب سے مختصر خطبہ صدارت تھا۔

"آج پورے ملک میں عدم تعاون کا جذبہ جاری و ساری ہے۔ اس عظیم ملک میں قریب و دور گوشے گوشے میں سچے اور کھرے ہندوستانیوں کے قلوب اس جذبے سے سرشار ہیں کہ سوراج کے لیئے اور خلافت اور

پنجاب کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں ان کی تلافی کے لیئے قربانیاں پیش کی جائیں اور ہنسی خوشی مصائب برداشت کئے جائیں۔ شہزادہ ویلز صاحب کے استقبال کے لیئے ہماری طبیعت حاضر نہیں ہے اور اس وقت تک حاضر نہیں ہوگی جب تک پنجاب اور خلافت کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی تلافی نہیں ہوتی اور جب تک سوراج حاصل نہیں ہو جاتا۔ ہمارا ملک اس وقت درد و کرب کے عالم میں ہے مگر یہ پیش گوئی کرنے کے لیئے کسی پیر پیغمبر کی ضرورت نہیں، یہ وہ درد زہ ہے جس سے جوان ہندوستان جنم لے گا، جو ہمارے قدیم ملک کی شاندار روایات کو چار چاند لگائے گا اور اقوام عالم کی برادری میں اونچا مقام حاصل کرے گا۔"

اس اجلاس میں نو قراردادیں منظور ہوئیں۔ ایک قرارداد یہ منظور ہوئی کہ ٹیکس ادا نہ کرنے کی تحریک کا آغاز کیا جائے۔ اس سول نافرمانی کے لیئے باردولی کا انتخاب کیا گیا اور گاندھی جی کو تحریک کا مختار کل بنایا گیا۔

ایک ہنگامہ خیز قرارداد مولانا حسرت موہانی نے پیش کی۔ اس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ تھا۔ مگر گاندھی جی کو یہ مطالبہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ انہوں نے زور وشور سے قرارداد کی مخالفت کی۔ قرارداد نامنظور ہوئی، مگر مولانا حسرت موہانی یوں چپ ہو جانے والی شے تو نہیں تھے۔ وہ مکمل آزادی کا مطالبہ لے کر خلافت کانفرنس میں پہنچے۔ حکیم صاحب اس کانفرنس میں بھی صدر تھے۔ حکیم صاحب نے اس قرارداد کو خلاف ضابطہ قرار دے دیا۔ بس پھر کیا تھا، طوفان ہی تو اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگ آئیں سو جائیں۔ حکیم صاحب نے یہ نقشہ دیکھا تو صدارت کی کرسی سے اٹھے اور خاموشی سے پنڈال سے نکل گئے۔ (۳)

مگر طوفان یوں تھمنے والا نہیں تھا۔ حکیم صاحب واپس دلی پہنچے تو وہاں بھی اس طوفان نے ان کا استقبال کیا۔ دلی میں حکیم صاحب کے پہنچنے سے پہلے کامل آزادی کی قرارداد کی شکست کی خبر پہنچ چکی تھی۔ حکیم صاحب کے خلاف دلی کی دیواروں پر اشتہار لگ گئے۔

یہ مخالفت ایک بلبلا سا تھا کہ اٹھا اور بیٹھ گیا۔ مخالفتوں کے لیئے اس وقت فضا

ساز گار نہیں تھی- اس وقت ہندوستان ایک بڑے معرکہ کے لیئے تیار ہو رہا تھا گاندھی جی باردولی میں جا پہنچے تھے اور سول نافرمانی کی بساط بچھانے لگے تھے- دلی میں پانچ رہنماؤں نے مل کر پنج نکاتی اپیل قوم کے نام جاری کی- یہ رہنما تھے حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر سید محمود، سیٹھ چھٹانی، اے ایچ ایس کھتری، انہوں نے اپیل جاری کی کہ :

۱- انگورہ فنڈ کے لیئے پانچ لاکھ کی رقم اکٹھی کرو-
۲- گاندھی جی کے اشارے پر جیلیں بھرنے کے لیئے تیار ہو جاؤ-
۳- ہر صورت میں عدم تشدد کے پابند رہو-
۴- ہندو- مسلم اتحاد کو برقرار رکھو-
۵- مردانہ وار گاندھی جی کے نقش قدم پر چلو- (۴)

قوم کے نام نئے سال کا یہ پہلا پیغام تھا- اس کے ساتھ بستی بستی، شہر شہر جوش کی لہر پھیلتی چلی گئی- تحریک خلافت نے زور پکڑا- عدم تعاون کا غلغلہ تھا- بہت سے رہنما پہلے ہی جیل پہنچ چکے تھے- بہت سے پہنچ رہے تھے-

فروری کے مہینے میں حکیم صاحب باردولی پہنچے- وہاں بھرے جلسہ عام میں فیصلہ ہوا کہ ستیہ گرہ اس شہر سے شروع ہو- حکیم صاحب جب وہاں سے لوٹے تو دیکھا کہ شہر شہر طوفان امنڈ ہوا ہے- گرفتاریاں، جلسے، جلوس، چندہ جمع کرنے والے ایک ایک روپے کے ٹکٹ لوگوں کو فروخت کرتے پھرتے تھے، جن میں ایک پکار درج تھی:

کون ہے جو اللہ کو خوش دلی کے ساتھ قرض دے
اور اللہ اس کا دگنا کر دے اور ساتھ ہی بہت بڑا اجر بھی حاصل کرے

خلافت
مہاجرین مظلومین سمرنا، قومی تعلیم، قومی عدالت
کے لیئے
ایک روپیہ وصول

جلسوں اور جلسوں کا زور تھا ہر جلسے، ہر جلوس میں تقریریں ہوتی تھیں اور نعرے لگتے تھے کہ پولیس اور فوج میں نوکری کرنا حرام ہے- منچلے نوجوان یہ نعرہ لکھ لکھ

کر کتوں کے پٹے میں باندھ دیتے اور انہیں چھوڑ دیتے۔

ان جلسوں میں ممتاز رہنماؤں کے سوا ایک برقعہ پوش بی بی نے بھی آنا شروع کر دیا تھا۔ یہ برقعہ پوش بی بی ان دو اسیر بیٹوں کی ماں تھی جو علی برادران کہلاتے تھے۔ یہ ماں اپنے بیٹوں کی بی اماں ہونے کے ساتھ اب پورے ہندوستان کی بی اماں بن چکی تھی۔ ماں بیٹے مل کر ہندوستان کے عوامی تخیل کو مہمیز دے رہے تھے اور ایک نئی قسم کی عوامی شاعری پیدا ہو رہی تھی۔ جب دونوں بھائیوں کو دو دو سال قید کی سزا ہوئی تو کسی گمنام شاعر نے ایک شعر کہا اور وہ مقبول خاص و عام بن گیا:

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

اور اب کسی گمنام شاعر نے یہ نظم کہہ ڈالی تھی:

بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دیدو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی، جان بیٹا خلافت پہ دیدو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا، کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحان میں اترنا، جان بیٹا خلافت پہ دیدو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے، کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے، جان بیٹا خلافت پہ دیدو
حشر میں حشر برپا کروں گی، پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعوی کروں گی، جان بیٹا خلافت پہ دیدو

ایسی کتنی ہی نظمیں گمنام شاعروں نے کہیں یا کہہ لیجئے کہ اجتماعی شعری تخیل کی کوکھ سے پھوٹیں اور زبانوں پر رواں ہوگئیں۔ یہ تحریک خلافت کی لوک شاعری تھی۔ بچے، بڑے یہ نظمیں پڑھتے ہوئے گھروں سے نکلتے، جلوس کی شکل میں چلتے اور گرفتار ہو جاتے۔

حکیم صاحب کی شاعری کا رنگ بھی بدلنے لگا تھا۔ سیدھی سچی غزل کہتے کہتے اب وہ قومی نظمیں لکھنے لگے تھے۔ عدم تعاون کی تحریک چلا رہے تھے۔ بس یہی لہجہ نظموں میں سرایت کر گیا تھا:

کر دیا جائے۔"(۷)

سارے قومی حلقے بدل اور مایوس تھے۔ گاندھی جی اپنی جگہ مطمئن تھے۔ سب بے طرح ان پر برس رہے تھے۔ حکومت نے اس وقت کو موافق مطلب جانا اور ۱۳ مارچ ۱۹۲۲ء کو گاندھی جی کو گرفتار کر لیا۔ گاندھی جی تحریک کے مختار کل تھے۔ اب انہوں نے یہ اختیار حکیم صاحب کو سونپا اور جیل چلے گئے۔ لوگوں نے ایک سرد مہری کے ساتھ خبر سنی، طوفان ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ہندوستان اب خاموش تھا۔

حواشی

۱۔ لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی، ص ۲۳۷

۲۔ شاہراہ پاکستان، ص ۳۸۷

۳۔ لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی، ص ۲۸۰

۴۔ لائف اینڈ ٹائمز اف محمد علی، ص ۲۸۴

۵۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، آٹو بایو گرافی، ص ۱۶۶

۶۔ لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی، ص ۲۹۱

۷۔ لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی، ص ۲۹۱

چوڑا خط لکھا۔

''حکیم جی، میری آپ سے ۱۹۱۵ء سے شناسائی چلی آ رہی ہے وقت کے ساتھ ساتھ یہ ناتا مضبوط ہوتا گیا اور اب یہ صورت ہے کہ آپ کی دوستی کو میں ایک قیمتی سرمایہ جانتا ہوں۔ ایک پکے مسلمان ہونے کے ناطے آپ نے اپنے جیون میں یہ کر کے دکھایا کہ ہندو مسلم ایکتا کا ارتھ کیا ہے۔ اس سے پہلے ہمیں یہ جانکاری نہیں تھی۔ وہ تو اب ہوئی ہے کہ اس ایکتا کے بغیر ہم آزادی حاصل نہیں کرسکتے، بلکہ میں یہاں تک کہوں گا کہ اس کے بغیر ہندوستان کے مسلمان خلافت کے مقصد کی بھی جتنی خدمت کرنا چاہتے ہیں اتنی نہیں کرسکتے۔ سو اس ایکتا کو پالیسی کے طور پر نہیں اپنانا چاہیے کہ جب ہمیں راس آتی دکھائی نہ دے تو اس کا بستر لپیٹ دیں۔ ہم اس کا بستر اسی صورت لپیٹ سکتے ہیں کہ سوراج سے ہم اکتا گئے ہوں۔ ہندو مسلم ایکتا ہر حال میں اور ہمیشہ کے لیئے ہمارا ایمان ہونی چاہیے۔

''ہندو مسلم ایکتا ابھی تک پالیسی کی حد سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اب بھی ہمارے بیچ بہت شک شبہے، بہت سندیہہ اور بہت اندیشے ہیں، لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ اس سلسلہ میں ہم نے جتنا حاصل کیا ہے وہ بہت شاندار ہے۔ ان اٹھارہ مہینوں میں ہم نے اتنا کام کیا ہے جتنا پوری ایک نسل میں ہوتا ہے۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ابھی نہ طبقوں میں یہ شعور پیدا ہوا ہے نہ جنتا کہ یہ احساس ہے کہ ہماری ایکتا اتنی ہی ضروری ہے جتنی ہمارے نتھنوں کے لیئے سانس لینا ضروری ہے۔'' (۳)

گاندھی جی نے اس خط میں آگے چل کر چرخہ کاتنے کی سرگرمی کو ہندو مسلم اتحاد کا اور عدم تشدد کا استعارہ ٹھہرایا ہے۔ چرخہ کاتو اور کھدر پہنو، یہ وہ پروگرام ہے جو انہوں نے اس خط میں تجویز کیا ہے۔

حکیم صاحب نے جوابی خط میں اسی گرمجوشی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور گاندھی جی کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی سی کوشش کرنے کا یقین دلایا، مگر یہ نیک پاک خیالات اپنی جگہ اور گاندھی جی کے اعلان سے جو مسائل پیدا ہو گئے تھے وہ اپنی جگہ اس احساس کے تحت حکیم صاحب نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس طلب کیا۔ اس کمیٹی کے سیکرٹری راج گوپال اچاریہ تھے۔ ۷ جون ۱۹۲۲ء کو یہ اجلاس منعقد

ہوا۔ پنڈت موتی لال نہرو رہا ہو کر آ چکے تھے۔ وہ بھی اجلاس میں شریک تھے۔ اس اجلاس نے ایک کمیٹی اس غرض سے نامزد کی کہ وہ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۲ء تک اپنی تحقیقات کرکے یہ رپورٹ دے کہ سول نافرمانی کے اب کیا امکانات ہیں اور کس طرح اسے چلایا جاسکتا ہے۔ موتی لال نہرو، راج گوپال اچاریہ، ڈاکٹر انصاری، وٹھل بھائی پٹیل، کستوری رنگا، آئنگر اور خود حکیم صاحب اس کمیٹی کے رکن تھے۔ (۴)

اس کمیٹی نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور اکتوبر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ کمیٹی کی تحقیق یہ کہتی تھی کہ ملک سول نافرمانی کے لیئے فی الحال تیار نہیں ہے۔ سو کمیٹی اس پر متفق تھی کہ سول نافرمانی کا خیال فی الحال دل سے نکال دیا جائے ہاں صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ صوبے کے حالات کا تقاضا ہو تو وہ صوبائی سطح پر یہ کارروائی کرسکتے ہیں۔ ایسے اور کتنے معاملات تھے جو اس رپورٹ میں زیر بحث آئے اور کمیٹی نے ان پر متفقہ رائے کا اظہار کیا، مگر ایک مسئلہ پر آ کر کمیٹی میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا اور دو گروہ بن گئے۔ یہ تھا کونسلوں میں داخلہ کا مسئلہ۔ حکیم صاحب پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر پٹیل نے سفارش کی کہ تارکین موالات کو کونسل کے انتخابات میں کھڑا ہونا چاہیے اور کونسلوں میں جا کر حکومت جو چاہتی ہے اس میں رکاوٹیں ڈال کر اپنی بات منوانے کی کوشش کرنی چاہیے، مگر ڈاکٹر انصاری، راجگوپال اچاریہ اور کستوری رنگا آئر نے اس نقطہ نظر سے اختلاف کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تو عدم تعاون کی پالیسی سے صریحاً انحراف ہے۔ سوجو کانگریس کی پالیسی چلی آ رہی ہے اسی پر گامزن رہنا چاہیے۔

یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ کانگریس میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ جو عدم تعاون کی پالیسی میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا قائل نہیں تھا۔ نوچینجر گروپ کہلایا۔ تبدیلی کا خواہاں گروپ چینجر گروپ کے نام سے مشہور ہوا۔

حکیم صاحب ادھر خلافت کمیٹی کے بھی صدر تھے۔ ان کی ہدایت کے تحت اس کمیٹی نے اسی نوعیت کی ایک تحقیقاتی کمیٹی نامزد کی تھی۔ حکیم صاحب چونکہ کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی میں شامل تھے اس لیئے ادھر شامل نہیں ہوئے۔ اس کمیٹی نے متفقہ طور پر کونسلوں کے بائیکاٹ کی سفارش کی۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس نومبر ۱۹۲۲ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا حکیم صاحب نے چینجرز گروپ کے نقطہ نظر کی زور شور سے وکالت کی۔ کانگریس کمیٹی نے اس اجلاس میں تحقیقاتی کمیٹی کے اراکین کی خدمات کو بس سراہنے پر قناعت کی کونسلوں میں جانے نہ جانے کے نزاعی مسئلہ کو کانگریس کے سالانہ اجلاس کے لیئے چھوڑ دیا گیا جو سال کے آخر میں گیا میں سی۔ آر داس کی صدارت میں منعقد ہونا تھا۔ سی آر داس خود چینجرز گروپ کے نقطہ نظر کے حامی تھے۔ جب کانگریس میں ان کی بات نہیں چلی اور نو چینجرز گروپ کے حق میں فیصلہ ہوگیا تو انہوں نے کانگریس کو سلام کیا اور اسی شہر گیا میں یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی جس میں حکیم صاحب اور پنڈت موتی لال نہرو ان کے ساتھ تھے۔ یوں کانگریس ایک تفرقہ کا شکار ہوگئی۔

ادھر کانگریس کے کچھ نامی گرامی رہنما کسی دوسری ہی راہ پر چل نکلے تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اب سنگھٹن کی تحریک چلا رہے تھے۔ دلی میں سوامی شردھانند کا مسلمانوں کے ساتھ ہنی مون ختم ہوچکا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں وہ جیل سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی وہ شدھی کے کاروبار میں جت گئے۔

اصل میں تحریک کے التواء سے آپس میں غلط فہمیاں ہی پیدا نہیں ہوئی تھیں کچھ ایسے اندیشے اور وسوسے بھی ابھر آئے تھے جن کی جڑیں کہیں تاریخ میں تھیں۔ یا شاید خلافت کی تحریک ہی نے ان سوئے ہوئے اندیشوں اور وسوسوں کو جگا دیا تھا۔ تحریک کی گرما گرمی میں تو انہیں اظہار کا موقعہ نہیں ملا التواء کے اعلان کے فوراً بعد ہندو مسلم فسادات سے شہ پاکر ان اندیشوں اور وسوسوں نے اپنا سر اٹھایا۔ انڈین مسلمز، کے مصنف رام گوپال کا تجزیہ ہے کہ چوٹی کے ہندو رہنماؤں نے فسادات سے یہ سمجھا تھا کہ مسلمان باقاعدہ کسی منصوبے کے تحت ہندوؤں پر حملے کر رہے ہیں۔ اپنے اس تجزیے کے ثبوت میں اس نے ایک لالہ لاجپت رائے کا خط بنام سی، آر، داس نقل کیا ہے اور ایک رابندر ناتھ ٹیگور کا بیان۔ لالہ لاجپت رائے نے اپنے خط میں مختلف مسائل پر بحث کرتے ہوئے مسلمانوں کے مسئلہ پر اپنے اندیشوں کا اظہار یوں کیا۔

"ایک مسئلہ اور ہے جو پچھلے تھوڑے عرصے سے مجھے بہت پریشان کر رہا ہے اور میں آپ سے بھی درخواست کروں گا کہ ذرا اس پر سنجیدگی

سنگھٹن رکھا گیا اور ہندو مسلم اتحاد کے نعرے کی جگہ ہندو اتحاد کے نعرے کو اپنایا گیا۔ کانگریس کا سالانہ اجلاس بھی جو گیا میں منعقد ہونا تھا سر پہ کھڑا تھا۔ اسی موقعہ پر وہاں ہندو مہاسبھا کے اجلاس کا بھی اہتمام کیا گیا۔ مالویہ جی نے صدارت کی۔ یہاں بھی انہوں نے ملتان میں ہندوؤں پر جو بیتی تھی اسے بیان کیا اور ہندوؤں میں متحد ہونے اور اپنی حفاظت کا انتظام کرنے کی اپیل کی اور اگرچہ بقول ڈاکٹر راجندر پرشاد "اس اجلاس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا لیکن اس سے کانگریس اور سبھا میں جدائی کی داغ بیل پڑ گئی۔" (9)

اسی ہنگام "شدھی" نام کی تنظیم کی بھی بنیاد رکھی گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کو غیر ہندو عناصر سے پاک کیا جائے اور ہندو جو کبھی پہلے مسلمان ہوگئے تھے یا عیسائی بن گئے تھے انہیں واپس ہندو مت کی آغوش میں لایا جائے۔ بس اسی کے ساتھ مختلف ذرائع سے مسلمانوں کو گھیر چیپ کر ہندو بنانے کی تحریک شروع ہوگئی۔

مسلمان کب چپ بیٹھنے والے تھے۔ یہاں سنگھٹن اور شدھی کے جواب میں تبلیغ اور تنظیم کے نام سے تنظیمیں قائم ہوگئیں۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے۔

ادھر حکیم صاحب حیران اور پریشان تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد ان کا وظیفہ تھا۔ کس کس جتن سے وہ مسلمانوں کو اس راہ پہ اس حد تک لے آئے تھے کہ دلی میں گائے کے گوشت کا چلن ختم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے ہوا الٹی چل پڑی۔ پنجاب خاص طور پر رزم گاہ بنا ہوا تھا۔ وہ فساد جس نے ہندو رہنماؤں کے دل و دماغ بدل کر رکھ دیئے تھے وہ بھی اسی صوبے کے شہر ملتان میں ہوا تھا اور ملتان میں حالت یہ تھی کہ جب دوبارہ وہ صلح و صفائی کے مقصد سے اس شہر گئے تو ادھر ہندوؤں کا پارہ چڑھا ہوا تھا اور مسلمانوں سے وہ تاوان مانگ رہے تھے، ادھر مسلمان اکڑے ہوئے تھے اور صلح پر بالکل مائل نہیں تھے۔ حکیم صاحب نے خلافت کمیٹی کے فنڈ سے ایک معقول رقم ہندوؤں کے امدادی فنڈ میں دی اور واپس آ گئے۔

ملتان سے واپس آ کر جب انہوں نے پنجاب صوبائی کانفرنس میں شرکت کی تو وہاں انہوں نے بڑے درد سے مسلمانوں کو مخاطب کیا۔

"میں صاف طور پر تمام مسلمانوں سے جو یہاں موجود ہیں کہتا ہوں کہ اگر تم سوراج کے سوال کو چھوڑے دیتے ہو تو تم خلافت کے مسئلہ کو حل نہیں کرسکتے اور سوراج بغیر ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے حاصل نہیں ہو سکتا۔۔۔ اگر نااتفاقی کی یہ وبا ملک میں پھیل جائے گی تو پنجاب اس کا ذمہ دار ہوگا۔ اگر تم ایک دوسرے سے لڑتے رہو گے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ تم نہ سوراج کی قدر و قیمت جانتے ہو نہ خلافت کی۔"

اس کے بعد انہوں نے ایک بیان جاری کیا جو اہل پنجاب کے نام ایک پیغام کی حیثیت رکھتا تھا۔

"پنجاب ہندوستان کے تمام صوبوں میں جو خاص اہمیت رکھتا ہے اس کے بیان کرنے کی اس وقت ضرورت نہیں۔ یہ وہ صوبہ ہے جس کی طرف ہمیشہ ہر ایک ہی خواہ ملک و قوم کی آنکھیں لگی رہتی ہیں۔ لیکن درد دل کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس صوبے میں ہندو مسلم اتحاد گزشتہ چند مہینوں سے ایسی حالت میں نہیں ہے کہ جو ملکی جماعت کے لیئے باعث اطمینان ہو اور قابل تسلی سمجھا جاسکے۔

"کیا پنجاب کے ہندو اور مسلمان ذمہ دار اصحاب اس بات سے خوش ہوں گے کہ ملک کی موجودہ متحدہ طاقت کو صدمہ پہنچے اور سوراج اور خلافت کے اہم ترین مسائل باہمی نااتفاقی کے حوالے کر دیئے جائیں۔

"کیا یہ کچھ کم افسوس کی بات ہے کہ پنجاب کے ایک قدیمی اور تاریخی شہر میں یہ باہمی کشمکش اس صورت میں نمودار ہو کہ ہمارے ہندو بھائیوں کے معابد بڑی تعداد میں نذر آتش ہوگئے۔ جانوں اور جسموں کے نقصان کے علاوہ دوکانوں کو لوٹ لیا گیا یا جلا دیا گیا۔ ایسے شرمناک اور خلاف انسانیت کام نہ صرف ملتان اور پنجاب کے بلکہ متحدہ ہندوستان کے دامن پر اس بدنما داغ کی صورت میں نظر آ رہے ہیں جس کا دور کرنا ہم سب کا اور علی الخصوص پنجاب کی ذمہ دار جماعت کا سب سے پہلا فرض ہونا چاہیے۔

"آخر میں میری اپیل پنجاب کے پریس سے ہے۔ میں پریس کی اہمیت سے واقف ہوں اور پریس کی ذمہ داری کو سمجھتا ہوں، تاہم میں پریس کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ ۱۹۲۲ء میں پنجاب کے اردو اخبارات کے لہجہ میں بمقابلہ سالہائے گزشتہ نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ پنجاب کا پریس جو ہندوستان میں سب صوبوں کے مقابلہ میں طاقتور پریس ہے ملک کی موجودہ نازک حالت کو بھول نہ جائے اور دونوں قوموں کے حقیقی اور بڑے فوائد کے لیئے جس اتحاد کی ضرورت ہے اس اتحاد کی حفاظت و مضبوطی کے لیئے اپنے فرض اور اپنی ذمہ داری کو برابر پیش نظر رکھے اور اپنے سچے جذبات اور حب الوطنی کا ثبوت دے۔"

مگر ایک طرف شدھی اور سنگھٹن کا ہنگامہ دوسری طرف تبلیغ اور تنظیم کا ولولہ، اس شور میں یہ آواز کیسے سنائی دیتی سو حکیم صاحب امن اور اتحاد کی اپیلیں کرتے رہے اور ادھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ خلافت کے قیدی چھوٹ کر آئے تو حیران ہوئے کہ رخصت کس فضا میں ہوئے تھے اور اب آئے ہیں تو کیا فضا ہے۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی رہا ہو کر آئے اور فضا کا رنگ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

جیل جب گئے تھے تو کیا سماں تھا کہ ہندو مسلمان یک جان دو قالب تھے۔ لگتا تھا کہ سوراج کی منزل بھی قریب ہے اور خلافت کا ستارہ بھی گردش سے نکلنے والا ہے، لیکن اب تو سارا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ کیسا سوراج اور کیسی آزادی۔ ہندو مسلم ایک دوسرے سے حساب چکانے کے لیئے کمریں کس رہے تھے۔ ادھر ترکی میں نقشہ کچھ سے کچھ ہوگیا تھا۔ مولانا محمد علی نے تو جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھے بیٹھے بس اتنا سنا تھا کہ مصطفیٰ کمال نے سمرنا میں میدان مار لیا۔ غم اسیری کافور ہوا۔ خوشی میں توسن طبع رواں ہوا

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبیں کی
سن لی خدا نے قیدی گوشہ نشیں کی

ہے نام مصطفیٰ کی یہ برکت کہ پھر خدا
یوں جڑ جما رہا ہے محمد کے دین کی

اس وقت انہیں کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ خوشی اصل میں ایک بڑے صدمے کا دیباچہ ہے۔ اب رہا ہو کر آئے تو ابھی سانس ہی لیا تھا کہ یہ خبر سن لی کہ ترکی میں نیا بندوبست آ گیا۔ اب اس کی حیثیت ایک جمہوریہ کی ہوگی۔ اس کے صدر ہوں گے مصطفیٰ کمال، سلطان کو معزول کر دیا گیا۔ اس خبر میں تسکین کا پہلو بس اتنا تھا کہ نئی مملکت کا مذہب بہرحال اسلام ہی کو قرار دیا گیا تھا اور خلافت کو برقرار رکھا گیا تھا۔ خلیفہ رہے گا مگر اختیارات کے بغیر، تو سلطان وحید الدین خاں تو معزول ہو گئے تھے۔ اب عبدالمجید خاں خلیفہ مقرر ہوئے۔

خلافت کے اس تصور پر قناعت کر لی جاتی تو وہ شاید چلتی رہتی۔ لیکن تحریک خلافت والے اس پر قانع نہیں ہوئے ان کے تصور میں تو یہ بات بسی ہوئی تھی کہ خلیفہ خلیفتہ المسلمین ہے اور حاکمیت الٰہی کا امین خلیفہ ہو اور حاکم نہ ہو، اس تصور سے وہ سمجھوتہ کیسے کر لیتے۔ تو خلیفہ کے مقربین نے خلیفہ کو شہ دی اور خلیفہ صاحب نے کوشش کی کہ پرانے شاہی طور کو برقرار رکھا جائے۔ سودر بار بھی منعقد ہوتا رہا۔ دنیائے اسلام کے مختلف ممالک سے آنے والے وفود کو باریابی بھی حاصل ہوتی رہی پیغامات بھیجنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یہ کیا کم اشتعال انگیز رویہ تھا کہ اوپر سے ایک شگوفہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے چھوڑا گیا۔ سر آغا خاں اور سید امیر علی نے حکومت ترکی کو ایک خط لکھ مارا جس میں خلیفہ کی موجودہ حیثیت کے بارے میں مسلمانوں کے اضطراب کا ذکر کیا گیا اور وہ حیثیت دینے کی اپیل کی گئی جو خلیفہ کے شایان شان ہو۔ گویا متروک حیثیت کی بحالی کا مطالبہ تھا۔ اس مکتوب کی نقول ترکی کے اخبارات کو بھی روانہ کر دی گئیں اور ہوا یوں کہ یہ مکتوب حکومت کو بعد میں موصول ہوا، اخباروں میں پہلے چھپ گیا۔ یوں یہ مکتوب خلافت کے تابوت میں آخری کیل بن گیا۔

مصطفیٰ کمال نے اب بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کر ڈالا۔ کہا کہ "ایک عالمی اسلامی ریاست کے یوٹوپیا کی خاطر ترکی اور اس کے مٹھی بھر

لوگوں کو کسی خلیفہ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ جو ہم نے اپنے آپ کو دنیا کا ٹھیکیدار سمجھ رکھا تھا' یہ خود فریبی اب ختم ہونی چاہیے۔ دنیا کے کیا حالات ہیں اور اس کے بیچ ہمارے کیا حیثیت ہے۔ اس سے ہم بہت بے خبر رہے اور احمقوں کے بھرے میں آتے رہے۔ اس طور ہم نے قوم کو مشکلوں میں پھنسائے رکھا۔ بہت ہولی۔ اب یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔" (۱۰)

خلافت کی منسوخی کا اعلان ہندوستانی مسلمانوں پر بجلی بن کر گرا۔ مولانا شوکت علی نے ایک دوست سے کہا کہ "میں سمجھ نہیں پا رہا کہ اس وقت میرے دل و دماغ کی کیا حالت ہے۔ اس حالت میں جانے میں کیا کر بیٹھوں۔"

یہ حال خالی مولانا شوکت علی کا نہیں تھا۔ سارے ہندوستانی مسلمانوں کا ایک ہی حال تھا۔ مولانا محمد علی کے گھر میں آگے پیچھے دو موتیں ہوئیں۔ ابھی بیٹی کو منوں مٹی کے نیچے سلا کر آئے تھے۔ اک خلافت کا جنازہ گھر میں رکھا تھا اسے جلدی دفن کرنا ان کے لیئے مشکل ہو رہا تھا۔

۲۳ جون ۱۹۲۴ء کو دلی میں خلافت کانفرنس کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا۔ شرکائے مجلس تھے، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولاناابوالکلام آزاد، عبدالقادر، عبدالمجید، ٹی اے کے شیروانی، ظہور احمد، شعیب قریشی، محمد شفیع۔

اس جلسہ میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دونوں بہت گرجے برسے، مولانا محمد علی نے مصطفیٰ کمال کو بے دین تک کہہ ڈالا۔ باقیوں کا رویہ کسی قدر مختلف تھا اور حکیم صاحب کا موقف یہ تھا کہ ترکی کی نئی حکومت کی مذمت کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک وفد جا کر ان سے تبادلہ خیال کرے اپنا نقطہ نظر بتائے۔ ان کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرے اور وہاں کے حالات و معاملات کا مطالعہ کرے۔

یہ تجویز مانی گئی اور حکیم صاحب کی سربراہی میں ایک وفد ترتیب دیا گیا مگر ترکی کی حکومت کی طرف سے اس تجویز کا یہ جواب آیا کہ اگر وفد دوستانہ طور پر ترکی آنا چاہتا ہے تو جگ جگ آئے۔ لیکن اگر خلافت کے مسئلہ پر بحث مقصود ہے تو پھر آنے کی زحمت نہ کرے۔ وہ باب ہم نے بند کر دیا ہے۔ ہمارے اندرونی معاملات میں کوئی

مخل ہو، یہ ہمیں منظور نہیں۔

ٹکا سا جواب مل گیا۔ خلافت والے دل مسوس کر رہ گئے اور چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ تو یہاں تک تیار تھے کہ مصطفیٰ کمال خود خلیفہ بن جائیں۔ خلافت کا ادارہ کسی طور قائم تو رہے۔ مگر مصطفیٰ کمال ایسی کوئی تجویز سننے کے لیئے تیار نہیں تھے۔ ترکی سے کوسوں دور بیٹھ کر ہندی مسلمانوں نے اپنے تصور میں خلیفہ کے گرد تقدس کا ایک ہالہ بنا لیا تھا اور خلافت نے اس سارے عمل میں ان کے تصور میں ایک رومان کا درجہ حاصل کر لیا تھا، مگر ترکوں نے اس ادارے کو حقیقت کے طور پر جانا تھا اور سہا تھا۔ ان کے رد عمل کے پیچھے ان کا تاریخی تجربہ تھا۔

بہرحال خلافت بے شک ختم ہوگئی ہو، خلافت کانفرنس قائم تھی۔ ہندوستانی مسلمان اتنی جلدی ہتھیار پھینکنے والے نہیں تھے۔ تھوڑے دنوں انہوں نے ترک ناداں کی عقل پر ماتم کیا، اس کی ملی بے حسی پر لعن طعن کی، کچھ سمجھانے بجھانے کی بھی کوشش کی، مگر جلد ہی عالم سلام کے بدلتے حالات نے انہیں اپنے خواب کی تعبیر کے لیئے ایک اور موقعہ فراہم کر دیا۔ وہ اس طرح کہ سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد عرب علاقوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ انگریزوں نے حجاز میں شریف حسین کو حاکم بنا کر بٹھا دیا تھا۔ حاکم بن کر وہ خلافت کا مدعی ہوا مگر امیر نجد ابن سعود نے اس کی حیثیت کو چیلنج کیا اور لڑائی شروع ہوگئی۔ حجاز میں معرکہ پڑا ہو اور ہندوستان کے مسلمان اس سے بے تعلق رہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا اور مولانا محمد علی کے تو گویا تن مردہ میں جان پڑ گئی۔ وہ اب حجاز میں خلافت کے قیام کا خواب دیکھنے لگے۔ اس خواب نے گل آگے چل کر کھلائے۔ اس وقت تو ہندو مسلم کشیدگی سے ہندوستان میں حالات ایسی سنگین صورت اختیار کر گئے تھے کہ مسلمان رہنماؤں کو ترکی اور عرب کو قدرے فراموش کر کے گھر کی فکر کرنی پڑ گئی۔

ملتان میں تو آگ بھڑک کر بجھ گئی تھی مگر اب وہ شہر شہر پھیل رہی تھی۔ پنڈت مدن موہن مالویہ وہاں سے جو چنگاری لے کر نکلے تھے اس سے انہوں نے سنگھٹن کی تحریک کی آگ روشن کی۔ سوامی شردھانند تن من سے شدھی میں مصروف تھے۔ ادھر پنجاب میں ڈاکٹر کچلو نے جواب آن غزل کے طور پر تنظیم کے نام سے تحریک

شروع کر رکھی تھی اور جمعیت العلمائے ہند نے تبلیغ کے عنوان سے ایک شعبہ قائم کرڈالا۔ لاہور میں مولانا ظفر علی خاں شعر میں شعلہ بیانی دکھا رہے تھے۔

صدا کل شب یہ اٹھی مالوی جی کی حویلی سے
تمہاری آبرو کا بھاؤ پانی سے بھی سستا ہے
دبائی جائے گی دکھی ہوئی رگ حق پرستوں کی
بغل میں سنگھٹن دابے ہوئے شدھی کا بستہ ہے
پڑا ہے سنگھٹن سے اورشدھی سے ہمیں پالا
ادھر اس بھڑنے کاٹا ہے ادھر وہ سانپ ڈستا ہے

اس فضا میں حکیم صاحب نے اپنے لیئے راہ یہ نکالی کہ جامعہ ملیہ اور طبیہ کالج کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ واقعہ یوں ہے کہ ۱۹۲۳ء میں ان کا زیادہ وقت انہیں سرگرمیوں میں گزرا۔ پھر ان کی صحت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس نے بھی ان کے یہاں کسی قدر افسردگی پیدا کر دی تھی۔ صحت ہی کے تقاضوں کے پیش نظر وہ دلی سے نکل کر نینی تال کے قریب ایک پہاڑی مقام گھوڑا کھال میں جا بیٹھے۔ یوں وہ ہنگاموں کے مرکز سے دور ہوگئے۔ مگر بے تعلقی پھر بھی نہ برت سکے۔ بقر عید قریب آئی تو یکایک انہیں خیال آیا کہ انہوں نے جو گائے کی قربانی کی روک تھام کے لیئے اتنا کام کیا تھا موجودہ حالات میں کہیں اس پر پانی نہ پھر جائے۔ بس فوراً ہی ایک بیان جاری کیا جس میں بہت کچھ کہنے کے بعد کہا گیا۔

گزشتہ تین سال سے ہم مذہبی حکم ھل جزاء الاحسان الا حسان پر عمل کرتے ہوئے اپنے ہندو برادران وطن کے جذبات کا قابل تعریف احترام کر رہے ہیں اس لیئے کہ انہوں نے مسئلہ خلافت میں ہمارے ساتھ نہایت اچھے موقعہ پر اظہار ہمدردی کیا تھا۔ لیکن بعض حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ اب اس قسم کے واقعات رونما ہوگئے ہیں جن کی رو سے ہم اپنے اوپر عائد کردہ فرض سے سبکدوش ہوگئے ہیں۔

"جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ان واقعات کو عارضی اور گزر جانے والی گھٹا کی طرح سمجھتا ہوں--- اپنے مسلمان بھائیوں سے میں

نہایت پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہمارے ملک و مذہب کی تاریخ کے اس اہم موقعہ کا لحاظ رکھیں اور اس امر کو فراموش کرتے ہوئے جس سے ان کے دلوں کو تکلیف پہنچی ہے۔ قربانی گاؤ کے متعلق اپنے رویے کو جاری رکھیں۔

"آخر میں، میں یہ دعا مانگتا ہوں کہ خدا میرے مسلمان بھائیوں کو گزرجانے والے جذبات پر غالب آنے اور قربانی کی مقدس رسم کو احتیاط کے ساتھ اور غصے سے پاک رکھنے کی توفیق دے--- اگر میں اپنی خرابی صحت سے عارضی گوشہ نشینی پر مجبور نہ ہوتا تو میں اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو ہندو مسلمانوں کے مابین غلط فہمی رفع کرنے کے لیئے صرف کرتا اس لیئے کہ انہیں کے تعاون پر ہمارے مستقل مفاد اور ہندوستان کی نجات کا دارومدار ہے۔" (۱۰)

اس اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ دلی کے قصابوں نے حکیم صاحب کی اپیل کے جواب میں اعلان کیا کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر وہ پچھلے برسوں کی طرح اس برس بھی ہندو بھائیوں کے جذبات کا خیال رکھیں گے۔" (۱۱)

اسی زمانے میں حکیم صاحب کو ایک اور تکلیف نے ستایا۔ ان کی ایک آنکھ میں پانی اتر آیا تھا اور بہت کم دکھائی دینے لگا تھا۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں انہوں نے دلی آ کر آنکھ کا آپریشن کرایا۔ آپریشن کامیاب رہا، مگر اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی صحت اور گر گئی اور کمزوری بہت بڑھ گئی۔

مختصر یہ کہ ۱۹۲۳ء ان کے لیئے مایوسیوں اور پریشانیوں کا سال تھا، مگر ۱۹۲۴ء بھی کونسا کامرانیوں اور خوشیوں کا سال ثابت ہوا۔ ہندو مسلم کشیدگی تو چل رہی تھی۔ اوپر سے خلافت کی منسوخی کا واقعہ گزر گیا جو واقعہ گزرتا تھا وہ ان کی صحت پر اثرانداز ہوتا تھا۔ خلافت کی منسوخی کے بعد خلافت کمیٹی کا جو جلسہ ہوا اس کے بعد ان کی طبیعت پھر بگڑ گئی۔ انہوں نے دلی سے رخت سفر باندھا اور ایبٹ آباد کی راہ لی۔ ان کے احباب میں ایک ڈپٹی نثار حسین تھے جو ایبٹ آباد کے قیام کے دنوں میں ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے ان دنوں کا روزنامچہ لکھ رکھا ہے۔ اس روزنامچہ کا ایک ورق ملاحظہ فرمایئے۔

"حکیم صاحب نے ایک صحبت میں مسلمانوں کی پستی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی قوم ہو، کوئی مذہب، جس میں تنگدلی ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسلام نے دنیا میں بہت زیادہ روشنی پھیلائی ہے۔ اسلام میں انصاف اور فراخ دلی ہے جس کے سامنے دوست دشمن ایک ہیں۔ مگر افسوس کہ آج مسلمانوں نے اس سبق کو فراموش کر دیا ہے، اور اس کج روی نے ان کے قدم جادۂ مستقیم سے ہٹا دیئے ہیں۔ ترک بہت خطرناک تجربہ کر رہے ہیں، لیکن اگر وہ کامیاب ہوئے تو کم از کم اپنی زندگی کو سنبھال لیں گے۔" (۱۲)

ایبٹ آباد سے حکیم صاحب چند دنوں کے لیئے دلی واپس آئے اور مصروفیات کے ساتھ ایک کام انہوں نے یہ کیا کہ ایک مرتبہ پھر شہر کے ہندو مسلمان رہنماؤں کو شریف منزل میں جمع کیا۔ اس جلسہ میں ہندو مسلم فساد سے محفوظ رہنے کی تدبیروں پر غور کیا گیا۔ ایک تجویز یہ منظور ہوئی کہ اخبارات سے درخواست کی جائے کہ کم از کم ایک ماہ تک وہ کسی افواہ کو اپنے صفحات میں جگہ نہ دیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تنظیموں سے اپیل کی جائے کہ ایک ماہ تک وہ کسی افواہ پر کان نہ دھریں اور کوئی ایسا جلسہ نہ کریں جس سے اشتعال پیدا ہو۔ دوسری تجویز یہ منظور ہوئی کہ ایک ہندو مسلم بورڈ قائم کیا جائے جس کی جانب سے ایک پوسٹر شائع ہو ہندو مسلمان جسے کوئی شکایت ہو وہ اپنی شکایت اس بورڈ کو بھیج دے۔ تیسری تجویز یہ منظور ہوئی کہ ایک مشترکہ جلسہ کیا جائے جس کا ہندو مسلم رضا کار مشترکہ طور پر انتظام سنبھال لیں۔

یہ جلسہ کامیاب رہا، فیصلے ہوگئے مگر فضا میں جو کشیدگی تھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی زمانے میں "رنگیلا رسول" شائع ہوئی جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دلی میں شروع جولائی ۱۹۲۴ء میں فساد ہوا۔ اس کے بعد عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر ایک اس سے بھی بڑھ کر فساد ہوگیا اور حکیم صاحب جیسے بے بس ہوگئے ہوں۔ الزام کسے دیں ہندوؤں کو یا مسلمانوں کو۔ ملتان کے فساد کے سلسلہ میں انہوں نے وہاں مسلمانوں کو ان کی زیادتی کا احساس دلایا، روکا ٹوکا، شرم دلائی، لیکن اگر کسی موقعہ پر انہیں ہندوؤں کی زیادتی کا احساس ہوا تو پھر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ بات ہندوؤں سے کیسے

کہیں، ایک واقعہ پروفیسر مجیب نے بیان کیا ہے۔

"۱۹۲۴ء میں جب دہلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت فساد ہو رہا تھا، حکیم صاحب کی کسی معاملہ میں رائے تھی کہ ہندو زیادتی کر رہے ہیں۔ انہوں نے کسی ہندو لیڈر سے یہ نہیں کہا۔ آصف علی صاحب کو بلایا انہیں موٹر پر بٹھا کر شہر سے چار میل باہر لے گئے اور وہاں ان سے چپکے سے کہا کہ بھئی اس خاص معاملے میں زیادتی ہندوؤں کی طرف سے ہو رہی ہے۔" (۱۴)

پھر خاموشی سے انہوں نے رخت سفر باندھا اور واپس ایبٹ آباد چلے گئے۔ تو اب حالات سے دل برداشتہ ہو کر گاندھی جی سابرمتی کے کنارے گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ حکیم صاحب نے ایبٹ آباد میں چھاؤنی چھائی تھی۔ پھر ایبٹ آباد سے نکلے اور کشمیر کی طرف ہو لیئے۔ قرار ایبٹ آباد میں ملا نہ کشمیر میں دلی سے دم بہ دم حالات کی ابتری کی خبریں چلی آ رہی تھیں۔ آخر رہا نہ گیا، پھر واپس اپنے شہر جانے کی ٹھانی جاتے جاتے کچھ خیال آیا اور احمد آباد کی طرف نکل گئے اور اگلے دن اس شہر سے نکلے اور واپس دلی آ گئے۔

گاندھی جی بھی کتنے دن صبر کر سکتے تھے۔ قرار انہیں بھی نہیں تھا۔ آخر سابرمتی کے کنارے سے اٹھے اور دلی کی راہ لی۔ مولانا محمد علی رہا ہو کر آ چکے تھے۔ انہوں نے پھر کوچہ چیلان میں اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ ہمدرد، اور کامریڈ پھر جاری ہو گئے تھے۔ گاندھی جی نے آ کر انہیں کے گھر ڈیرا کیا۔ مگر ابھی انہوں نے یہاں بیٹھ کر دم ہی لیا تھا کہ کوہاٹ سے فساد کی خبر آ گئی۔

شریف منزل میں جامعہ ملیہ کی انتظامی کمیٹی کا جلسہ تھا۔ مولانا محمد علی وہاں گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر انصاری بھی آئے ہوئے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہمدرد پریس کے مولانا عبدالعلی ہانپتے کانپتے چلے آ رہے ہیں۔ ارے بھائی کیا ہوا خیر تو ہے۔ خیر کہاں۔ گاندھی جی نے برت رکھ لیا۔ سب حق دق رہ گئے، پھر سب اٹھ کھڑے ہوئے اور چلے مولانا محمد علی کے گھر کی طرف۔ گاندھی جی سے پوچھ رہے ہیں اور وہ چپ ہیں۔ ان کا آج چپ رہنے کا دن تھا۔ پرچہ پر لکھ کر بتایا کہ میرے اندر سے آواز آئی کہ جو فسادات ہو

رہے ہیں اس کا ذمہ دار تو ہے۔ سو میں نے پرائشچت کے لیئے اکیس دن کا برت رکھ لیا ہے۔

گاندھی جی کے برت کی خبر دلی میں اور دلی سے باہر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ قریب و دور سے قومی رہنما اور عقیدت مند کھینچ کھنچ کر آئے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"کمرے کے صدر میں دیوار سے تکیہ لگائے گاندھی جی بت بنے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ان کے داہنے پر حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری، بائیں پر پانیکر ایڈیٹر ہندوستان ٹائمز، دہلی، جارج جوزف ایڈیٹر انڈی پنڈنٹ، الہ آباد، سی ایس ورنگائر ایم ایل اے، اور سامنے حسرت موہانی، آصف علی بیرسٹر اور خود مولانا اور لوگ۔ ہر شخص مغموم و متاثر نظر آ رہا تھا، بجز حسرت موہانی کے۔ حکیم صاحب تو بڑے سنجیدہ آدمی اور ٹھنڈے دماغ کے تھے۔ دوسرے کمرے میں لے جا کر مجھ سے اور آصف علی صاحب سے گاندھی جی کے بیانات کا اردو ترجمہ سنا اور سن کر آنکھوں میں آنسو بھرلائے پھر وہیں واپس آ کر انہوں نے اور ڈاکٹر صاحب نے اور آصف علی صاحب سب ہی نے اپنی والی کوشش گاندھی جی کو اس رائے و عزم سے پھیرنے کی کی۔ مگر وہاں تبدیلی کی گنجائش کہاں۔" (۱۵)

پھر مولانا محمد علی کو ایک نرالا خیال آیا۔ بازار سے ایک گائے خرید کر لائے اور اسے گاندھی جی کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ گاندھی جی نے کس شوق اور عقیدت سے گائے کو دیکھا۔ مگر ٹس سے مس پھر بھی نہ ہوئے۔

چند دن مولانا محمد علی کے گھر رہ کر گاندھی جی ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی "دلکشا" میں منتقل ہوگئے۔ ایک ڈاکٹر ایک حکیم ہر وقت خدمت میں حاضر رہتے۔ ڈاکٹر انصاری قارورہ دیکھ رہے ہیں۔ حکیم صاحب کا نبض پہ ہاتھ ہے۔ سامنے مالوی جی بیٹھے گیتا کا پاٹھ کر رہے ہیں۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور دوستوں عقیدت مندوں کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر یہ ٹھہری کہ ایک ملاپ کانفرنس کی جائے اور گاندھی جی کو یقین دلایا جائے کہ

ہندو مسلمانوں میں پھر اتحاد قائم ہوگیا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو کانفرنس کے صدر بنائے گئے۔ ممتاز رہنما قریب و دور سے بلائے گئے۔ سی آر داس کو بھی تار برقی بھیج کر بلایا گیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ آئے اور آتے ہی پوچھا کہ مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ گاندھی جی نے برت رکھ لیا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے راستہ کی رکاوٹیں دور کر کے ان سے برت تڑوانا ہے۔ داس جی نے جواب دیا کہ گاندھی جی نے اپنے اندر کی آواز پر برت رکھا ہے۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ باقی رہا ہندو مسلم اتحاد کا معاملہ تو میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان۔ میری یہاں کیا ضرورت ہے۔ یہ ٹکا سا جواب دے کر دوسری ہی ٹرین سے واپس ہوگئے۔ (۱۶)

بہرحال ملاپ کانفرنس اہتمام سے منعقد ہوئی۔ ہندو مسلمان دونوں رہنماؤں کے دل اس وقت گداز تھے۔ مسائل خوش اسلوبی سے طے ہوتے چلے گئے۔ مگر بیچ میں پھر گائے آ کھڑی ہوئی، جس دن اس مسئلہ پر بحث ہونی تھی اس دن سب مسلمان رہنما شریف منزل میں جمع ہوئے اور طے یہ ہوا کہ اس مسئلہ پر مسلمانوں کی طرف سے مفتی کفایت اللہ بولیں گے۔ مگر ہوا یہ کہ مفتی صاحب کے زبان کھولنے سے پہلے مولانا محمد علی رواں ہوگئے اور عجب بیان دے ڈالا کہ اگر ہندو میری ماں یا میری بیٹی کی بھی عزت اتارنے پر آ جائیں تو میں ان سے نہیں لڑوں گا۔

اس بیان پر مسلمان بہت ناخوش ہوئے۔ قاضی عدیل جلسہ کے بعد آنکھوں دیکھا احوال یوں سناتے ہیں کہ حکیم صاحب مولانا سے کہہ رہے تھے کہ جب یہ طے ہوگیا تھا کہ مفتی صاحب کے سوا کوئی تقریر نہیں کرے گا تو آپ نے تقریر کیوں کی۔ مولانا غصے سے بولے "میں ایسا ذلیل نہیں ہوں کہ آپ مجھے ڈانٹیں"۔ (۱۷)

خیر گائے کے قضیہ کا اونٹ بھی کسی کروٹ بیٹھ ہی گیا۔ مالویہ جی بھی تو اب نرم پڑے ہوئے تھے۔ شستہ اردو میں تقریر کی اور کہا کہ جہاں کہیں گائے کی قربانی ہوتی ہے وہاں ہندو رکاوٹ نہ ڈالیں۔ جہاں نہیں ہوتی ہے وہاں مسلمان نئے سرے سے یہ قصہ شروع نہ کریں۔ مفتی کفایت اللہ نے اس پر پہلے تو بہت ہچر مچر کی وہ قربانی گاؤ کی مکمل آزادی مانگتے تھے، مگر مالوی جی نے کہا کہ مولانا جب ہم اتنا جھک رہے ہیں تو آپ بھی کچھ جھکئے۔ بس اس پر مفتی صاحب موم ہوگئے۔ (۱۸)

تو لیجئے گائے کا مسئلہ بھی طے ہوگیا۔ ہندو مسلمان خوش خوش گاندھی جی کے پاس پہنچے۔ خوشخبری سنائی کہ لو مہاتما جی ہم نے سارے نزاعی مسائل طے کر لیئے۔ اب غصہ تھوک دو اور برت توڑ دو۔

گاندھی جی آخر نرم پڑ گئے۔ مگر برت توڑنے سے پہلے انہوں نے دوستوں سے کہا کہ وعدہ کرو کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیئے جان قربان کرنی پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کی طرف سے حکیم صاحب اور مولانا ابو الکلام آزاد نے یہ عہد کیا اور لیجئے گاندھی جی کا برت ٹوٹ گیا۔

گاندھی جی کا برت ٹوٹنے پر مبارک سلامت کا بہت شور ہوا۔ ہندو مسلم اتحاد کے امکانات پھر سے روشن ہونے لگے۔ آخر گاندھی جی نے اکیس روز کا کشٹ کھینچا تھا اور دوستوں عقیدت مندوں سے قسمیں لی تھیں۔ بس اسی گرما گرمی میں انہوں نے مولانا شوکت علی کو ساتھ لیا اور کوہاٹ کی طرف نکل گئے اور مولانا شوکت علی وہ تھے جن پر گاندھی جی کو سب سے بڑھ کر اعتبار تھا اور جن کا عالم یہ تھا کہ جہاں گاندھی جی کا پسینہ گرتا وہاں اپنا خون بہانے کے لیئے تیار رہتے تھے۔ مگر کوہاٹ کے دورے میں عجب ہوا۔ فسادات کے متعلق گاندھی جی کی تحقیق کچھ اور کہتی تھی، مولانا شوکت علی کی تحقیق کچھ اور بتاتی تھی۔

لائے ہیں بزم ناز سے یار خبر الگ الگ

یہ احوال دیکھ کر حکیم صاحب اور پنڈت موتی لال نہرو دونوں نے گاندھی جی کو مشورہ دیا کہ آپ اپنی رپورٹ شائع نہ کریں۔ خواہ مخواہ جگ ہنسائی ہوگی۔ گاندھی جی اس وقت تو چپ ہوگئے۔ لیکن پھر کوئی اندر سے آواز آ گئی۔ گاندھی جی کی اندر کی آواز نے بھی کیسے کیسے مسائل پیدا کئے۔ تو انہوں نے پہلے "ینگ انڈیا" کے کالم میں اظہار خیال کیا۔

"ہم دونوں نے انہیں یکساں حقائق و واقعات سے اپنے اپنے طور پر جو نتائج مرتب کئے ہیں ان میں بہت فرق ہے۔ گواہوں کی پیش کردہ شہادتوں پر جس طرح اور جس حد تک ہم نے اعتبار کیا ہے اس میں بھی بہت فرق ہے۔ جب ہمیں اپنے درمیان اس فرق و اختلاف کا پتہ چلا تو ہم دونوں کو بہت افسوس ہوا اور ہم نے ایک دوسرے

کے قریب آنے کی بہت کوشش کی۔ ہم نے اپنے ان اختلافات کے سلسلہ میں حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری سے بھی رجوع کیا اور ان سے رہنمائی چاہی۔ خوش قسمتی سے موتی لال جی بھی ہماری اس بحث کے موقع پر موجود تھے۔ اس بحث سے کوئی ایسا نتیجہ برآمد نہیں ہوا جو ہمیں اپنے اپنے نقطہ نظر میں کوئی بڑی تبدیلی کرنے پر مائل کرتا۔ یہ بحثیں دہلی میں ہوئی تھیں۔ حکیم صاحب نے جو مشورے دیئے تھے اور جن کی تائید کسی حد تک پنڈت موتی لال جی نے بھی کی ان پر بھی ہم نے غور کیا۔ ان مشوروں کا تو حاصل یہی تھا کہ ہم اپنے بیانات شائع نہ کرائیں۔ (۱۹)

تو حکیم صاحب اور پنڈت موتی لال نہرو دونوں کا مشورہ تھا کہ آپ اپنی رپورٹیں شائع نہ کرائیں۔ مگر بالاخر گاندھی جی نے اپنی رپورٹ شائع کرا دی اور جواز یہ پیش کیا کہ لوگوں کو پتہ چلنا چاہیے کہ ہم نے اپنی سی بہت کوشش کی ہے کہ ہمارے نقطہ نظر میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ مولانا شوکت علی نے گاندھی جی کے اس اقدام پر تاؤ کھایا اور جواب آن غزل کے طور پر اپنی رپورٹ شائع کرا دی۔

گاندھی جی اور علی برادران کل تک کتنے شیر و شکر تھے۔ کوہاٹ کا سفر اس اتحاد کو راس نہیں آیا۔ اس مثالی ہندو مسلم اتحاد میں یہ پہلی دراڑ تھی۔ حکیم صاحب بیچارے منہ دیکھتے رہ گئے۔

حواشی

۱۔ بیٹوئن ٹو امپائرز۔ صفحہ ۲۱۱
۲۔ دہلی، بیٹوئن ٹوا امپائرز۔ صفحہ ۲۰۷
۳۔ مہاتما گاندھیز آئیڈیاز، مرتبہ سی ایف اینڈ ریوز صفحہ ۳۷۰ تا صفحہ ۳۷۲۔
۴۔ تحریک خلافت، از قاضی عدیل عباسی صفحہ ۲۴۵۔
۵۔ آٹو بایو گرافی، ڈاکٹر راجندر پرشاد صفحہ ۱۸۱
۶۔ آٹو بایو گرافی، ڈاکٹر راجندر پرشاد صفحہ ۱۸۱
۷۔ آٹو بایو گرافی، ڈاکٹر راجندر پرشاد صفحہ ۱۸۱

۸۔ آٹو بایو گرافی، ڈاکٹر راجندر پرشاد صفحہ ۱۸۱
۹۔ آٹو بایو گرافی، ڈاکٹر راجندر پرشاد صفحہ ۱۸۱
۱۰۔ لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی، ص ۳۲۳
۱۱۔ سیرت اجمل صفحہ ۱۸۶
۱۲۔ سیرت اجمل صفحہ ۱۸۷
۱۳۔ سیرت اجمل صفحہ ۱۹۱
۱۴۔ پروفیسر مجیب کی ریڈیائی تقریر مطبوعہ رسالہ جامعہ جنوری ۶۷ء صفحہ ۵
۱۵۔ محمد علی (ذاتی ڈائری کے چند ورق) از عبدالماجد دریا بادی صفحہ ۱۷۳-۱۷۲
۱۶۔ تحریک خلافت--- قاضی عدیل عباسی صفحہ ۲۵۲
۱۷۔ تحریک خلافت--- قاضی عدیل عباسی صفحہ ۲۵۱
۱۸۔ تحریک خلافت، قاری محمد عدیل عباسی صفحہ ۲۵۲
۱۹۔ ینگ انڈیا، مورخہ ۱۹۲۵ء بحوالہ حکیم اجمل خاں از ظفر احمد نظامی صفحہ ۲۲۵

تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

۱۹۲۴ء کے وہ آخری ایام تھے جب دلی کے آس پاس کی بستیاں ایک بڑے سیلاب کی زد میں آ گئی تھیں۔ دلی میں ایک امدادی کمیٹی سیلاب زدوں کی امداد کے لئے قائم ہوئی۔ حکیم صاحب اس کے صدر بنائے گئے۔ بس اب اپنا مطب تھا یا امدادی کمیٹی تھی۔ حکیم صاحب اب مریضوں اور سیلاب زدوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ ایک ٹانگ مطب میں، دوسری ٹانگ امدادی کاموں کے کیمپ میں۔

۱۹۲۵ء کے کہیں وسط تک جا کر امدادی کاموں سے فراغت ملی۔ بس فوراً ہی مراد آباد جانا نکل آیا۔ مگر وہاں انہیں دردِ قولنج نے آن پکڑا۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ میزبان نے کہ وہاں کے ایک رئیس شیخ رحمت اللہ تھے دلی تار دیا۔ وہاں سے حکیم صاحب کے صاحبزادے جمیل خاں اور چند دوسرے افراد خاندان بھاگم بھاگ مراد آباد پہنچے اور حکیم صاحب کو لے کر آئے۔

تو حکیم صاحب مراد آباد سے درد قولنج لے کر دلی آ گئے۔ درد کو آرام آ گیا۔ حکیم صاحب کو آرام نہیں ملا۔ مہینہ ختم نہیں ہوا تھا کہ طبیہ کالج اور طبیہ کانفرنس کے سالانہ جلسوں کی فکر سر پر سوار ہو گئی۔ یہ جلسے شروع مارچ میں منعقد ہونے تھے۔ مگر تیاری تو ابھی سے شروع تھی۔

طبیہ کانفرنس اور طبیہ کالج کے سالانہ جلسوں کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ اسی ہنگام نواب رامپور دلی میں آ نکلے۔ یہاں آ کر انہوں نے طبیہ کالج کا بھی دورہ کیا۔ حکیم صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کر ڈالا۔

ادھر نواب صاحب رخصت ہوئے اور ادھر طبیہ کانفرنس کا اجلاس پنڈت موتی

لال نہرو کی صدارت میں شروع ہو گیا۔ ۲۷ فروری کو شروع ہوا اور یکم مارچ تک جاری رہا۔

ویدک اور یونانی دونوں طبوں کی ترقی اور اصلاح کا جو تصور وہ رکھتے تھے اس کا پورا اظہار اس تقریر میں ہوتا ہے جو انہوں نے اس موقعہ پر کی۔ کہا کہ

"اب وقت آ گیا ہے کہ دیسی طبوں کو حالاتِ حاضرہ کے مطابق سانچہ میں ڈھالا جائے، اور موجودہ کورس میں اصلاح کی جائے۔ ہم خواہ طبیب ہوں یا وید اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جس وقت تک اپنی طبوں کی کمزوریوں کو دور نہ کریں .....

"کیا آپ مجھے طب یونانی کے بارے میں مطمئن کر سکتے ہیں کہ اس میں جملہ وہ مسائل جو موجودہ زمانے میں پائے جاتے ہیں یا طب یونانی کے جس کورس کو آپ پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں کیا اس میں یونانی طب کے تمام مسائل موجود ہیں۔ یقیناً بہت باتیں ہماری کورس کی کتابوں کے اندر نہیں ہیں لیکن طب یونانی میں موجود ہیں۔ سینکڑوں بیماریاں ایسی ہیں جن کا بیان طب یونانی کی مختلف کتابوں میں دیکھا گیا ہے مگر کتب درسیہ میں وہ نہیں ہیں۔ کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ اس کمی کو پورا کریں۔ تشریح کے بہت سے مسائل قانون شیخ کے اندر پائے جاتے ہیں کیا ہم کو یہ نہیں چاہیے کہ بہت سے وہ مسائل جو جدید تحقیقات سے روشنی میں آ چکے ہیں ان کو داخل کیا جائے....

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ پر لازم اور فرض ہے کہ آپ اپنے کورس کی اصلاح کریں اور جدید تالیفات تیار کر کے ان کو مکمل کر دیں۔

"جب آپ اس راستہ میں قدم رکھیں اور تحقیقات کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ سدیدی، نفیسی، حمیات قانون وغیرہ آپ کے لیئے کافی نہیں ہیں۔ آپ کو پرانی کتب کی کھوج اور تلاش کر کے جدید تحقیقات کے ساتھ ملا کر نیا کورس بنانا ہو گا اور تمام مسائل کو اس میں داخل کرنا ہو گا۔" (1)

حکیم صاحب کی ایک کوشش یہ تھی کہ طب کی تحریک کو صرف اطباء کی حد تک نہ رکھا جائے بلکہ اسے قومی تحریک کا حصہ بنا دیا جائے۔ اس لیئے انہوں نے یہ اہتمام کیا تھا کہ نامور قومی شخصیتوں اور رہنماؤں کو طبیہ کالج کے جلسوں میں مدعو کرتے تھے۔ ان سے صدارتیں کراتے تھے۔ طبیہ کالج کو اور مجوزہ طبیہ یونیورسٹی کو وہ سوراج کا لازمی جز مانتے تھے۔ اس موقعہ پر انہوں نے جو اپنی رپورٹ پیش کی وہ ان کے اس تصور کی عکاس ہے۔ کہتے ہیں۔

''حضرات، وقت آ گیا ہے کہ ہماری اس طبی تحریک کو ہندوستان کی ترقی کے پروگرام میں اس کے مناسب حال جگہ دی جائے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان کی دونوں بڑی قومیں ہندو اور مسلمان بیدار ہو جائیں۔ اور آیورویدک اور یونانی طب کے لیئے نہ صرف یہ کہ اپنے فرض کا احساس کریں بلکہ اس فرض کو ادا کریں اور ان طبوں کی باقاعدہ اور بااصول تعلیم کے کام میں ہمدردانہ شرکت عمل کے ساتھ حصہ لیں۔ صرف یہی ایک راستہ ان طبوں کی بقا اور ترقی کا ہے۔ صرف باقاعدہ اور مکمل تعلیمی انتظامات ہی انہیں موجود پستی کی حالت سے نکال سکتے ہیں اور بامِ رفعت و ترقی تک لے جا سکتے ہیں۔ اب ہماری منزلِ مقصود آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج کی شکل میں ہم سب کے سامنے موجود ہے۔ اس منزل تک پہنچنے میں پینتالیس برس خاموش اور لگاتار کوششوں کے ساتھ بسر کرنے ضروری ہوئے ہیں۔ لیکن آئندہ صرف دس برس میں یونانی طب اورویدک میں انقلاب عظیم کا ظہور ہو سکتا ہے ....

''یونانی طب اور ویدک براعظم ایشیا کے وہ مایۂ افتخار طبی علوم ہیں جو صدیوں سے دنیا کے لیئے براہ راست یا بالواسطہ نفع رسانی کا ذریعہ رہے ہیں اور اب تک ہیں۔ ان طبوں کی تاریخ ان کی عظمت اور دل آویزی کی سچی داستان ہے جو ہر ایک محب بنی نوع انسان کے دل میں ان کی عزت و محبت کا احساس پیدا کر سکتی ہے۔ ان طبوں نے یہی نہیں کہ بے شمار انسانوں کو اس زمانے میں جب ان کے سوا دنیا میں کہیں بھی کسی

دوسری طب کا وجود نہ تھا آرام اور فائدہ پہنچایا بلکہ مغربی طب جو آج
اپنے ترقی یافتہ عملیات اور شاندار ساز و سامان کے ساتھ دنیا کے بڑے
حصے پر حکمران ہے اسے اپنے بطن سے پیدا کیا ہے اور اس کی نشوونما اور
ترقی میں اپنی شرکت کا ایسا اثر یادگار چھوڑا ہے جسے بالغ نظر محققین آج
بھی صحت و صفائی کے ساتھ دیکھتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ ان طبوں کا مٹ
جانا انسان کی دماغی اور اخلاقی قوتوں کے ظہور عجائبات کا اور بنی نوع کی
ایک مشترکہ میراث کا فنا ہو جانا اور ہندوستان کی ہندو اور مسلمان دونوں
بڑی قوموں کے سرمایۂ فخر کا دنیا سے اُٹھ جانا ہے۔" (۲)

یوں طبی کانفرنس بخیر و خوبی تمام ہوئی۔ حکیم صاحب نے اس طرف سے فراغت پائی اور خلافت کمیٹی کی طرف متوجہ ہوئے جس کا ۴ مارچ کو جلسہ ہونا تھا۔ تقریب جلسہ کی یہ تھی کہ جو وفد حجاز گیا تھا ناکام واپس آ گیا تھا۔ جامع مسجد میں اپنی روئداد پہلے ہی سنا چکا تھا۔ اب خلافت کمیٹی کے جلسہ میں روئداد سنی جانی تھی اور اس پر غور و فکر کیا جانا تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے جس خواب کی تعبیر ترکی میں نہیں ملی تھی اب وہ اس خواب کی تعبیر حجاز میں تلاش کر رہے تھے۔ شریف حسین کی شہرت یہ تھی کہ انگریزوں کا پٹھو ہے۔ اس لئے اسے تو ہندوستانی مسلمانوں نے رد کر دیا تھا۔ اپنی امیدیں اب انہوں نے ابن سعود سے وابستہ کی تھیں اور مولانا محمد علی تو سچ مچ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ مردِ حق آگاہ ان کے مشوروں کو مانے گا اور حجاز میں خلافت الہیہ کی داغ بیل ڈالے گا۔ اگرچہ مولانا محمد علی کے مرشد مولانا عبدالباری نے اس شخص کی وہابی فکر کو دیکھتے ہوئے اس پر کسی قسم کا اعتبار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ویسے ابن سعود نے شروع میں خلافتی رہنماؤں کو خلافت کا سبز باغ دکھایا تھا اور کچھ اس طرح سے نقشہ باندھا تھا جیسے اسے حجاز پر حکومت کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تو بس حجاز کے باشندوں کو شریف حسین کے ظلم و جبر سے نجات دلانے کے لئے میدان میں اترا ہے۔ وہ دفع ہو جائے، پھر بیشک حجاز کے لوگ جسے چاہے اسے منتخب کریں۔ اور مکہ تو ہے ہی مسلمانانِ عالم کا مرکز۔ تو وہاں کے متعلق جو بھی فیصلہ ہو گا مسلمانانِ عالم کے مشورے

سے ہو گا۔ سو مسلمانانِ عالم کی ایک نمائندہ کانفرنس مکہ میں منعقد کی جائے گی۔ اس مضمون کا خط مختلف مسلمان رہنماؤں کو بھیجا گیا۔ ایسا ہی خط حکیم صاحب کو موصول ہوا تھا۔ خلافتی رہنما اس بھرے میں آ گئے۔ جلد ہی ایک وفد سید سلیمان ندوی کی قیادت میں ترتیب دیا گیا اور وہ ابن سعود سے ملاقات کے لئے روانہ ہو گیا۔

یہ وفد اس نیت سے گیا تھا کہ ابن سعود سے ملاقات کر کے اس کے سامنے یہ تجویز پیش کی جائے کہ حجاز میں ایک اسلامی جمہوریہ قائم ہونی چاہیے۔ مگر اس وفد کو ابن سعود کے حضور میں باریابی حاصل نہیں ہوئی۔ جس علاقے پر اس کا قبضہ تھا اس میں داخلہ ہی کی اجازت نہیں ملی۔ پس یہ لوگ جدہ تک پہنچ سکے جس پر ابھی تک شریف حسین کے بیٹے کا قبضہ تھا۔ جدہ ہی سے یہ لوگ واپس آ گئے۔

ابن سعود کو جب شریف حسین کے خلاف پوری کامیابی حاصل ہو گئی تو اس نے وہ کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں صف ماتم بچھ گئی اور مولانا محمد علی اور ان کے ہمنواؤں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ لیکن ابھی وہ منزل نہیں آئی تھی۔ مایوسی کی یہ پہلی قسط تھی جو خلافتی وفد کے واسطے سے ہندوستانی مسلمانوں کو ادھر سے موصول ہوئی تھی۔

بعد میں اسلام کی مقدس شخصیتوں کے مزارات ڈھائے جانے اور مبارک آثار مٹائے جانے کی خبریں آئیں اور پھر ابن سعود کے مٹھی بھر حامی ایک طرف اور باقی مسلمان دوسری طرف۔ مگر حکیم صاحب یہ محشر بپا ہونے سے پہلے ہی لمبے سفر پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔

"میرے محترم بھائی ڈاکٹر انصاری صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ اگر تم آرام کرنے کے خیال سے سفر کرنا چاہتے ہو تو میں تمہارا ہمسفر برابر رہوں گا۔ ان کی اس برادرانہ محبت و ہمدردی نے جس کا میں شکرگزار ہوں بالآخر مجھے اس سفر پر آمادہ کردیا۔" تو ہم سفر کو ساتھ لیا اور چل پڑے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء کو بمبئی سے روانہ ہوئے اور ۱۷ اپریل کو پورٹ سعید پر جا اُترے۔

حکیم صاحب نے اپنی دانست میں اس سفر کے ساتھ ان سب قصوں قضیوں سے جن میں وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے گھرے ہوئے تھے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا۔ مگر

خلافت کا قضیہ تو ان کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ مصر میں قدم رکھا تو مصری اکابرین کے ساتھ اس قضیے نے بھی بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ اس سفر کی یادیں روزنامچہ کی صورت انہوں نے قلم بند کی تھیں۔ جو جستہ جستہ "سیرت اجمل" میں نقل کیا گیا ہے۔ وہاں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

"مصر کے دو گروہوں میں سے ایک گروہ علمائے ازہر کا ہے۔ انہوں نے خدمت خلافت کے لئے ایک انجمن بنائی ہے جس کے رئیس شیخ الازہر ہیں .... اس انجمن کا رجحان یہ ہے کہ مستقر خلافت قاہرہ ہو۔

"دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو سید ابوالعزائم صاحب کا احترام کرتے اور مسئلہ خلافت کو وسیع نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس گروہ کی بھی ایک انجمن ہے جو خلافت کے لئے اپنے مخصوص خیالات کے مطابق کام کر رہی ہے۔ اس کمیٹی کے پریذیڈنٹ جناب السید ابوالعزائم ہیں۔

"ہمیں افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ نفاق جو مسلمانوں کی علامات میں سے ہے اور جس نے کم و بیش تمام اسلامی ممالک میں اجارہ لے رکھا ہے۔ مصر کے مسلمانوں میں بھی مسئلہ خلافت کے متعلق اچھی اور نمایاں قوت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس لئے جتنی دیر تک ہم اپنے مصری بھائیوں سے خلافت کے متعلق بات چیت کرتے رہے یہ نفاق ہمیں ممتاز طور پر نظر آتا رہا۔ ہم نے تمام باتوں کو سننے کے بعد بالآخر یہ کہا کہ ہم ان مقامی اختلافات سے واقف نہیں ہیں اس لئے جب ہم واپسی میں مصر آئیں گے اور یہاں ایک دو ہفتہ قیام کرلیں گے اس وقت کوشش کریں گے کہ کم سے کم اس دینی اہم مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے ہمارے مصری بھائی متحدہ طاقت کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم رکھیں۔ میں نے الحسنی المار دینی سے جو مسئلہ خلافت سے خاص طور پر شغف رکھتے ہیں یہ خواہش کی کہ وہ براہ مہربانی ہماری واپسی تک اس بدنما اختلاف کو دُور کرنے کے لئے کوشش کرتے رہیں۔"

اس فضا میں حکیم صاحب نے چند دن مصر میں گزارے۔ پھر وہاں سے نکل کر

۲۳ اپریل کو پیرس پہنچے۔ خلافت کے قضیے سے بالآخر انہیں چھٹکارا مل گیا۔ پیرس کے تو زمین و آسمان ہی دوسرے تھے۔ یہاں ان کی سرگرمیاں اور قسم کی تھیں۔ درمیان میں عید آ گئی۔ عید کی نماز انہوں نے افغانستان کے سفارت خانے میں جا کر پڑھی۔ وہاں موجود مسلمان بھائیوں سے عید ملی۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ یعنی کچھ اپنا علاج معالجہ، باقی پیرس کے کتب خانوں کا معائنہ۔ پیرس کی نیشنل لائبریری میں صبح ہی صبح جا پہنچنا دن بھر مخطوطات کے ساتھ مغز سوزی کرنا، شام کو واپس آنا۔ مخطوطات کے شعبہ کے مہتمم پروفیسر بلوشے سے چند ہی دنوں میں ایسا ربط و ضبط ہوا کہ پروفیسر صاحب حکیم صاحب کے پاس ہوٹل میں آن پہنچتے اور پھر مشرقی کتابوں کی بالخصوص طب کی کتابوں پر گفتگو چھڑ جاتی۔ بعض نادر طبی کتابوں کی فوٹو کاپیاں انہیں پروفیسر صاحب کے واسطے سے انہوں نے طبیہ کالج کی لائبریری کے لیئے حاصل کر لی تھیں۔ ان قلمی نسخوں کے ذخیرے میں شناوری سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قدیم فن جراحی کا پتہ چلایا جائے۔ (۳)

لگے ہاتھوں پیرس کے تھیٹر کی بھی ایک جھلک دیکھ لی۔ بس ایک ہی جھلک کو کافی جانا اور آئندہ کے لئے کان پکڑا۔ حکیم صاحب دلی کی شائستگی کا نمونہ روایتی اخلاقیات کے قائل۔ پیرس کے سٹیج کی بے تکلفی انہیں کیسے برداشت ہوتی۔

پیرس میں حکیم صاحب نے ایک مہینہ گزارا۔ ۲۴ مئی کو وہ سوئٹزرلینڈ روانہ ہوئے۔ وہاں جھیل لیمان کے کنارے لوزین نام کا ایک صحت افزا مقام تھا جہاں چندے قیام کیا۔ خلافت کا قضیہ پیچھا کرتے کرتے اس پرفضا مقام پر بھی آن پہنچا۔ وہ اس طرح کہ یہاں ڈاکٹر انصاری کے ایک پرانے مصری دوست فواد سلیم مل گئے جو مصطفیٰ کامل پاشا کی جماعت کی یادگار تھے۔ ان کے واسطے سے چند ایک ترکوں و نیز مصریوں سے ملاقات ہو گئی۔ لیجئے مسئلہ خلافت پھر موضوع گفتگو بن گیا۔ مگر ترک دوستوں کا ایک مصرف حکیم صاحب نے یہ ڈھونڈا کہ ان سے ترکی زبان سیکھنی شروع کر دی۔

کبھی سوئٹزرلینڈ کے کسی پرفضا مقام پر کبھی فرانس کے کسی تاریخی شہر میں۔ اور جہاں جاتے ہیں کوئی ترک مل جاتا ہے، یا کوئی مصری یا کوئی ہندوستانی۔ عبدالرحمٰن صدیقی، اقبال شیدائی، شفیق رشید، اور ایسی کتنی ممتاز شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں،

عہد کے مسائل پر تبادلہ خیال ہوا۔ خبر ملی کہ ویانا میں ایک طبی نمائش ہو رہی ہے۔ اس نمائش کی دید کی غرض سے ویانا گئے۔ نمائش دیکھی۔ طبیہ کالج کے لیئے کچھ اشیاء خریدیں۔ مگر اسی کے ساتھ اس سفر میں ایک کام اور ہوا۔ اس کا احوال حکیم صاحب سے سنیئے۔

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ان عزیزوں نے جو برلن میں تعلیم پا رہے ہیں اور جامعہ کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے ہیں ایک تعلیمی خاکہ کھینچا تھا۔ انہوں نے برکت علی صاحب، خواجہ عبدالمجید صاحب، عابد حسین صاحب اور مجیب صاحب کو ہمارے پاس اس غرض سے بھیجا ہے کہ ہم بھی اس تعلیمی سکیم پر غور کرلیں۔ اور اپنی رائے بھی ان پر ظاہر کر دیں۔ اب یہ سب لوگ ۱۰ جولائی کو ویانا پہنچے۔ اور یہ دن ان لوگون سے گفتگو و شنید میں صرف ہوا۔"

آگے وینس کا سفر ہے جہاں دو دن قیام رہا۔ مسافر نے وینس کے سفر کی روئداد یوں سنائی۔

"عبدالرحمٰن صاحب صدیقی نے ہمیں چچرونی یعنی گائیڈ نہیں لینے دیا۔ اور خود اس کی جگہ زبردستی حاصل کرلی۔ ایسی حالت میں اگر میری معلومات کا کوئی حصہ صحت سے عاری ہو تو اس کے ثواب کا استحقاق ہمارے چچرونی صاحب کے سوا کسے ہو سکتا ہے۔ ان رہنما نے ایک ایسی تصویر کو دیکھ کر جس میں ڈوش کسی شخص سے اپنے ارکان دولت کی معیت میں مل رہا ہے مجھ سے فرمایا کہ یہ ڈوش کا دربار ہے لیکن اس کے فوراً بعد یہ ارشاد کیا کہ یا یہ کوئی بادشاہ اس سے ملنے آیا ہے۔ ایسی حالت میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے چچرونی صاحب کس طرح واقعات کے دھندلے چہرے کو قیاس کے قلم سے روشن کرکے ہمیں دکھاتے اور اپنی واقفیت کا اثر ہمارے دلوں پر جماتے رہے۔ ان کی اس قسم کی رہنمائی پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا جو میں نے ان سے بیان کر دیا کہ ایک امریکن سیاح سیاحت کی غرض سے افریقہ کی سرزمین میں داخل ہوا اور شہر کی

آبادی میں سے ایک عرب رہنما کو اس نے اپنے ساتھ لے کر سفر کرنا شروع کر دیا۔ راستہ میں سیاح نے ایک خوبصورت پرند دیکھ کر اس کا نام اپنے رہنما سے دریافت کیا۔ گو یہ رہنما اس پرند کے نام سے واقف نہ تھا لیکن یہ بھی واقعات کے دھندلے چہروں کو حاضر جوابی سے روشن کرنے میں بہت کم تامل کیا کرتا تھا۔ اس لئے اس نے فوراً یہ جواب دیا کہ اس خوشنما پرندہ کا نام ہماری زبان میں ناش ہے۔ اس کے بعد امریکن سیاح نے ایک اور چڑیا دیکھی اور رہنما سے اس کا نام دریافت کیا۔ اس نے بغیر تامل اس کا نام کمناش بتا دیا۔ امریکن سیاح نے بہت احتیاط سے اپنی نوٹ بک میں ان دونوں پرندوں ناش اور کمناش کے فرضی نام لکھ لئے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ اگر اس نے سفرنامہ لکھا ہو تو ان دونوں افریقہ کی چڑیوں کا بھی تذکرہ کیا ہو۔"

وینس تک ڈاکٹر انصاری نے ہمسفری کا حق خوب ادا کیا۔ مگر یہاں سے یاروں کی منزلیں جدا جدا ہو گئیں۔ ڈاکٹر انصاری نے ۱۴ جولائی کو قسطنطنیہ کی راہ پکڑی، حکیم صاحب مارسیلز روانہ ہو گئے وہاں سے انہیں قاہرہ جانا تھا۔ مارسیلز میں ہزہائینس نواب سر امیرالدین احمد خاں کا ساتھ رہا۔

قاہرہ ۲۲ جولائی کو پہنچے اور ۲۸ جولائی تک وہاں قیام پذیر رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان حجاز اور مصر ہر جگہ موتمر اسلامی کے انعقاد کا چرچا تھا۔ قاہرہ میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ موتمر اسلامی کا جلسہ کہاں ہو۔ علمائے ازہر اس پر زور دے رہے تھے کہ یہ اجلاس قاہرہ میں ہو اور خدیو مصر کو خلیفہ قرار دیا جائے۔ حکیم صاحب آخر انہیں حلقوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ بھی اس بحث میں شامل ہو گئے۔ مگر شاید قاہرہ میں انعقاد کے سلسلہ میں غیر جانب دار رہے۔

قاہرہ سے اگلی منزل فلسطین تھی۔ ۲۸ جولائی کو قاہرہ سے رخصت ہوئے علمائے ازہر، اراکین رابطہ ہندیہ اور دوسرے مصری احباب نے خدا حافظ کہا۔

حکیم صاحب نے ۲۸ جولائی کو چل کر ۲۹ جولائی کی مبارک صبح بیت المقدس میں قدم رکھا۔ سٹیشن پر مفتی اعظم قدس شریف، اراکین مجلس اسلامیہ اعلیٰ، قاضی شہر،

اور دوسرے معزز اصحاب استقبال کے لئے موجود تھے۔ اس مبارک شہر کو دیکھا، مقدس مقامات کی زیارت کی، شہر کی نامور شخصیتوں اور قائدین سے ملے اور ۳ اگست کو وہاں سے دمشق روانہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شام میں دروزیوں کا قبیلہ فرانسیسی سامراج کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ فلسطین اور شام کے مختلف راستے جنگ کی زد میں تھے اور مخدوش تھے۔ حکیم صاحب جب دمشق جاتے ہوئے ازرع کے سٹیشن سے گزرے تو وہ سٹیشن فرانسیسی فوجوں کا مستقر ہونے کی وجہ سے میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ تو انہوں نے جنگ کی ایک جھلک اپنی آنکھ سے دیکھ لی۔

اس علاقہ کے مختلف شہروں سے گزرتے ٹھہرتے قاہرہ پہنچے۔ قاہرہ سے پورٹ سعید۔ اور پورٹ سعید سے بمبئی۔ لیجئے سفر تمام ہوا۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کی تاریخ تھی۔ حکیم صاحب پھر ہندوستان کی سرزمین پر تھے۔ دوست احباب مداح پھُولوں کے ہار لیئے بندرگاہ پر موجود تھے۔ دم کے دم میں حکیم صاحب پھُولوں سے لدپھند گئے۔ عین اس استقبال کے بیچ کسی نے آ کر اطلاع دی کہ نواب صاحب رامپور بندرگاہ سے باہر کتنی دیر سے موٹر میں بیٹھے آپ کی راہ تکتے ہیں۔ حکیم صاحب یہ سن تیزی سے اس مقام پر گئے اور جاتے ہی نواب صاحب سے بغل گیر ہو گئے۔ نواب صاحب کہہ رہے تھے "حکیم صاحب، آپ کے انتظار میں آنکھیں پتھرا گئیں۔" پھر انہوں نے حکیم صاحب کو نظر بھر کر دیکھا اور افسردگی سے کہا "جس مقصد کے لئے آپ نے یہ سفر کیا اور میں نے فراق گوارا کیا وہ تو پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ آپ کی صحت بہتر تو نظر نہیں آ رہی۔" (۴)

دلی نے حکیم صاحب کا استقبال اس انداز سے کیا کہ ان کی آمد سے بس تین دن پہلے ہندو اور مسلمان ایک مرتبہ پھر لڑ پڑے۔ حکیم صاحب نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد جو پہلی خبر سنی وہ یہی تھی۔ ادھر علی گڑھ میں بھی رام لیلا کے بہانے ایک فساد ہو چکا تھا۔ بمبئی ہی میں ہوتے ہوئے انہوں نے ایک بیان جاری کیا جو بمبئی کرانیکل میں شائع ہوا۔ اس بیان میں انہوں نے کہا کہ۔

"مجھے اُمید تھی کہ میری واپسی تک فرقہ وارانہ اختلافات بہت حد

تک کم ہو جائیں گے لیکن یہ سن کر افسوس ہوا کہ ہندو مسلمانوں کے تنازعات اور بڑھ گئے ہیں۔ پھر بھی مایوس نہیں ہوا ہوں۔ مجھے اعتماد ہے کہ ہمارا ملک عنقریب بھلے دن دیکھے گا..... مجھے نہ صرف ہندوستان کے بلکہ سارے ایشیا کے بھلے دن نظر آ رہے ہیں گو میں متعین طور پر نہیں بتا سکتا کہ ایسا کب ہو گا۔

"تمام اسلامی ملک مثلاً شام، فلسطین، مصر وغیرہ ہمارے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ گائے کا ذبیحہ، باجے کا بجنا اور اسی طرح کی دوسری باتیں باہمی اختلاف و نفاق کا سبب کیونکر ہیں۔ وہ سب کے سب مسلمانوں سے ہی درخواست کرتے ہیں کہ وہ ذرا وسعت نظر اور کشادہ دلی سے کام لیں۔

"یہ نہایت شرم کی بات ہے کہ نہ صرف ہندو مسلمانوں میں اختلافات ہیں بلکہ ہندو ہندوؤں سے لڑ رہے اور مسلمان مسلمانوں سے جنگ کر رہے ہیں۔ جب تک ہم میں سے ہر فرد اس موقع کی اہمیت کو نہ سمجھے گا یہ حالت ختم نہ ہو گی۔" (۵)

اخبار "خلافت" کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "ضرورت تو یہ تھی کہ ہندوستان آزادی ایشیا کا علم لے کر نکلتا مگر کس قدر یہ باعث شرم ہے کہ نہ صرف ہندو مسلمان بلکہ مسلمان مسلمان اور ہندو ہندو لڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔" (۶)

صورت حال اس وقت یہی تھی۔ ہندوؤں میں کم مسلمانوں میں زیادہ ٹھنی ہوئی تھی۔ ابن سعود نے قبے گرا کر اور مقدس شخصیتوں کے مزاروں کو مسمار کر کے ہندوستان کے مسلمانوں میں فساد کا بیج بو دیا تھا۔ ادھر مسلمان اس پر لڑ رہے تھے کہ ابن سعود کا یہ فعل جائز ہے یا ناجائز ادھر ابن سعود نے وہ گل کھلایا کہ اس کے حامی اور مخالف دونوں ہی منہ تکتے رہ گئے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ابن سعود نے ہندوستان کے مسلمان اکابرین کو خطوط لکھ کر بہت سے وعدے وعید کئے تھے اور ان سے شریف حسین کے خلاف جنگ میں تعاون چاہا تھا۔ ایک خط حکیم صاحب کو بھی اس کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ لکھا

تھا۔

"ہمیں آپ کی جماعت سے ہر فرد کے متعلق یمن و سعادت کی توقع ہے، اور یقیناً ہماری یہ سعادت ہے کہ ہم اپنا ہاتھ آپ کے دست کرم کی جانب اسلام اور مسلمانوں اور بلاد مطہرہ کی خدمت گزاری کے لئے بڑھائیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے باہمی تعاون علی الخیر سے تمام اسلامی جماعتوں کے لئے سعادت کے راستے کھل جائیں گے۔

"جناب والا، مجھے جنگ و فساد و شر سے محبت نہیں۔ میرے نزدیک سکون و سلامتی سے محبوب تر کوئی شے نہیں۔ لیکن ہمارے معزز پڑوسیوں نے پندرہ برس ہمیں جنگ وجدل پر مجبور رکھا۔ اور کسی وجہ سے نہیں بلکہ ہماری املاک و مقبوضات پر طمع و حرص کی وجہ سے انہوں نے حج اور مسجد حرام کے دروازے ہم پر بند کر دیئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لئے یکساں قرار دیا ہے۔ بیت مطہرہ کو ہر قسم کی مہملات سے مملو کر دیا کہ جسے کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم نے بلادِ حرام اور تمام مقامات مقدسہ کی تطہیر کے لئے علم جہاد بلند کیا تاکہ ان کو اس خاندان سے پاک کریں جس نے حسن مفاہمت اور حسن نیت کی کوئی راہ باقی نہیں چھوڑی۔ میں خدا کی قسم حجاز پر نہ تسلط چاہتا ہوں نہ ملکیت۔ حجاز میرے ہاتھوں میں صرف اس وقت تک امانت ہے جب تک کہ حجازی اپنے ملک کے لیئے خود حاکم و والی منتخب کریں جو عالم اسلامی کا مطیع اور اسلامی معزز جماعتوں مثلاً ہندوستانیوں وغیرہ کا ماتحت ہو۔" (۷)

آگے چل کر اس خط میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ "حجاز کی حدود، مالیات قضا اور اداروں کے دستور و ضوابط کی تشکیل و تعین عالم اسلامی کے منتخب شدہ نمائندے کریں گے...... یہ ہماری نیت ہے اور مستقبل میں انشاء اللہ اس پر عمل کریں گے۔" اسی کے ساتھ درخواست کی گئی تھی کہ "ہمیں بڑی اُمید ہے کہ آپ اپنے مندوبین کی روانگی میں جلدی کریں گے۔ اس موتمر کی تاریخ انعقاد کے متعلق بیان باقی ہے جس کی اطلاع آئندہ دین گے۔" (۸)

اب ۱۹۲۵ء کے آخری مہینے تھے ابن سعود کی کامیابی کے امکانات روشن ہوتے جا رہے تھے۔ اسی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی توقعات بڑھتی جا رہی تھیں۔ خلافت تحریک کے رہنما سمجھ رہے تھے کہ ان کے خواب کی تعبیر بس ملنے والی ہے۔ اسی جوش میں ایک دفعہ پھر ایک وفد بھیجنے کے اہتمام ہونے لگے۔ اب کے جو بزرگ وفد میں شامل ہوئے تھے وہ مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد عرفان اور شعیب قریشی تھے۔ یہ اکتوبر کا واقعہ ہے۔ وسط اکتوبر میں حکیم صاحب رامپور گئے۔ مگر شتابی سے واپس آ گئے۔ آخر حجاز کو جانے والے وفد کو منتوں مرادوں کے ساتھ رخصت کرنا تھا۔ آخر اکتوبر میں یہ وفد خلافت تحریک کے رہنماؤں کی دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوا۔

وفد کو رخصت کر کے حکیم صاحب جامعہ ملیہ کے سالانہ اجلاس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

۱۹۲۵ء کے ختم ہوتے ہوتے حجاز کا معرکہ بھی سر ہو گیا۔ ابن سعود فتح یاب ہوا۔ شریف حسین کو شکست فاش ہوئی۔ لیجئے وعدوں کے ایفا کا وقت آ گیا۔ کانفرنس کے انعقاد کا وعدہ تو بہرحال پورا ہوا ۱۹۲۹ء کے آغاز کے ساتھ ساتھ کانفرنس کے انعقاد کی خوشخبری ملی۔ اور دعوت نامہ موصول ہوا کہ تشریف لائیے اور موتمر میں شرکت کیجئے۔ پچھلے وعدے پھر دہرائے گئے۔ تحریک خلافت کے اکابرین کتنے خوش تھے۔ سب سے بڑھ کر مولانا محمد علی خوش تھے جو یہ تصور کئے بیٹھے تھے کہ حجاز اب ایک اسلامی جمہوریہ بنے گا، ایک مثالی مملکت۔ اسی گرما گرمی میں انہوں نے اپنے مرشد مولانا عبدالباری سے بھی بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔ آخر ابن سعود کے مخالف سے وہ کب تک نباہ کر سکتے تھے۔ مگر عجب ہوا کہ ۱۳ جنوری ۱۹۲۹ء کے ہمدرد میں ان کا یہ دھماکہ خیز اعلان شائع ہوا۔ اور اسی تاریخ کو یہ دھماکہ خیز خبر آئی کہ ابن سعود نے اپنی بادشاہیت کا اعلان کر دیا۔ مولانا محمد علی پہ تو جیسے بجلی گر گئی۔ تحریک خلافت کے سب ہی زعما سکتہ میں آ گئے۔ ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد یہ دوسرا بڑا سانحہ تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے خواب ایک مرتبہ پھر چکنا چور ہو گئے۔

صدمے سے نڈھال خلافت کمیٹی نے ابن سعود کو جواب سلطان ابن سعود تھے احتجاجی تار بھیجا اس مضمون کا کہ "اخباروں میں یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ حجازیوں نے

آپ کو بادشاہ منتخب کر لیا اور آپ نے اسے منظور کر لیا۔ ہم اُمید کرتے تھے کہ حجاز کی حکومت کا فیصلہ آئندہ موتمر میں جسے آپ نے خود مدعو کیا ہے ہو گا۔ ہم بے چینی کے ساتھ اس غیر متوقع کارروائی کے متعلق مستند اطلاع کے منتظر ہیں، کیونکہ اس سے انتشار رونما ہے۔" (۹)

سلطان ابن سعود نے معذرت لکھ بھیجی کہ میں تو بادشاہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ مگر اہل حجاز نے مجھے مجبور کر دیا۔ چار و ناچار مجھے ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے بادشاہت قبول کرنی پڑ گئی۔

اس مستند اطلاع کے بعد خلافت کمیٹی کی بے چینی خود بخود دور ہو گئی۔ لیکن مولانا محمد علی کی بے چین روح کو صبر نہیں آیا۔ بس ایک دم سے ابن سعود کے خلاف ابل پڑے۔ ابن سعود کے اقدام میں انہیں دغا اور فریب کا رنگ نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے جوش میں مسلمانوں سے اپیل کر ڈالی کہ ابن سعود کے اس اقدام کے خلاف احتجاج کے طور پر حج ملتوی کر دیا جائے۔ اور لیجئے جو ابھی تک مولانا محمد علی پر ابن سعود کی حمایت کرنے پر لعن طعن کر رہے تھے انہوں نے پینترا بدلا اور اب دوسرے زاویے سے محمد علی پر برسے۔ اب اعتراض یہ تھا کہ یہ شخص ہمیں ہمارے دینی فریضہ سے روک رہا ہے۔

حکیم صاحب پہلے بھی اس جنگ وجدل میں شامل نہیں تھے۔ اب بھی شامل نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنے لئے اس سے الگ ایک مصروفیت پیدا کر لی تھی۔ اصل میں وہ سفر سے واپسی پر ایک نیا درد ساتھ لے کر آئے تھے۔ شام اور فلسطین کے سفر کے دوران جو انہوں نے مشاہدات کئے اس میں یہ مشاہدہ بھی شامل تھا کہ فرانسیسی شام میں کیا ظلم ڈھا رہے ہیں۔ اور شام کے لوگ بالخصوص دروزی کس بے جگری سے ان کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔ تو اب ان کی مہم یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کا احساس دلایا جائے کہ شام میں کیا قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ اور مسلمانوں ہی کو نہیں، پورے ہندوستان کو وہ اس کا احساس دلا کر شام کی حمایت میں آواز اٹھانے پر آمادہ کرنے کے لیئے کوشاں تھے۔ اس مقصد سے انہوں نے ڈاکٹر انصاری کو ساتھ ملا کر گاندھی جی کو ایک طویل خط لکھا جس میں شام کے حالات تفصیل سے ان کے گوش

گزار کئے۔ اور ان سے اپیل کی کہ آپ بحیثیت صدر کانگریس جمعیتہ اقوام کو تار دیں اور اسے بتائیں کہ فرانس شام میں کیا کچھ کر رہا ہے۔ ''ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان کی موجودہ صورتِ حالات ایسے کاموں کے لئے موزوں نہیں ہے لیکن ایک ہندوستانی، ایک مسلمان اور ایک ایشیائی کی حیثیت میں کافی غور کے بعد ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ہمیں ایشیا کی تمام مظلوم اقوام کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہیے اور ان سے دوستانہ تعلقات بڑھانے چاہیں جو ہمارے اور ان کے لئے مفید ہو گا۔ (۱۰)

گاندھی جی کا جواب حوصلہ افزا نہیں تھا۔ انہیں جمعیتہ اقوام سے اپیل کرنے کے کوئی معنی نظر نہیں آتے تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ''جن درخواستوں کی کمک پر اخلاقی یا مادی کسی قسم کی بھی طاقت نہ ہو ان پر میرا عقیدہ نہیں ہے۔'' پھر کیا کرنا چاہیے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ہم بحیثیت ہندوستانی ہونے کے ہندو مسلمان عیسائی اور پارسی سب بلکہ تمام ایشیاء اس تذلیل ظلم یا ڈائر شاہی جور و جفا کے مقابلہ میں جو شام میں ہوئی یا اس کا کچھ اور نام رکھ کر اس کے مقابلہ میں اپنی عاجزی اور بیچارگی کو محسوس کریں گے اپنی عاجزی اور درماندگی کا صحیح احساس ممکن ہے کہ ہمیں ان جانوروں ہی کی نقل اتارنا سکھا دے جو طوفانی موسم کے وقت ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں تاکہ ایک سے دوسرے کو گرمی پہنچے اور ہمت بندھی رہے۔ یہ جانور کبھی ایسا نہیں کرتے کہ موسم کے دیوتا سے درخواست کریں کہ وہ اپنے غصے کو کم کر دے۔ وہ صرف اتنا ہی کرتے ہیں کہ وہ اس غصے کے مقابل اپنی حفاظت کا سامان کرتے ہیں۔'' (۱۱)

ہندوستان والوں نے گاندھی جی کی دانست میں ''جانوروں سے بھی کچھ نہیں سیکھا۔ وہ جانوروں سے گئے گزرے ٹھہرے کہ ''چاروں طرف طوفانی بادل جمع ہو رہے ہیں اور ہم بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے قریب ہو کر گرمی حاصل کریں اکیلے کھڑے کانپنے کو ترجیح دیتے ہیں یا طوفان کے دیوتا سے درخواست کرنے کو کہ وہ ذرا اپنا ہاتھ روک لے۔''

گاندھی جی طوفان کے دیوتا سے کوئی درخواست کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ سو کانگریس کی طرف سے جمعیتہ اقوام کے نام اپیل کی تجویز پروان نہ چڑھ سکی۔ مگر حکیم صاحب نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔ اب انہوں نے ہندوستان سے باہر نظر

دوڑائی کہ کن شخصیتوں سے ہمدردی کی توقع رکھی جا سکتی ہے مصطفیٰ کمال، امان اللہ خاں، رضا شاہ پہلوی، ابن سعود، سلطان فواد ایک ایک کو تار برقی بھیجا اور شام کے مظلوموں کی حمایت وامداد کی اپیل کی۔ ملک کے اندر انہوں نے یہ کیا کہ مظلومین شام کی حمایت و امداد کے لئے ایک مرکزی کمیٹی قائم کی۔ ذوالفقار علی خاں اس کے صدر چنے گئے۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری اس کے سیکرٹری بنائے گئے چندے کی مہم زور شور سے چلائی گئی۔ اور لمبی لمبی رقوم شام روانہ کی گئیں۔

مگر ہندو مسلم اتحاد کے نصب العین سے حکیم صاحب ان دنوں بھی غافل نہیں رہے۔ ہندو مسلم تعلقات میں ابتری بڑھتی چلی جا رہی تھی مگر حکیم صاحب اس پر شکستہ دل بھی بہت تھے اور اپنی سی کوشش کئے بھی چلے جا رہے تھے۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری دونوں نے مل کر یہ طے کیا کہ کسی ایسی جماعت سے جو فرقہ پرستی پر اکساتی ہے غرض نہ رکھی جائے۔ مگر وہ جماعت کونسی تھی جو فرقہ پرستی کے توڑ پر ہندو مسلم اتحاد کی تحریک چلائے۔ اس خلا کو ایک نئی جماعت نے پر کیا۔ پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے مل کر انڈین نیشنل یونین کی داغ بیل ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ روشن خیال ہندوستانیوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جائے اور فرقہ پرستی کے زہر کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

حکیم صاحب نے اس جماعت کو لبیک کہا اور اس میں شامل ہو گئے۔ یہ جولائی ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے اصل میں پنڈت موتی لال نہرو کی ساکھ ابھی تک قائم تھی۔ کتنے کانگریسی رہنما ہندو مسلم منافشات کے اثر میں آ کر اپنی ساکھ کھو چکے تھے۔ مگر پنڈت موتی لال نہرو کا دامن ابھی تک اس آلودگی سے پاک تھا مولانا محمد علی کا بھی جو کانگریسی رہنماؤں سے علی الاعلان بیزاری کا اظہار کر رہے تھے موتی لال نہرو پر اعتبار قائم تھا۔ سو انہوں نے اپنی اس حیثیت کا فائدہ اٹھایا اور انڈین نیشنل یونین میں روشن خیال ہندو اور مسلمان رہنماؤں کو اچھی خاصی تعداد میں اکٹھا کر لیا۔ مسز سروجنی نائیڈو، سرتیج بہادر سپرو، سری نواس شاستری، پی سی رے، سری نواس آئنگر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مہاراجہ محمود آباد، ڈاکٹر محمود، چودہری خلیق الزماں، تصدق احمد خاں، شیروانی، کیسی کیسی شخصیتیں جمع ہوئی تھیں۔ مگر ہوا کیا بس یہی کہ انڈین نیشنل یونین کے چند

جلسے ہوئے، نیک پاک خیالات کا اظہار ہوا۔ مگر سال کے ختم ہوتے ہوتے اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ دلی میں ایک مسلمان قاضی رشید کے سر پہ جنون سوار ہوا اور اس نے سوامی شردھانند کو قتل کر ڈالا۔

حکیم صاحب کا دل بیٹھ گیا۔ سارے کئے کرائے پہ پانی پھر گیا۔ سوامی شردھانند سے ایک زمانے میں ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ تحریک خلافت کے بعد کے حالات میں وہ ایک دوسرے سے دُور ہوتے چلے گئے۔ مگر ایک دوسرے کا احترام برقرار تھا۔ حکیم صاحب نے اس واقعہ پر بہت افسوس کیا۔ اس فعل کی بہت مذمت کی۔ مگر ان کے افسوس اور مذمت کا کیا اثر ہوتا۔ فضا میں زہر بھرا تھا، اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

حواشی

۱۔ سیرت اجمل صفحہ ۱۹۸۔۱۹۷
۲۔ سیرت اجمل صفحہ ۲۰۰۔۱۹۹
۳۔ سیرت اجمل صفحہ ۲۱۰
۴۔ ہندوستان کے مشہور اطباء مفتی حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن صفحہ ۸۔۱۰۷
۵۔ سیرت اجمل صفحہ ۳۔۲۳۲
۶۔ سیرت اجمل صفحہ ۷۔۶۲۶
۷۔ سیرت اجمل صفحہ ۲۲۷
۸۔ سیرت اجمل صفحہ ۲۴۶
۹۔ سیرت اجمل صفحہ ۳۹
۱۰۔ سیرت اجمل صفحہ ۴

دلی کو آخری سلام

گائے جو مولانا محمد علی نے گاندھی جی کو تحفتہ بھیجی تھی، مرچکی تھی اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی کا وہ برآمدہ جو جمنا ندی کے رُخ پر تھا، بہت دنوں سے خاموش اور اداس دکھائی دیتا تھا۔ گاندھی جی اس گھر میں مہمان ہوتے تھے تو اسی برآمدے میں بسیرا کرتے تھے۔ اب کتنے دن ہو گئے تھے کہ وہ اس گھر میں مہمان نہیں ہوئے تھے۔ مولانا محمد علی کے مہمان خانے نے بھی اس مہمانِ عزیز کو آخری بار ۱۹۲۴ء میں دیکھا تھا۔ جب اس نے یہاں بیٹھ کر مرن برت رکھا تھا اور جب مہمان کی خاطر بی اماں کے باورچی خانے میں گوشت کی ہنڈیا پکنی بند ہو گئی تھی۔ تب سے اب تک زمانے کا رنگ اور لوگوں کے تیور بہت بدل گئے تھے۔ کانگریسی سروں پر ٹوپی اب بھی وہی کھدر والی کشتی نما تھی مگر اب وہ ''اجمل کیپ'' نہیں رہی تھی، ''گاندھی کیپ'' بن گئی تھی۔ مولانا محمد علی، شوکت علی کا گاندھی جی سے یارانہ اور گائے کے گوشت سے پرہیز ٹوٹ چکا تھا۔ زبان کا چٹورپن اور قلم کی بے باکی واپس آ گئی تھی۔ بلا امتیاز گائے بکری کا گوشت کھاتے تھے اور ''ہمدرد'' میں ہندو رہنماؤں کو للکارتے تھے۔ ''جو تم ہم سے سیدھم سادھم سودھم، تو ہم بھی تم سے سیدھم سادھم اور سودھم اور جو تم ہم سے ٹینکر ٹانکر ٹونکر تو ہم بھی تم۔'' (۱)

حکیم صاحب اپنی وضع پر قائم تھے مگر دلوں میں ایک گرہ ادھر بھی پڑتی چلی جارہی تھی۔ حکیم صاحب اور پنڈت موتی لال نہرو اب بھی ایک دوسرے کو بھائی صاحب کہتے تھے مگر کسی قدر تامل کے ساتھ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے صحیح کہا کہ ان دونوں کی دوستی سیاسی نہیں تھی، تہذیبی پس منظر کے اشتراک کی وجہ سے تھی۔ مگر

اب وہ وقت تھا کہ سیاسی اختلافات تہذیبی رشتوں پر انداز ہو رہے تھے۔ "جب پنڈت موتی لال نہرو نے مہاسبھائیوں کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کیا تو حکیم صاحب نے مجبور ہو کر ان سے صاف کہہ دیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کوئی توقع نہ رکھیں۔" (۲) سوامی شردھانند سے تو تعلقات پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے۔ وہ کیا وقت تھا کہ یہ دونوں شخص مل کر شہر پر راج کر رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی دلی کے خاکستر میں سے اُبھرتے ہوئے مزاحمتی شہر نے ان دو شخصوں کو یک جان دو قالب پایا۔ پھر یہ نقشہ دیکھا کہ دونوں اکٹھے جامع مسجد میں داخل ہوئے اور نمازیوں نے سوامی کو سر پر اٹھایا اور منبر پر جا بٹھایا۔ مگر پھر وہی سوامی شردھانند ہندو مسلم مناقشات میں پیش پیش دیکھے گئے۔ اور اب وہی سوامی شردھانند ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ (۳)

۱۹۲۶ء سوامی شردھانند کے قتل کی خبر دے کر رخصت ہوا اور جب ۱۹۲۷ء چڑھا تو دلی کی فضا میں ایک زہر بھرا ہوا تھا۔ ہندوؤں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ گاندھی جی کے مزاج میں ایک درہمی تھی۔ وہ مسلمانوں سے ناخوش تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ لوگ "چھری اور پستول کے استعمال میں بہت بے باک ہیں۔" ادھر مولانا محمد علی تاؤ کھا رہے تھے اور ہندو رہنماؤں کو جلی کٹی سنا رہے تھے۔ حکیم صاحب چپ تھے۔ مطب کے کام سے کام رکھنا اور مریضوں کے ساتھ مصروف رہنا۔ خود بھی مریض تھے۔ صحت کو گھن لگ چکا تھا۔ بھوک جاتی رہی تھی۔ کئی کئی وقت گزر جاتے اور طبیعت کھانے پر نہ آتی۔ اور اب کھانا ہی کیا رہ گیا تھا۔ "ایک پیالی چائے، ایک یا دو انڈے، تین چار چمچے شوربے کے۔ غذا میں کمی آجانے سے نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ ہندوستان اور حکیم اجمل خاں دونوں ساتھ ساتھ ناتواں ہوئے۔ شفا دونوں کی تقدیر میں نہیں تھی۔

مرض بہت بڑھ گیا تھا مگر مصروفیات میں کمی نہیں آئی۔ سیاسی سرگرمی میں فرق ضرور آگیا تھا۔ مگر سیاسی سرگرمی گھٹی تو جامعہ ملیہ اور طبیہ کالج کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ اس پر مطب مستزاد جواب بھی مریضوں سے بھرا رہتا تھا، مگر اب غریب مریضوں پر توجہ زیادہ تھی۔

اُن موٹی آسامیوں پر توجہ کم تھی جن کا علاج معالجہ شریف منزل میں دولت

لاتا تھا۔ ریاستوں سے بلاوے آتے اور ادھر سے انکار ہو جاتا۔ پہلے اس کی وجہ قومی مصروفیات تھیں۔ اب وجہ طبیعت کی افسردگی تھی۔ مگر قومی مدوں میں چندے اب بھی اسی طرح دیئے جا رہے تھے۔ شریف منزل میں آخر قارون کا خزانہ تو دفن نہیں تھا۔ سو یہاں کا نقشہ ہرچند کہ وہی تھا مگر اس قدر آباد نہیں رہا تھا اور مولانا محمد علی پہلے جس حویلی کو دولت کدہ کہتے تھے۔ اب خدمت کدہ کہنے لگے تھے۔ "دولت کدہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا اس لئے کہ اب وہاں دولت کہاں ہے ملک و ملت کی نذر ہو چکی۔ دوسرے اس کی شہرت دولت کے باعث کبھی بھی نہ تھی۔ خدمت ملک و ملت اس گھر کا ہمیشہ شعار تھا اور آج سے زیادہ کبھی بھی یہ شعار نہ تھا۔" (۴)

گھر کی حالت یہ تھی۔ اُدھر جامعہ ملیہ کا نقشہ یہ تھا کہ دو ماہ سے استادوں کو تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ حکیم صاحب سے کچھ بن نہ پڑا تو انگلی سے انگوٹھی اتاری جس میں دس رتی ہیرا جڑا تھا۔ اسے بیچ کر دس ہزار کی رقم حاصل کی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو رقم دے کر کہا کہ فی الحال اس سے کام چلاؤ، آگے اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ آگے کی حکیم صاحب نے یہ سوچی تھی کہ جامعہ ملیہ کے لئے دورے کئے جائیں اور اہل ثروت سے عطیات لئے جائیں۔ مگر بیچ میں بیٹی کی شادی آ پڑی۔ چھوٹی بیٹی کی شادی بھورے میاں کے صاحبزادے حکیم محمود خاں سے کی۔ اس سلسلے میں ایک چائے کی تقریب ہوئی، "اس میں دہلی کے تقریباً تمام عمائد شریک تھے۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ بُعد المشرقین بھی دور ہو گیا تھا جو اہل دہلی اور رہنمایان ہند کو، جو رائے سینا میں رہتے ہیں، ایک دوسرے سے دور رکھ رہا تھا یقیناً اس دعوت کے موقع پر حکیم صاحب کا خدمت کدہ ہندوستان کا قلب تھا۔ ایک ہی وقت پر ایک ہی جگہ ہندوستان کے بہترین دماغ جمع تھے۔" (۵)

یہ شادی اواخر جنوری میں ہوئی۔ اس سے فراغت پا کر حکیم صاحب نے ہمت باندھی اور جامعہ کے لئے چندہ جمع کرنے کا خیال دل میں رکھ کر سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ شہر شہر گھومتے پھرے۔ ۱۰ فروری ۱۹۲۷ء کو پٹنہ پہنچے۔ اب بہار کی بستیاں تھیں اور حکیم صاحب تھے۔ پانچ دن تک دن رات سفر میں رہے۔ ایک ایک دن تین تین سو اور چار چار سو میل کی مسافت طے کی، تقریریں کیں، جامعہ کے لئے چندے کی

اپلیں کیں اور پھر واپس پٹنہ پہنچے۔ پٹنہ میں واپسی ۱۵ فروری کو ہوئی۔ جتنا وقت وہاں رہے مریضوں کو دیکھتے رہے۔ پھر وہاں سے نکلے اور اگلے دن دلی میں تھے کہ یہاں طبیہ کالج ان کا منتظر تھا۔

۱۷ فروری کو طبیہ کالج کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ بھوپال کی بیگم صاحبہ صدر تھیں۔ حکیم صاحب نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ تقسیم انعامات کا جلسہ شروع مارچ میں منعقد ہوا۔ اپریل میں طبی کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں جسے رامپور میں منعقد ہونا تھا کہ انہی دنوں شریف منزل میں ایک سانحہ گزر گیا۔ حکیم جمیل خاں کی اہلیہ کہ حکیم اجمل خاں کی بہو ہوئیں، دنیا سے سدھار گئیں۔ حکیم صاحب کو بہو بہت عزیز تھیں۔ اس موت کا صدمہ ان پر بھاری پڑا۔ مگر ادھر طبی کانفرنس سر پر کھڑی تھی۔ بہو کو مٹی دی اور رام پور روانہ ہو گئے۔

طبی کانفرنس بے شک دھوم دھام سے ہوئی۔ نواب رام پور نے صدارت کی۔ طبی نصاب پر نظر ثانی کے لئے کمیٹیاں بنیں۔ ایک دلی میں، ایک لاہور میں، ایک لکھنؤ میں۔ حکیم صاحب بہت سرگرم تھے مگر طبی محاذ پر یہ ان کی آخری سرگرمی تھی۔ کانفرنس میں اکٹھے ہونے والے طبیبوں نے دیکھا اور بھانپا کہ طبیب عصر کا حال اچھا نہیں۔ جس نے ایک زمانے کو شفا بخشی تھی وہ اپنی شفا سے مایوس تھا۔ تقریر کرتے کرتے افسردہ ہوئے اور بولے کہ اگلے برس کی کیا خبر ہے۔ ممکن ہے میں آپ لوگوں کے درمیان موجود نہ ہوں۔ حکیم محمد حسن قریشی بتاتے ہیں کہ ان پر یہ موڈ پچھلے ایک برس سے طاری تھا۔ (۶)

صحت گر رہی تھی اور قویٰ جواب دے رہے تھے۔ ادھر دلی کا حال بھی اچھا نہیں تھا۔ سوامی شردھانند کا قاتل عدالت میں تھا۔ ہندو ہنوز غصے میں تھے۔ دیکھتے دیکھتے مسلمان بھی غصے میں آ گئے۔ غصے کی یہ لہر لاہور سے اٹھی جہاں سے ایک اشتعال انگیز کتاب "رنگیلا رسول" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ جب یہ کتاب مسلمانوں کی نظروں میں آئی تو ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ غصے کی لہر لاہور سے اُمنڈی اور دلی کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

ڈاکٹر انصاری یورپ میں گھوم پھر کر انہی دنوں واپس آئے اور ہندو مسلم

فسادات کا نقشہ بندھا دیکھ کر پریشان ہوئے۔ سوچا کہ ہندو مسلمان بڑوں کو اکٹھا کیا جائے اور امن و آشتی کی باتیں کی جائیں۔ مگر کیسے اور کہاں؟ مولانا محمد علی نے کہا کہ "دہلی میں ایک پرانا اور شریف ترین خاندان، خاندانِ شریفی ہے جو اس انتشار کی حالت میں بھی ایک اجتماعی کیفیت پیدا کر دیا کرتا ہے۔ اور مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب کی ذاتِ گرامی میں وہ کشش ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ اور جین کوئی بھی اس کے حلقہ اثر سے باہر نہیں جا سکتا۔" (۷) سو ہندو مسلمانوں کو اسی مرکز پر اکٹھا کیا گیا۔ شروع جون میں شریف منزل میں جلسہ ہوا۔ ایک مصالحتی بورڈ قائم ہوا۔ حکیم صاحب اس کے صدر بنا دیئے گئے پھر ہندو مسلمانوں کا ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ حکیم صاحب ایک زمانے کے بعد کسی جلسہ عام میں تقریر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

> "علالت کے باعث میں اس قابل نہ تھا کہ کسی پبلک جلسے میں تقریر کر سکوں۔ لیکن ہندو مسلمانوں کا اتحاد اور اس کے لئے کوشش کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ہندو مسلمانوں کے ساڑھے تین سال کے جھگڑے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس امر پر ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ لڑائی سے کیا فائدہ حاصل ہو گا۔"

مگر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی فضا جاتی رہی تھی۔ واقعات تیزی سے رونما ہو رہے تھے اور جذبات کا طوفان زور پکڑتا چلا جا رہا تھا۔ عین انہی دنوں پنجاب ہائی کورٹ نے "رنگیلا رسول" کے مقدمے کا فیصلہ سنایا اور اس کتاب کے مصنف، راجپال، کو بری کر دیا۔ غیظ و غضب کا ایک نیا طوفان اٹھا اور پنجاب ہائی کورٹ پر پھٹ پڑا۔ مطالبے ہونے لگے کہ فیصلہ دینے والے جج کو کہ نام اس کا کنور دلیپ سنگھ تھا اور مذہب کا عیسائی تھا، معزول کیا جائے۔ جلسے، جلوس، فلک شگاف نعرے، اخباری بیانات، شعلہ فشاں تقریریں۔ حکیم صاحب چپ رہے اور مولانا محمد علی بھی۔ مگر مولانا محمد علی تو چپ بیٹھنے والے آدمی نہ تھے ان کا چپ رہنا قیامت بن گیا۔ قضیہ حجاز میں دلوں کا غبار بہت نکلا۔ پھر بھی کم نکلا۔ سو جو اس وقت نہیں نکل سکا تھا وہ اب نکلا۔ لاہور سے مولانا ظفر علی خاں نے یلغار کی، دلی سے خواجہ حسن نظامی نے ہلہ بولا، مولانا محمد علی نرغے میں آ گئے۔

نرغے میں گھرا ہوا آدمی بالآخر بولا۔ ۲۷ جون کے "ہمدرد" میں مولانا محمد علی نے اداریہ لکھا اور سوال اٹھایا کہ خطاوار کون ہے؟ جج یا قانون۔ اور ثابت یہ کیا کہ خرابی قانون میں ہے، اسے بدلا جائے۔ اس پر پھر شور مچا کہ لیجئے مولانا محمد علی ظالم جج کی مدافعت کر رہے ہیں۔ مگر مولانا محمد علی بول پڑے تھے اور پوزیشن لے لی تھی۔ اب وہ پیچھے ہٹنے والے تھوڑا ہی تھے۔ انہوں نے متعلقہ قانون کو بدلوانے کا بیڑا اٹھایا۔ اگست کا سارا مہینہ اسی میں گزرا۔ شہر شہر جا کر مسلمانوں کو سمجھایا اور اس راہ پر لانے کی کوشش کی۔

حکیم صاحب دلی سے دہرہ دون جا چکے تھے۔ حال پہلے ہی کون سا اچھا تھا، ان واقعات سے طبیعت اور خراب ہوئی۔ اپنی دانست میں اب وہ ایک الگ تھلگ گوشے میں جا بیٹھے تھے اور اس صحت افزا فضا میں طبیعت بحال کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن قومی مسائل و معاملات سے اس گوشے میں بھی مفر نہیں تھا۔ مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد علی اور امام صاحب جامع مسجد نے انہیں خط لکھا اور شملہ کے جلسے میں پہنچنے کی دعوت دی۔ انہوں نے جواب لکھا:

> "گرامی نامہ مورخہ —— اگست ۱۹۲۷ء کے لئے آپ کا اور مولانا محمد علی صاحب کا وامام صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جہاں تک انبیاء علیم السلام اور دوسرے پیشوایانِ مذہب کی توہین کا تعلق ہے اس کے روکنے کی بہتر تدبیر وہی ہے جو مولانا محمد علی صاحب نے شروع ہی سے اختیار کی تھی اور جس پر وہ ابھی تک قائم ہیں اور یقین ہے کہ برابر رہیں گے۔ اگر میں شملہ میں شریک ہو سکا تو سوائے اس کی تائید کے اور میری کوئی رائے نہیں۔" (۱۱)

حکیم صاحب کو شملہ بہرحال جانا پڑا اور بار بار جانا پڑا کیونکہ ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں پھر سے شروع ہو گئی تھیں اور بات چیت کے لئے شملہ ہی میں جمع ہونے کی ٹھہری تھی۔ مولانا محمد علی نے اگست کا مہینہ متعلقہ قانون کو بدلوانے میں صرف کیا۔ پہلے مسلمانوں کی رائے عامہ کو ہموار کیا، پھر خود ایک مسودہ قانون تیار کیا جس کی رو سے بزرگانِ دین اور مذہبی عقائد و رسوم کی توہین جرم قرار دی گئی۔ یہ مسودہ قانون

نواب ذوالفقار علی خاں نے قانون ساز اسمبلی میں پیش کیا۔ معمولی ترمیموں کے ساتھ منظور ہو کر وہ انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۱۲۵ قرار پایا۔ مولانا محمد علی اس طرف سے فارغ ہوتے ہی ہندو مسلم اتحاد کے محاذ پر سرگرم ہو گئے۔

خلافت کمیٹی کی تحریک پر ستمبر کے مہینے میں شملہ میں اتحاد کانفرنس منعقد ہوئی۔ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہندو مسلمان نمائندے اکٹھے ہوئے۔ جناح صاحب کانفرنس کے چیئرمین تھے۔ اور اتحاد کے لئے سخت کوشاں تھے۔ حکیم صاحب بھی پہنچے۔ اس بیمار آدمی کو تو اتحاد کا جذبہ وہاں کھینچ کر لے گیا مگر بہت سے آتش مزاج رہنما اپنے انگارے ساتھ لے کر اس ٹھنڈے مقام پر پہنچے تھے۔ مہاسبھائی راہنما ڈاکٹر مونجے ابھی ابھی ناگ پور میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ ہندوؤں کو ڈنڈے سے مسلمانوں کا جواب دینا چاہیے۔ ادھر مولانا ظفر علی خان اس شہر سے آ رہے تھے جہاں ''رنگیلا رسول'' شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے ڈنڈے کا جواب ڈنڈے سے دیا۔ آگ بگولا ہو کر اپنا ڈنڈا اٹھایا اور اعلان کیا کہ میں ہندو کے ڈنڈے سے ڈرنے والا نہیں۔ (۹) اندر ڈنڈا اٹھایا تھا، باہر چھریاں چل رہی تھیں۔ فسادات کی آگ پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ شہر اس کی لپیٹ میں آتے چلے جا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ پورا ہندوستان جل جائے گا۔ باہر جو کچھ ہو رہا تھا اس کی گونج اندر سنائی دے رہی تھی۔ بس اسی میں اتحاد کانفرنس درہم و برہم ہو گئی۔ حکیم صاحب اُمیدوں کے ساتھ شملہ گئے تھے، مایوس و افسردہ واپس آئے۔

شملہ سے مایوس لوٹنے والے ابھی تک پوری طرح مایوس نہیں ہوئے تھے۔ شملہ میں انہوں نے ناکامی کا مُنہ دیکھا مگر پھر اپنی سی کوششیں شروع کر دیں حکیم صاحب دہرہ دون سے رام پور کی طرف نکل گئے۔ رام پور سے بھوپال گئے گھوم پھر کر نومبر کے شروع میں دلی پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی پھر ہندو مسلم اتحاد کے محاذ پر سرگرم ہو گئے۔ شریف منزل میں پھر صلاح مشورے ہونے لگے۔ صلاح مشوروں کے بعد ۳ نومبر کو ایک جلسہ عام ہوا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ رہنماؤں میں ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور حکیم صاحب کے ساتھ ساتھ کانگریس کے صدر سری نواس آئنگر بھی تھے۔ جلسے میں بہت صلح صفائی کی باتیں ہوئیں۔ رہنماؤں نے لمبی تقریریں کیں اور ہندو اور مسلمان عوام کو بہت سمجھایا بجھایا کہ عزیزو ایک دوسرے پر

اعتماد کرو۔ گائے کی قربانی کا معاملہ مسلمانوں کی رواداری پر چھوڑ دو اور مسجد کے سامنے باجا بجانے کا معاملہ ہندوؤں کی سلامت روی پر چھوڑ دو۔

جلسہ کامیاب رہا۔ مگر ادھر عدالت نے سوامی شردھانند کے قاتل کو موت کی سزا سنا دی۔ دلی کی فضا سنبھلتے سنبھلتے پھر بگڑ گئی۔ یوں مسلمان رہنماؤں نے علی العموم اس واقعہ قتل پر اظہار افسوس کیا تھا اور تشدد کے ابھرتے ہوئے رجحان کی مذمت کی تھی۔ مگر عبدالرشید پھانسی کی سزا پاکر مسلمان عوام کی ہمدردی کا مستحق بن گیا شہر میں اس کے جنازے کا جلوس نکلا۔ ہندو مشتعل ہوئے اور ہفتہ گزرا تھا کہ فساد ہو گیا۔ پھر ایک نے دوسرے کو الزام دینے شروع کر دیئے۔ ہندو اخباروں میں خبر نکلی کہ جو مسلمان عبدالرشید کی لاش لینے کے لئے جیل کے دروازے پر پہنچے تھے ان میں حکیم اجمل خاں بھی تھے۔ حکیم صاحب نے اس کی تردید کی اور پھر اس قصے سے مُنہ موڑ کر جامعہ ملیہ کے سالانہ اجلاس میں مصروف ہو گئے جو نومبر کے اوائل میں منعقد ہوا۔ اجلاس سے فارغ ہو کر رام پور روانہ ہو گئے۔

دسمبر کا پہلا ہفتہ حکیم صاحب کو رام پور میں گزرا مگر اچھا نہیں گزرا۔ آگے قومی قصے قضیوں سے دل برداشتہ ہو کر اور مطب، جامعہ ملیہ اور طبیہ کالج سے تھک ہار کر حکیم صاحب رام پور کی طرف نکل جاتے تھے۔ وہاں فراغت ہوتی، شعر و شاعری اور علم و ادب کی باتیں ہوتیں، بلیرڈ کھیلتے اور تازہ دم ہو جاتے۔ مگر اس بار رام پور نے انہیں تازہ دم نہیں کیا۔ وہاں رہتے ہوئے دل کے سات دورے پڑے۔ بیماری نے پہلے ہی ناتواں کر دیا تھا، ان دوروں نے بالکل ہی نڈھال کر دیا۔ واپس دلی آئے۔ یہاں آتے ہی کمر میں چک آ گئی۔ تین دن سخت درد میں مبتلا رہے اور چت لیٹے رہے۔ اسی عالم میں آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ ۱۱ دسمبر کو لیگ کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا۔

پچھلے برس اسی مہینے میں اور اسی شہر میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا اور حکیم صاحب اپنے گوشے میں بیٹھے تھے۔ نہ کانگریس کے جلسے میں گئے، نہ خلافت کانفرنس میں شریک ہوئے، نہ مسلم لیگ کے اجلاس میں شامل ہوئے۔ مگر اب حالات اور تھے۔ ہندو مسلم فسادات نے فضا کو بہت مکدر کر رکھا تھا۔ اسی تناسب سے ہندو

مسلم اتحاد کے لئے سرگرمی بھی بڑھ گئی تھی۔ مولانا محمد علی کے لئے قضیہ حجاز کی حیثیت اب ثانوی تھی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر اب وہ ہندو مسلم اتحاد کے مورچے پر سرگرمی دکھا رہے تھے۔ ان کے ساتھ خلافت کمیٹی بھی اسی راہ پر چل رہی تھی۔ ادھر مسلم لیگ کے صدر اب جناح صاحب تھے جو ہندو مسلم اتحاد کے لئے سخت دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ حکیم صاحب کو اندھیرے میں روشنی نظر آنے لگی۔ مگر قویٰ جواب دے چکے تھے، آگے کی طرح تو سرگرم نہیں ہو سکتے تھے۔ اب تو جذبے کے زور پر اس مہم میں شامل ہو گئے تھے۔ مسلم لیگ کا جب دعوت نامہ پہنچا تو اس قابل بھی نہیں تھے کہ گھر سے نکل کر مسلم لیگ دفتر تک پہنچ جائیں۔ جواب میں لکھا کہ عزیز و بیمار ہوں، چلنے پھرنے سے معذور ہوں، کیا مضائقہ ہے کہ جلسہ غریب خانہ پر کر لو کہ میں بھی شریک ہو جاؤں۔ سو طے ہوا کہ کونسل کا جلسہ لیگ کے دفتر کی بجائے شریف منزل میں کیا جائے۔

یہ وہ وقت تھا جب مسلم لیگ میں پھُوٹ پڑ چکی تھی اور دو کیمپ قائم ہو چکے تھے۔ افتراق کی ابتدا تو ہے، انتہا نہیں ہے۔ تحریک خلافت نشے کی طرح چڑھی اور اُتر گئی۔ اتحاد چند روزہ تھا۔ افتراق لمبا کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ پہلے ہندو مسلمانوں میں افتراق پیدا ہوا، پھر ادھر کانگریس کے اندر پھُوٹ پڑی اور "پرو چینجر" اور "نو چینجر" پیدا ہوئے اور ادھر مجلس خلافت میں دو کیمپ بن گئے۔ اب مسلم لیگ بھی دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی۔ بات یہ تھی کہ جناح صاحب تو ہندو مسلم اتحاد کے لیئے تگ و دو کر رہے تھے اور مصالحت کا وہ فارمولا جو "تجاویز دہلی" کے نام سے مشہور ہوا، انہی کی صدارت میں منظور ہوا تھا۔ مگر سر فضل حسین کو تجاویز دہلی مطلق نہ بھائیں۔ سر شفیع اور علامہ اقبال ان کے ہم خیال تھے۔ علامہ اقبال نے عملی سیاست میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ یار ان کی شاعری کے مداح تھے مگر ان کی سیاست پر نکتہ چیں تھے۔ مولانا محمد علی، بھڑبھڑیا آدمی، ابھی رن میں ابھی بن میں۔ غصہ بھی جلدی آتا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھی جلدی آتے تھے۔ اقبال کی شاعری کو پڑھ پڑھ کے گریہ کرتے تھے، شاعر کی سیاست کو دیکھ کر تاؤ کھاتے تھے اور مخالفانہ اداریئے لکھتے تھے۔ پہلے تجاویز دہلی باہمی اختلاف کا سبب بنیں، پھر سائمن کمیشن وجہ اختلاف بنا۔ سائمن کمیشن کیا خوب تشکیل

ہوا کہ اس میں کوئی ہندوستانی نمائندہ شامل ہی نہیں کیا گیا' نہ ہندو نہ مسلمان۔ آزادی کے لئے لڑنے والوں نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی ٹھانی۔ جناح صاحب اس کے خلاف ڈٹ گئے اور مولانا محمد علی ان کی کمک پر تھے۔ مگر سر شفیع اور علامہ اقبال سائمن کمیشن سے تعاون کے حق میں تھے۔ مسلم لیگ میں دو گروپ بن گئے۔ سر شفیع گروپ اور جناح گروپ۔

مسلم لیگ کے ۱۹۲۶ء کے اجلاس میں یہ طے ہوا تھا کہ اگلا سالانہ اجلاس لاہور میں ہو۔ مگر ۱۹۲۷ء کے گزرتے گزرتے فضا بہت بدل گئی۔ جناح صاحب کے ساتھیوں نے فضا میں کچھ سونگھا اور بھانپا کہ شفیع گروپ لاہور میں اپنے حامیوں کو اکٹھا کر کے مسلم لیگ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ مختلف سمتوں سے تقاضے شروع ہوئے کہ سالانہ اجلاس کسی اور شہر میں منعقد کیا جائے۔ پس اسی مسئلہ انعقاد پر غور کرنے کے لئے مسلم لیگ کونسل کا جلسہ بلایا گیا تھا۔

وہ ۱۱ دسمبر تھی اور شریف منزل میں کونسل کے تئیس اراکین اکٹھے تھے۔ محمد علی جناح، علامہ اقبال، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر کچلو، فیروز خاں نون، شیخ عبداللہ، ملک برکت علی، پیر تاج الدین، ڈاکٹر ضیاء الدین کیسی کیسی شخصیت یہاں آئی بیٹھی تھی۔ مگر سب تنے بیٹھے تھے کہ آج ایک ایک پانی ہونے والا تھا۔ پہلے تو فیروز خاں نون نے ڈاکٹر کچلو کو کہ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے' آڑے ہاتھوں لیا "کیوں صاحب' یہ جلسہ کس خوشی میں بلایا گیا ہے؟"

ڈاکٹر کچلو وضاحت کرنے لگے کہ جناب والا' بات یہ ہے کہ مجھے بنگال' مدراس اور دوسرے مقامات سے بہت تار اور خط ملے ہیں۔ تقاضے ہو رہے تھے کہ سالانہ اجلاس کے مقام انعقاد کو بدلیئے۔ میں نے صدر مسٹر جناح سے مشورہ کیا اور لیگ کے آئین کی دفعہ ۱۹ کے تحت یہ جلسہ بلایا۔ مگر نون صاحب ڈاکٹر کچلو کو آسانی سے چھوڑنے والے تو نہیں تھے۔ انہوں نے جرح شروع کر دی۔ مولانا محمد علی سنتے رہے اور خون کے گھونٹ پیتے رہے۔ آخر کو اُبل پڑے کہ ڈاکٹر کچلو کو یاروں نے سمجھا کیا ہے۔ بات کرنے کا یہ کونسا طریقہ ہے۔ کوئی اعتراض ہے تو باقاعدہ نقطہ اعتراض پیش کریں۔ نون صاحب کب رُکنے والے تھے۔ باقاعدہ اعتراض پیش کیا کہ یہ جلسہ ضابطے

کے مطابق نہیں ہے۔ بس پھر کیا تھا' اللہ دے اور بندہ لے۔ بحث شروع ہو گئی۔ بحث لمبی چلی۔ حکیم صاحب کی کمر میں چک آئی ہوئی تھی اور وہ کرسی صدارت پر سیدھے بیٹھے تھے۔ مخالفوں اور موافقوں کو سنا اور رولنگ دی کہ جلسہ ضابطے کے مطابق ہے۔ شفیع گروپ پر اوس پڑ گئی۔

اس رولنگ کے بعد مقامِ انعقاد اور ساتھ ہی مجوزہ صدر کی تبدیلی کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ بہت تقریریں ہوئیں، بہت گرما گرمی ہوئی۔ آخر ووٹنگ کی نوبت آئی۔ کچھ حاضر ووٹ تھے، باقی تحریری طور پر موصول شدہ ووٹ تھے۔ کثرتِ رائے سے طے ہوا کہ سالانہ اجلاس لاہور کی بجائے کلکتے میں ہو۔ جناح گروپ کی باچھیں کھل گئیں۔ علامہ اقبال، حسرت موہانی اور ملک فیروز خاں نون بھرا کر اٹھے اور اپنے ہم نواؤں کو سمیٹ کر جلسے سے نکل گئے۔ (۱۳)

اگلے دن حکیم صاحب کا بستر بندھ رہا تھا' سفر کی تیاری تھی۔ یاروں نے دیکھا اور حیران ہوئے کہ کہاں تو چلنے پھرنے کی سکت نہیں تھی اور کہاں سفر کے لئے تیار ہیں۔ اصل میں حکیم صاحب کو یہ خبر ملی تھی کہ شاہ امان اللہ خاں یورپ کے سفر سے واپس آ رہے ہیں۔ کابل جاتے ہوئے بمبئی سے گزر ہو گا۔ بیمار نے یہ خبر سنی اور چہرے پہ رونق اور ہاتھ پاؤں میں سکت آ گئی۔ دوستوں نے سمجھایا کہ آپ کی حالت ایسی نہیں کہ سفر کریں۔ جواب دیا' سچ کہتے ہو مگر میری زندگی کی یہ آخری تمنا ہے کہ امان اللہ خاں سے دو باتیں کر لوں۔

کمر میں چک کی تکلیف برقرار تھی۔ کروٹ لینے کے لئے تیماردار کے محتاج تھے۔ اسی عالم میں سامانِ سفر باندھا' ملازموں اور دوستوں کے سہارے گھر سے سٹیشن پہنچے اور لشٹم پشٹم گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ۱۳ دسمبر کو بمبئی پہنچے۔ ۱۴ دسمبر کو امان اللہ خاں سے ملاقات ہوئی۔ ۱۶ دسمبر کو امان اللہ خان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام ہوا۔ اس تقریب میں مولانا محمد علی نے مہمان عزیز کو ایک خوبصورت بگھی نذر کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ ملیہ کی مطبوعات کا ایک سیٹ پیش کیا۔ حکیم صاحب نے جامعہ ملیہ کی طرف سے سپاسنامہ جو فارسی میں لکھا گیا تھا پیش کیا جس میں انہوں نے کہا۔

"حضور والا' آپ کی مساعی جمیلہ سے افغانستان کو آج دنیا میں اسلام

کے ایک اہم مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور یہ ملک ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ بیشک جناب والا کو افغانستان کے مصلح اعظم کا مقام حاصل ہے۔ لیکن آپ کی مساعی کے اثرات افغانستان تک محدود نہیں۔ ہم پورے عالم اسلام میں ان کے اثرات پھیلتے محسوس کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ افغانوں کی اصلاح کا جو عمل جاری ہے وہ ایسا کارنامہ ہے جس پر انسانیت بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

"جناب والا نے علم کی ترویج کے لئے جو کوششیں کی ہیں ان سے ہم آگاہ ہیں۔ اور علم ہی تو ترقی کی بنیاد بنتا ہے۔ سو اسی واسطے سے ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سلسلہ میں کچھ معلومات حضور والا کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس درس گاہ کی بنیاد یہ سوچ کر رکھی تھی کہ مسلمانوں میں قومی جذبے کو فروغ دیا جائے ونیزان کے ذہنی افق میں وسعت پیدا کی جائے۔ اب سے سات برس پہلے جامعہ کا قیام عمل میں آیا تھا اس خیال سے کہ لوگوں کو تعلیم کی صحیح نہج سے روشناس کیا جائے جس پر چل کر وہ اپنے نصب العین کو پا سکیں۔

حضور والا اس سے باخبر ہیں کہ آج کے زمانے میں مسلمانوں کی بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم سے بہرہ ور ہوں۔ مروجہ نظام تعلیم نے ابھی تک نوجوانوں کو صرف ملازمتوں کے لئے تیار کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی سوشل سرگرمیوں کا دائرہ بہت ہی محدود ہے۔ لہٰذا جامعہ نے اپنا آدرش یہ قرار دیا ہے کہ زندگی سادہ اور فکر اعلیٰ۔ اسی کے ساتھ یہ مقصد بھی پیش نظر ہے کہ نوجوانوں کو مختلف پیشے اختیار کرنے پر مائل کیا جائے۔ پھر ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ غیر زبان میں حصولِ علم کے عمل میں ذہنی توانائی بہت ضائع ہوتی ہے۔ سو جامعہ نے اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنایا ہے....."

امیر امان اللہ خاں نے اس سپاسنامہ کا خاطر خواہ جواب دیا اور جامعہ ملیہ کے طریق تعلیم پر اطمینان کا اظہار کیا۔ امیر نے حکیم صاحب کو افغانستان کے دورے کی

دعوت دی جو حکیم صاحب نے بخوشی قبول کی۔

بمبئی میں چند دن گزارنے کے بعد انہوں نے پالن پور کی راہ لی۔ پالن پور جانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ جامعہ کے لئے کچھ چندہ وہاں سے جمع کر لیا جائے۔ اصل میں اب حکیم صاحب کی توجہ زیادہ تر جامعہ کی طرف تھی۔ خیر تو انہوں نے پالن پور میں چند دن گزارے اور چندہ جمع کر کے واپس ہوئے۔

حکیم صاحب گھوم پھر کر ۲۶ دسمبر کو دلی پہنچے۔ پوری رات سفر میں کٹی۔ اب تڑکا تھا اور گاڑی جمنا کے پل سے گزر رہی تھی۔ جمنا ندی نیند سے جاگنے لگی تھی اور دلی کا آسمان اجلا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بڑے دن کی صبح تھی اور رات بہت کہرا پڑا تھا۔ دلی حکیم اجمل خاں کی زندگی میں آج آخری بار صبح کر رہی تھی۔ مگر اس صبح کے مشاہدے کے لئے حکیم صاحب کے پاس وقت نہیں تھا۔ دلی سے دوران کی اپنی صبح ان کی منتظر تھی اور اس سے پہلے انہیں بہت کام نبٹانے تھے۔ اسٹیشن سے گھر پہنچتے ہی ڈاک دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ۹ بجے تک ڈاک دیکھی۔ پھر مریضوں کو دیکھنے کی باری آئی۔ پھر شہر میں جو جوان کا مریض تھا اور جو جو مریض باہر آیا بیٹھا تھا اسے دیکھتے پھرے۔ اس بیمار آدمی نے سارا دن اپنے مریضوں کو دیکھنے میں صرف کیا۔ جب شام ہوئی تو گھر کی راہ لی۔ اس شہر میں اس چونسٹھ سالہ شخص کی یہ آخری شام تھی ان چونسٹھ برسوں میں دلی کی شاموں کی رنگت کتنی بدل گئی تھی۔ نہ مشعلیں نہ مومی شمعیں۔ دیوان خانے جہاں شام پڑے سے جھاڑ فانوس جگمگاتے تھے، بجھ چکے تھے۔ اب نئے ڈرائنگ روم تھے اور بجلی کی روشنی تھی۔ بارہ کھمبے سے پرے ایک بالکل نئی دلی بجلی کے چراغوں سے جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ نئے بازار، نئی کشادہ راہیں، نئے مکان کہ کوٹھیاں کہلاتے تھے۔ ان کوٹھیوں کے ڈرائنگ روم، چاندنی، مسند اور گاؤ تکیے سے بے نیاز تھے۔ جوتیاں اتار کر دو زانو اور آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کا رواج جاتا رہا تھا۔ اس کے ساتھ سلیم شاہی جوتی بھی گئی۔ نیا زمانہ نئی جوتیاں لے کر آیا۔ اب شرفائیتوں والے بوٹ ڈاٹے ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے تھے اور صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھتے تھے۔ باہر کناٹ پیلس میں بازار نئی طرز سے سجا تھا۔ بجلی جلتی تھی اور کوٹ پتلون والی مخلوق اُمنڈتی تھی۔ ویسے پرانی دلی بھی ایسی پرانی نہیں رہی تھی۔ بجلی کی روشنی چاندنی چوک

میں بھی بہت پھیل گئی تھی اور اب صرف بوڑھوں کو یہ یاد رہ گیا تھا کہ آگے چاندنی چوک کے بیچوں بیچ ایک ٹھنڈی میٹھی نہر بہتی تھی اور گھنی چھاؤں اور کھٹے میٹھے پھلوں والے پیڑ اس پر سایہ کرتے تھے۔ نئی خلقت نہر اور پیڑوں سے بے خبر ٹرام میں بیٹھ کر اور سائیکل چلا کر اور موٹروں میں سوار ہو کر اس بازار میں پہنچتی تھی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ کتنی سواریاں رخصت ہو چکی تھیں اور کتنی سواریاں آ گئی تھیں۔ چار گھوڑوں والی بگھی افسانہ بن چکی تھی۔ دو گھوڑوں والی بگھی خال خال رہ گئی تھیں۔ بگھی سوار اب موٹروں میں بیٹھے نظر آتے تھے سائیکلیں دلی کے گلی کوچوں میں رچ بس چکی تھیں۔ ٹرام سڑکوں کے بیچ بچھی ہوئی پٹریوں پر ایک گھنٹی کی آواز کے ساتھ چلتی ہوئی یوں لگتی کہ وہ اس شہر میں صدیوں سے اسی طرح چل رہی ہے۔ اور اسی برس دلی کے آسمان پر ایک نئی سواری کی نمود ہوئی تھی۔ ۸ جنوری ۱۹۲۷ء کو ایک ہوائی جہاز لندن سے اُڑ کر دلی پہنچا۔ اس کا نام "سٹی آف دہلی" رکھا گیا۔

دلی کتنی بدل گئی تھی، مگر چوک کا رنگ اپنی جگہ قائم تھا یہاں جو فرق پڑنا تھا ۱۸۵۷ء میں پڑ لیا۔ اس کے بعد سے اب تک چیزیں جہاں کی تہاں تھیں۔ وہی پرانے خوانچے، وہی خوانچہ فروشوں کی وضع، وہی ان کی بولیاں، وہی ان کی روشنیاں۔ اب شام ہو چکی تھی، دونوں وقت مل رہے تھے۔ کسی خوانچہ فروش نے لالٹین جلائی، کسی نے مٹی کا دیا جلایا۔ کسی نے مشعل روشن کی۔ چٹوروں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا سیلانی گھروں سے نکلے ہوئے تھے اور چوک میں اہلے گہلے پھرتے تھے۔ حکیم صاحب دن بھر کے تھکے ماندے گھر واپس ہو رہے تھے۔ شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ چوک میں سیلانیوں کا اور شریف منزل میں مریضوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ کب کب کا بیمار مسیح الملک کو اپنا دُکھ بتانے کے لئے پہنچا ہوا تھا۔ وقت تنگ تھا۔ اب سات بج رہے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے رام پور کی گاڑی چھوٹنی تھی۔ حکیم صاحب کو صبح رام پور میں کرنی تھی۔ سات سے ساڑھے نو بجے تک مطب کیا۔ ایک ایک مریض کو دیکھا اور نسخہ لکھا۔ مریضوں سے فارغ ہو کر جلدی جلدی سامان سمیٹا اور اسٹیشن کی راہ لی۔ چند دوست احباب بھی الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔

اب ساڑھے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ریل کی سیٹی بج چکی تھی۔ گاڑی چھوٹ چکی

تھی۔ دلی کی در و دیوار آنکھوں سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے — ہمیشہ کے لئے۔
وہ بڑے دن کی رات تھی اور سردی سخت پڑ رہی تھی۔

حواشی

۱۔ (نوٹ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ) مضامین محمد علی (حصہ دوم) ص ۱۵۴
۲۔ مضامین محمد علی (حصہ دوم) صفحہ ۲۸۵
۳۔ مضامین محمد علی (حصہ دوم) صفحہ ۶۳
۴۔ مضامین محمد علی (حصہ دوم) صفحہ ۴۱۲
۵۔ مضامین محمد علی (حصہ دوم) صفحہ ۴۱۲
۶۔ "مشیر الاطبا" کا مسیح الملک نمبر۔
۷۔ مضامین محمد علی (حصہ دوم) صفحہ صفحہ ۴۱۲
۸۔ مضامین محمد علی (حصہ دوم) صفحہ ۴۱۲
۹۔ "مشیر الاطبا" کا مسیح الملک نمبر۔
۱۰۔ مضامین محمد علی (حصہ دوم) صفحہ ۴۱۲
۱۱۔ خط بنام مولانا کفایت اللہ، مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۲۷ء "مشیر الاطبا" کا مسیح الملک نمبر، مصنفہ حکیم محمد حسن قرشی صفحہ ۱۵۳۔
۱۲۔ "حیات اجمل" مصنفہ قاضی عبدالغفار، صفحہ ۴۳۴
۱۳۔ اس جلسے کی ساری تفصیلات ڈاکٹر کچلو کی دفتری رپورٹ سے ماخوذ ہیں جو "فاؤنڈیشنز آف پاکستان" (حصہ دوم) میں صفحہ ۱۰۷-۱۰۸ پر انڈین کوارٹرلی رجسٹر ۱۹۲۷ء (جلد دوم) صفحہ ۴۳۸-۴۳۹ کے حوالے سے نقل ہوئی ہیں۔

وفات

ایک پاؤں دلی میں، دوسرا پاؤں رامپور میں۔ کتنے زمانے سے یہ طور چلا آ رہا تھا۔ نواب صاحب کو بھی حکیم صاحب کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ بس ایک ساتھ ہلہلا اُٹھتا تھا کہ بلاؤ حکیم صاحب کو۔ لیجئے تار برقی کھڑکنے لگے۔ چلئے ایک تار دے دیا، اب انتظار کیجئے۔ مگر نہیں۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پرائیویٹ سیکرٹری طلب کیا جاتا اور پوچھا جاتا کہ حکیم صاحب کو تار دے دیا۔ پھر تار دیجئے۔ لیجئے دوسرا تار کھڑکا دیا گیا۔ ایک کے بعد، دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ بس تاروں کا تاربندھ جاتا حتیٰ کہ حکیم صاحب کی طرف سے اطلاع موصول ہوتی کہ فلاں گاڑی سے پہنچ رہا ہوں۔ پتہ نہیں حکیم صاحب نے اس نواب کو کیا گھول کر پلا دیا تھا۔ موصوف کے لئے وہ صرف اور محض حکیم نہیں تھے۔ ہر معاملہ میں مشورہ کیا جاتا۔ جو مشکل پیش آتی، جو پیچ پڑتا توقع کی جاتی کہ حکیم صاحب اسے اپنے ناخن تدبیر سے سلجھائیں گے۔

نواب صاحب خوب نواب تھے۔ دن کو سوتے تھے، رات کو رت جگا کرتے تھے۔ رت جگا کر کے صبح چھ بجے سوتے تھے اور شام کو چار بجے تک سوتے رہتے تھے۔ ان اوقات میں حکیم صاحب کو فرصت ہوتی تھی۔ حکیم صاحب صبح سات بجے سے دس بجے تک مطب کرتے تھے واضح ہو کہ حکیم صاحب رام پور میں محض نواب صاحب کے معالج بن کر نہیں رہتے تھے۔ مطب بھی کرتے تھے جس کے دروازے خاص و عام پر کھلے ہوتے تھے۔ تو صبح سات سے دس بجے تک مطب کرنا۔ اس کے بعد ریاست کے چیف سیکرٹری عبدالصمد خاں کے ساتھ وقت گزرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا جو انگریزی طرز کا ہوتا انہیں کے ساتھ کھایا جاتا تھا۔ شام چار بجے جملہ احباب اور عملہ کے

لوگوں کے ساتھ چائے پی جاتی تھی۔

نواب صاحب چار بجے سو کر اٹھتے تھے۔ دو گھنٹے تک ریاست کے کاروبار میں مصروف رہتے۔ کاغذات پر دستخط کرتے۔ ہدایتیں دیتے۔ احکامات جاری کرتے۔ اس کاروبار سے فراغت کے بعد حکیم صاحب کو یاد کیا جاتا۔ پھر دو بجے رات تک نواب کے ساتھ صحبت رہتی۔ اس کے درمیان میں ایک وقفہ آتا جب نواب صاحب بیگمات سے ملنے کے لئے محل سرا میں چلے جاتے۔ ادھر حکیم صاحب بلیرڈ میں مصروف ہوجاتے۔ مگر ادھر آٹھ بجے ادھر نواب صاحب محل سرا سے نکلے اور کھانے کی میز پر آن موجود ہوئے۔ اس میز پر گنتی کے اکیس مہمان ہوتے۔ اگر کوئی خاص مہمان آن وارد ہوتا تو پھر ان اکیس میں سے کسی ایک کو کاٹ دیا جاتا۔ (1)

تو حکیم صاحب کا طور یہ تھا کہ رات کو دو بجے تک نواب صاحب کے رتجگے میں شریک ہوتے۔ دو بجے رت جگے کو سجا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے اور آرام کرتے۔ کبھی دو بجے سے پہلے محفل سے اٹھ جاتے تو پھر دو بجے تک کا وقت مطالعہ میں صرف ہوتا۔ مگر اس مرتبہ اس ورد میں کچھ فرق آگیا تھا حکیم صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دسمبر کے مہینے کے اندر اندر ان کا یہاں یہ دوسرا پھیرا تھا۔ پہلا پھیرا دسمبر کے اوائل میں ہوا تھا۔ لیکن وہاں انہیں دل کے تابڑ توڑ سات دورے پڑے جس نے انہیں ہلکان کر دیا۔ سو رامپور میں قیام کو مختصر کیا اور دلی چلے آئے۔ مٹی تو بہرحال دلی ہی کی تھی۔ مگر شاید رامپور کی مٹی کا بھی کچھ قرض تھا۔ تو مہینے کے ختم ہوتے ہوتے حکیم صاحب پھر رامپور پہنچ گئے۔

طبیعت تو خراب پہلے ہی سے چل رہی تھی۔ مگر رامپور میں جا کر کچھ زیادہ بگڑ گئی۔ غذا گھٹتے گھٹتے ایک انڈے کی زردی رہ گئی تھی۔ لیکن یہ وضعداری کی بات تھی کہ روز مرہ کے معمولات کے مطابق بلیرڈ کھیلتے رہے۔ ادھر سے فارغ ہو کر نواب صاحب کی محفل میں جا شامل ہوتے مگر آج کچھ جلدی محفل سے اٹھ گئے۔ بس گیارہ بجے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں آگئے۔ مگر کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ نواب صاحب نے پھر یاد کیا۔ چوبدار دوڑا دوڑا آیا کہ سرکار یاد فرما رہے ہیں۔ حکیم صاحب نے معذرت کر لی کہ طبیعت ناساز ہے۔ حاضر ہونے سے معذور ہوں۔ نواب صاحب

نے سنا اور فوراً آن موجود ہوئے۔

نواب صاحب ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بیٹھے رہے، باتیں کرتے رہے مطلب یہ کہ حکیم صاحب جتنا وقت نواب صاحب کی محفل میں لگایا کرتے تھے اتنا وقت پھر لگ گیا۔ پھر وہی دو بج گئے۔

نواب صاحب اُٹھنے لگے تو حکیم صاحب نے چیف سیکرٹری صاحب کو روک لیا۔ ابھی پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ حکیم صاحب نے دل پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا اور گہرا سانس لیا۔ چیف سیکرٹری صاحب گھبرائے۔ پوچھا کہ کیا تکلیف ہے۔ کہا کہ دل کے مقام پر تکلیف ہے۔ سیکرٹری صاحب نے یہ سوچ کر کہ حکیم صاحب کو آرام کرنا چاہیے اٹھنے لگے تو حکیم صاحب نے پھر انہیں روک لیا۔ چند ایک منٹ کے بعد پھر درد اُٹھا اور اس مرتبہ حکیم صاحب کی ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔ ساتھ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر عبدالحکیم خاں کو بلاؤ۔ ڈاکٹر صاحب کے لیئے آدمی دوڑایا گیا اور حکیم صاحب کو پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ مگر درد کی لہر پھر اٹھ کھڑی ہوئی اب حکیم صاحب نے اپنی دوا خود کرنے کی نیت کی۔ کہا کہ گرم پانی لاؤ۔ مگر اب وقت کہاں تھا۔ ڈاکٹر اور گرم پانی آنے سے پہلے آخری وقت آن پہنچا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ حکیم صاحب نے دو ہچکیاں لیں اور سدھار گئے۔

فوراً نواب کو اطلاع پہنچائی گئی۔ نواب صاحب آئے، دیکھا کہ یارِ عزیز ساتھ چھوڑ کر جا چکا ہے۔ ٹھنڈا سانس بھرا۔ کہا کہ حکیم صاحب نہیں مرے، میں مر گیا۔

صبح ہوتے ہوتے بذریعہ تار یہ خبر دلی پہنچی اور شہر میں ایک کہرام برپا ہوگیا۔ جسے دیکھو کوچہ بلیماراں کی طرف دوڑا چلا جا رہا ہے۔ میت ۲۹ دسمبر ۳ بجے سہ پہر کو موٹر کے ذریعے دلی پہنچی۔ ۴ بجے جنازہ اُٹھا۔ کیا مسلمان کیا ہندو پوری دلی بلیماراں میں اُمنڈی ہوئی تھی اور بلیماراں سے باہر چاندنی چوک تک پھیلی ہوئی تھی۔ جامع مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھائی گئی۔ خواجہ حسن رسول نما کی درگاہ کے صحن میں دفن کئے گئے۔ یہاں ان سے پہلے ان کے والد حکیم محمود خاں اور دونوں بھائی حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم واصل خاں آسودہ خاک ہوئے تھے۔

ادھر دلی میں حکیم صاحب کا جنازہ اُٹھ رہا تھا ادھر کانگریس کے سارے رہنما

مدراس میں اکٹھے تھے جہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں جاری تھا۔ جب یہ خبر وہاں پہنچی تو پوری کانگریس کو ایک صدمے نے آ لیا اور ڈاکٹر انصاری تو پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگے۔

"اس عظیم قومی سانحہ نے اور اس ناقابل تلافی نقصان نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہندوستان کا ایک عظیم فرزند اب ہمارے درمیان نہیں رہا۔ جو کم ہمتوں کی ہمت بندھایا کرتا تھا وہ اب نہیں رہا۔ وہ جو عوامی جوش و غضب کو اپنے تدبر سے حد اعتدال سے گزرنے نہیں دیتا تھا اب نہیں رہا۔ وہ نہیں رہا۔ لیکن اس کی یاد باقی رہے گی۔ اور دیس کے لئے جو کام اس نے کیا ہے اس کا ثمر ہمیں ملے گا۔ دلی میں جامعہ اسلامیہ اور طبیہ کالج اس کی تعمیری سوچ کے نشانات کے طور پر قائم و دائم رہیں گے۔"

یہ ڈاکٹر انصاری نے کہا۔ اس سے بڑھ کر گاندھی جی نے کہا۔

"اس نازک گھڑی میں ہمارا یہ بہت بڑا نقصان ہے اور المناک۔ حکیم اجمل خاں ہندوستان کے سچے سپوت تھے۔ ہندو مسلم ایکتا کے سلسلہ میں تو ان کی حیثیت ایسی تھی کہ اس کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ میں تو بس یہ آس لگائے بیٹھا ہوں کہ ہم لوگ جو ان کے جیتے جی نہیں سیکھ پائے اور نہیں کر پائے تھے وہ اب ان کے مرنے کے بعد سیکھنے کی کوشش کریں گے۔ اخباروں میں جو کچھ چھپا ہے۔ کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اتنا ہی ہندوؤں نے بھی ان کی موت کا سوگ منایا اگر صحیح ہے تو یہ بہت صحت مندانہ علامت ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کے مرنے سے دلی میں دوستی اور بھائی چارے کی جو فضا پیدا ہوئی ہے وہ برقرار رہے گی۔ اور پورے دیس میں سرایت کر جائے گی۔ اور میرے لیئے تو حکیم جی کا دنیا سے اُٹھ جانا ایک نجی نقصان ہے۔"

پنڈت موتی لال نہرو نے مونٹ کارلو سے ڈاکٹر انصاری کو تعزیتی تار بھیجا اور کہا۔

"ہندوستان اپنے ایک انتہائی مخلص فرزند سے محروم ہو گیا ہے۔ اس سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پر ہونا ناممکنات سے ہے۔ اس کا جینا مرنا ہندو مسلم ایکتا کے لئے تھا۔"

گاندھی جی نے "ینگ انڈیا میں الگ ایک تعزیتی کالم لکھا۔ جس میں انہوں نے کہا۔

"حکیم جی" ایک ہمہ جہت شخصیت تھے .... وہ ایک عظیم مسلمان تھے اور اتنے ہی عظیم ہندوستانی۔ ہندو اور مسلمان دونوں انہیں یکساں عزیز تھے۔ اور ادھر ہندو اور مسلمان بھی یکساں ان کا احترام کرتے تھے اور محبت کرتے تھے۔ ہندو مسلم ایکتا تو ان کے لئے سانس کا حکم رکھتی تھی۔ ہمارے جھگڑوں کی وجہ سے ان کے آخری ایام بہت تلخی میں گزرے۔ لیکن اپنے دیس اپنی جنتا سے مایوس کبھی نہیں ہوئے ان کا احساس یہ تھا کہ ان دونوں فرقوں کو بالآخر اتحاد کرنا پڑے گا۔ ان کا یہ غیر متزلزل ایمان تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اتحاد کے لئے اپنی کوششوں کو ترک کبھی نہیں کیا۔ اگرچہ شروع میں انہیں تامل تھا لیکن پھر انہوں نے ترک موالات کرنے والوں کا ساتھ دیا اور اس بے جگری سے ساتھ دیا کہ جو شے انہیں سب سے زیادہ عزیز تھی اور جو ان کا سب سے بڑا کام تھا یعنی طبیہ کالج اس کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔

حکیم جی کی موت کی وجہ سے یہی نہیں ہوا کہ میں ایک دانا بینا اور ثابت قدم رفیق کار سے محروم ہو گیا بلکہ اسی کے ساتھ مجھ سے ایک ایسا متر بھی چھن گیا جس پر میں وقت پڑنے پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ ہندو مسلم ایکتا کے معاملہ میں وہ متر میرا مستقل رہنما بنا ہوا تھا۔ اپنی معاملہ فہمی، اپنی متانت، اور اپنی انسان شناسی کے بل پر وہ بالعموم بہت صحیح فیصلے کرتے تھے۔ ایسا آدمی کبھی نہیں مرا کرتا۔ اگرچہ وہ اب اپنے گوشت پوست کے ساتھ ہمارے بیچ نہیں ہیں۔ لیکن ان کی آتما فریضہ ادا کرنے کا تقاضا کر رہی ہے۔ ہم حکیم جی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے جو بھی یادگار قائم کریں

گے وہ اس وقت تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی جب تک ہم حقیقی معنوں میں ہندو مسلم ایکتا قائم نہیں کر لیتے۔ پرماتما ہمیں یہ توفیق عطا کرے کہ جو کام ہم ان کے جیتے جی انجام نہیں دے سکے وہ اب ہم ان کی موت سے متاثر ہو کر انجام دینے کا سبق حاصل کریں۔

"لیکن حکیم جی اس قسم کے آدمی نہیں تھے کہ بس بیٹھے ہیں اور خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ اس کے قائل تھے کہ جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر بھی ملنی چاہیے۔ انہوں نے طب کے متعلق جو خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر انہوں نے کالج کی صورت میں پانے کا اہتمام کیا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے سیاسی خواب کی تعبیر جزوی طور پر جامعہ ملیہ سے پائی۔ جب یہ قومی یونیورسٹی لب دم تھی تو انہوں نے اکیلے جامعہ کو علی گڑھ سے دلی منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جامعہ کو مالی اعتبار سے مستحکم بنانے کی ان کی اپنی ذمہ داری ہے وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے میدان میں اتر پڑے۔ سب سے بڑھ چڑھ کر انہوں نے اس کی مالی اعانت کا انتظام کیا، خواہ اپنی جیب سے خواہ نجی دوستوں سے چندہ جمع کر کے۔" (۲)

اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا۔

"جو لوگ حکیم اجمل خاں سے اپنے مرض کا نسخہ لینا چاہتے تھے، جو اپنی ملازمت کی سفارش کے خواہاں تھے، جنہیں اپنی عزیز کی شادی کے لئے روپیہ درکار تھا، جن بیواؤں کی روٹی ان کی توجہ سے چلتی تھی، جن یتیموں اور ناداروں کی تعلیم کے لئے ان کے خزانے سے رقم ملتی تھی، ان کی تعداد سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ ان کا اجمل خاں رخصت ہو گیا۔ مگر طب قدیم کا مجدد اور طبی تعلیم کا رہنما آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔" (۳)

آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اس وقت کلکتہ میں ہو رہا تھا۔ جب خبر انتقال وہاں پہنچی تو اجلاس پر سوگ کی فضا طاری ہو گئی۔ فوراً قرارداد تعزیت منظور کی

گئی جس میں حکیم صاحب کی قومی و ملی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا گیا۔

"آزادی ہند کے نصب العین سے ان کی بے لوث وابستگی، مختلف فرقوں کو اتحاد کے رشتے میں پرو کر ایک متحدہ قوم بنانے کے لئے ان کی انتھک کوششیں، قوم کے سلسلہ میں بالعموم اور مسلمانوں کے سلسلہ میں بالخصوص ان کی بیش بہا خدمات، ان سب باتوں نے مل کر انہیں ایک قومی اثاثے کی حیثیت دے دی تھی۔ ان کی وفات سے ملک ایک بڑے عالم و محقق سے اور ایک بڑے طبیب سے محروم ہو گیا ہے.....

"یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور طبیہ کالج کی اقتصادی حالت کو مستحکم کیا جائے اور اس طور پر حکیم صاحب کے کاموں کو یاد رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔" (۳)

مگر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور طبیہ کالج ایسے اداروں کے سوا بھی حکیم صاحب نے پیچھے بہت کچھ چھوڑا۔ اداروں میں مدرسہ طبیہ زنانہ اور ہندوستانی دواخانہ کو بھی شامل کر لیجئے۔ اور ساری مصروفیات کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ چلتا رہا۔ تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رسالہ القول المرغوب فی الماء المشروب۔

۲۔ رسالہ البیان الحسن۔

۳۔ القیاظ النعسان۔

۴۔ رسالہ طاعون۔

۵۔ الحفتہ الحامدیہ فی الصناعہ التکلیسیہ۔

۶۔ رسالہ فی الترکیب الادویہ و استخراج و رجائنا۔

۷۔ المحاکم بین القرشی والعلامہ۔

۸۔ حاشیہ شرح اسباب۔

۹۔ اللغات الطبیہ

۱۰۔ الفتحہ الاجلیہ فی الصلات الفعلیہ۔

۱۱۔ نقش شیدا (اُردو اور فارسی کلام کا مجموعہ۔

اولاد میں ایک بیٹا حکیم محمد جمیل خاں جو ان کے بعد ان کی گدی پر بیٹھے۔ دو بیٹیاں فاطمہ بیگم اور آمنہ بیگم۔

آگے یہ نسل اس طرح چلی کہ حکیم محمد جمیل خاں کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ حکیم محمد نبی خاں اور حکیم احمد نبی خاں دونوں نے طب کے جدی مشغلہ کو برقرار رکھا۔ اور حکیم محمد نبی خاں دادا کی روش پر چلتے ہوئے خالی حکیم ہی نہیں رہے۔ شاعری کی راہ پر بھی چلے۔ اور اپنے تخلص کے ساتھ حکیم محمد نبی خاں جمال سویدا کہلائے۔

حکیم محمد نبی خان کے ہاں پانچ بیٹے ہوئے۔ جلیل نبی خاں، منیر نبی خاں، حکیم مشیر نبی خاں، معید نبی خاں، تنویر نبی خاں۔ اور حکیم احمد نبی خاں کے دو بیٹے ہوئے۔ ضیاء النبی خان اور ڈاکٹر جاوید نبی خان۔

حواشی

۱۔ ہندوستان کے مشہور اطباء مصنفہ حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن صفحہ ۱۰۶

۲۔ "ینگ انڈیا" مورخہ ۵ جنوری ۱۹۲۸ء بحوالہ حکیم اجمل خان مصنفہ ظفر احمد نظامی ہندوستان کے مشہور اطباء مصنفہ حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن صفحہ ۱۲۴

۳۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان (جلد دوم) مرتبہ شریف الدین پیرزادہ صفحہ ۱۱۳

ایک شخص ایک داستان

لال قلعہ، قطب مینار، جامع مسجد، چاندنی چوک، دلی میں اس گزرے زمانے میں بھی دیکھنے کے لیئے بہت کچھ تھا۔ دور دور سے لوگ دلی کی سیر کے لیئے آتے۔ جمنا جی کے پاٹ کو دیکھتے، قطب صاحب کی لاٹھ کی سیر کرتے، جامع مسجد جاتے، لال قلعہ کا نظارہ کرتے، پھر چاندنی چوک میں گھومتے پھرتے خیال آتا کہ بلیماراں چل کر حکیم اجمل خاں کو دیکھیں اور خواجہ حسن نظامی نے دلی کی سیر کرنے والوں کو مشورہ دیا کہ "جو لوگ دلی کی سیر کو آئیں ان کو ضرور دیکھیں۔ ملنے کی کوشش نہ کریں۔ ان کو فرصت نہیں ملتی۔ مطب میں جا کر صورت دیکھ لینی چاہیے کہ دہلی کا سب سے بڑا کامل الفن یہ ہے جس سے دہلی کی عزت اور تمام ہندوستان کی آبرو قائم ہے۔"(1)

مطب میں جا کر صورت دیکھنے والے دیکھتے کہ بیماروں کا میلہ لگا ہے۔ باہر موٹروں اور تانگوں کی قطار دور تک چلی گئی ہے۔ اندر پردہ پڑی ڈولیاں قطار اندر قطار رکھی ہیں۔ حکیم صاحب بیماروں کے بیچ گھرے بیٹھے ہیں۔ دائیں بائیں نسخہ نویس مستعدی سے نسخے لکھ رہے ہیں۔ برابر میں دواؤں سے بھرا صندوقچہ بھرا رکھا ہے، صندوقچہ پر ایک مہتمم تعینات ہیں۔ یہ میر انوار احمد ہیں۔ حکیم صاحب نبض دیکھتے جاتے ہیں نسخہ لکھواتے جاتے ہیں۔ بار بار صندوقچہ کھلتا ہے۔ دوا کی پڑیا نکالتے ہیں اور بیمار کو دیتے ہیں۔ لیتے کچھ نہیں ہیں۔ نہ دوا کی قیمت نہ مشورے کی فیس۔ بیماروں کے تیمار دار گھر لے جانے کے لیئے کھڑے ہیں۔ کسی لے جانے والے کی کار میں بیٹھے اور مریضوں کو دیکھنے روانہ ہوگئے، ان مریضوں کو بھی جن کے گھر سے سواری آئی ہے اور ان مریضوں کو بھی جن کے نادار تیمار دار پیدل چل کر پہنچے ہیں۔ پورے شہر میں گشت کیا۔ ایک ایک مریض کو دیکھا، پھر چلتے چلتے کسی ایسے مریض کا خیال آگیا جس کی

طرف سے کوئی خبر کوئی گزارش نہیں پہنچی ہے۔ اس کے گھر پر جا کر دستک دے دی۔ مریض کا حال پوچھا، نبض دیکھی، نسخہ میں ترمیم و تنسیخ کی اور آگے بڑھ لیئے۔ کسی نے رستے میں روک لیا اور گھر پر چل کر مریض کو دیکھنے کی درخواست کی تو اس کے ساتھ چل پڑے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ وہ ایک مریض کے گھر سے نکلے، موٹر میں سوار ہونے لگے تھے کہ کسی نے پیچھے سے پکارا کہ حکیم صاحب، آپ یہ اعلان کیوں نہیں کردیتے کہ میں باہر سے آنے والے مریضوں کو نہیں دیکھوں گا۔ حکیم صاحب موٹر میں بیٹھتے بیٹھتے اترے، اس شخص کے پاس گئے پوچھا کہ عزیز تجھے کیا شکایت ہے۔ اس نے کہا کہ میں دور کے دیس سے آیا ہوں۔ بیمار بیوی کو ساتھ لایا ہوں۔ اس شہر میں ڈیرے ڈالے پڑا ہوں کہ شاید آپ کی توجہ ہو جائے۔ حکیم صاحب اس کے ہمراہ ہولئے۔ گھر جا کر اس کی بیوی کو دیکھا، نسخہ لکھا اور واپس ہوئے۔ (۲)

مایوس العلاج مریض دور دور سے چل کر آتے کبھی رستہ چلتے حکیم صاحب کو پکڑ لیتے، کبھی مطب پہنچ کر دہائی دیتے۔ ایک نوجوان دق کا مارا جب سب علاج کر کے تھک گیا تو دلی پہنچا اور اپنے آپ کو حکیم صاحب کے قدموں میں ڈال دیا۔ حکیم صاحب نے مریض کو دیکھا۔ کہا کہ بیٹھ جا، فوراً ڈھائی سیر دودھ منگایا۔ اس میں ایک رتی دوا ڈالی۔ پانچ منٹ میں دودھ جم گیا۔ نوجوان سے کہا کہ لے اسے کھا، نوجوان نے جما دودھ کھانا شروع کیا۔ جب سارا کھا چکا تو اسے پسینہ آنا شروع ہوا حکیم صاحب نے یہ دیکھ کر نوجوان کے ساتھی کو ہدایت کی کہ اس کے کپڑے لے کر آؤ۔ ساتھی بھاگا ہوا گیا اور دھلا ہوا جوڑا لے کر آیا۔ یہاں اس کے آتے آتے نوجوان کے سارے کپڑے پسینہ میں بھیگ چکے تھے۔ کہا کہ بدن کو پونچھ لے پھر غسل کر کے لباس بدل لے۔ نوجوان نے غسل کیا کیا کہ غسل صحت ہی کر لیا۔ (۳)

ایک کوچوان آیا، جیب سے پڑیا نکالی اور بولا کہ حکیم صاحب میرا آپ نے علاج نہ کیا تو میں آپ کے سامنے سنکھیا کی پڑیا کھاؤں گا اور مر رہوں گا۔ پوچھا کیا حال ہے۔ بولا کہ دمہ نے بالکل دم نکال دیا ہے۔ اب برداشت نہیں ہوتی۔ سمجھایا کہ علاج کر انشاء اللہ شفا ہوگی۔ کوچوان کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ بولا کہ حضور میں نے آج مرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج ہی آرام ہوا تو ہوا ورنہ بندہ سنکھیا کھا کے اسی در پہ لیٹ

رہے گا۔ حکیم صاحب نے تامل کیا، پھر تین پڑیاں دیں اور کہا کہ سنکھیا کھا کے کیوں مرتا ہے۔ مرنا ہے تو دوا کھا کے مر۔

کوچوان نے گھر جا کر حسب ہدایت ایک پڑیا کھائی۔ کھاتے ہی قے شروع ہوگئی اور ایسی شروع ہوئی کہ تین گھنٹے تک جاری رہی۔ اس کے بعد دوسری پڑیا کھالی۔ قے نے اور زور باندھا، لگتا تھا کہ قے کے ساتھ جان بھی نکل جائے گی۔ جان تو نہیں نکلی مگر ہوش جاتے رہے۔ ہاتھ پیر شل ہوگئے، بیہوشی طاری ہوگئی۔ تیمار داروں نے پیاز سونگھائی، پانی کے چھینٹے دیئے۔ تب اسے ہوش آیا۔ ہوش آتے ہی مریض نے تیسری پڑیا بھی پھانک لی۔ اب واقعی جان پہ بن آئی۔ بار بار قے ہوتی اور قے کے ساتھ بیہوش ہو جاتا۔ شام ہوتے ہوتے ایک قے اس قیامت کی ہوئی کہ ساتھ ہی بلغم کا ایک سخت ٹکڑا خون میں لپٹا برآمد ہوا۔ مریض اس کے بعد ایسا بیہوش ہوا کہ گھنٹوں کی خبر لایا۔ مگر جب ہوش میں آیا تو پوری طرح ہوش میں تھا۔ مرض رفو چکر ہوچکا تھا۔ (۴)

دو شخص تباہ حال مطب میں پہنچے پوچھا کہ ''اجمل خاں کجاست'' حکیم صاحب نے کہا ''اجمل خاں میں ہوں۔ فرمایئے'' یہ سن کر دونوں حکیم صاحب کے قدموں پر گر پڑے اور زار و قطار رونے لگے۔ رو رو کر انہوں نے اپنا احوال سنایا کہ ہم دو بھائی بخارا کے رہنے والے ہیں، تاجر پیشہ ہیں، کل تک عمائدین شہر میں تھے، اب دربدر خاک بسر پھرتے ہیں۔ جذام کے موذی مرض نے گھیر لیا۔ سب علاج کر دیکھے۔ اسی میں سارا اثاثہ لٹا دیا۔ مگر جتنی دوا کی مرض بڑھتا گیا۔ سنا کہ دلی میں ایک حکیم ہے کہ لاعلاجوں کا علاج کرتا ہے اور مرتے ہوئے کو زندہ کر دیتا ہے۔ سو بخارا سے پیادہ چلے اور ہرج مرج کھینچتے یہاں پہنچے ہیں۔

حکیم صاحب نے مسافروں کی بپتا سنی۔ بڑے بھائی کو دیکھا جو جذام کا مریض تھا۔ چہرہ چپٹا، ناخن ٹیڑھے، ناک بیٹھی ہوئی، بدن پر سرخ چکتے پڑے ہوئے، تعفن اٹھتا ہوا۔ کھانے کے لیئے جیب میں پیسہ نہیں، پہننے اوڑھنے کے لیئے کپڑا نہیں۔ حکیم صاحب نے دونوں کو اپنے پیش کار حکیم رشید احمد خاں کی سپردگی میں دیا کہ انہیں اپنے کمرے پر رکھو اور دیکھ بھال کرو۔ ان کے سب مصارف میرے ذمے ہیں۔ علاج

شروع ہوگیا ہوتا رہا دو ماہ میں جذام غائب، مریض شفایاب ہوچکا تھا۔ دونوں بھائیوں نے حکیم صاحب کو دعائیں دیں اور واپس بخارا جانے لگے مگر جیب خالی تھی۔ حکیم صاحب نے پشاور تک کا کرایہ اور سفر خرچ دیا اور پشاور کے احباب کو تعارفی رقعہ لکھ کر حوالہ کیا جس میں لکھا تھا کہ عزیزو یہ بخارا کے مسافر ہیں۔ ان کی مدد کرو۔ (۵)

ایک نادار مریض اس حال میں آیا کہ خون کا پیشاب آ رہا تھا۔ کسی صورت رکتا نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے مریض کا حال سنا اور مالی احوال کو جانا جیب سے چار پیسے نکال کر دیئے کہ جاؤ بازار سے ملتانی مٹی لے کر آؤ۔ مریض دوڑا دوڑا گیا۔ ڈھیر ساری ملتانی مٹی لے آیا۔ کہا کہ ایک تولہ مٹی روزانہ صبح و شام بھگوؤ اور چھان کر پی لیا کرو۔ چار دن مریض نے یہ دوا کی اور صحت یاب ہوگیا۔ (٦)

کبھی کبھی یوں بھی ہوا کہ دوا نہ دارو، کوئی معمولی سا مشورہ دیا اور مریض کو اچھا کر دیا۔ لالہ لاجپت رائے کو بدخوابی کا مرض لاحق ہوگیا۔ کتنے ڈاکٹروں کا علاج کیا۔ شفا نہ ہوئی۔ حکیم صاحب کو اپنی شکایت بتائی۔ حکیم صاحب نے کھانے کے اوقات پوچھے۔ لالہ جی نے بتایا کہ دن کا بھوجن بارہ بجے، رات کا آٹھ نو بجے کے لگ بھگ۔ کہا کہ کھانا صبح دس بجے کھایا کرو اور رات کا چھ بجے۔ پوچھا، کوئی دوا، کہا، بس یہی دوا ہے۔ لالہ جی تھوڑا بددل ہوئے۔ سوچا کہ حکیم جی نے ٹال دیا۔ بہرحال انہوں نے اس تجویز پر عمل کیا اور لیجئے ساری شکایت بدخوابی اور بے خوابی کی دور ہوگئی۔ (۷)

حکیم صاحب کا علاج کرنے کا اپنا طریقہ تھا۔ کبھی مریض کو مٹی اس انداز سے کھلائی کہ وہ اکسیر بن گئی۔ کبھی خالی مشورہ دیا اور اچھا کر دیا۔ ادھر مریض بھی یہاں رنگ رنگ کا آتا تھا۔ سرحد سے ایک پٹھان آیا۔ اس نے اپنا مرض بتایا۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھا اور کہا کہ گھوٹ چھان کر پی لو۔ پٹھان نے کیا کیا کہ جس کاغذ پہ نسخہ لکھا تھا اسے پانی میں بھگو کر گھوٹا، پھر چھانا، پھر غٹاغٹ پی لیا۔ اگلے روز مطب میں آیا اور کہا، حکیم جی وہ نسخہ تو کمال تھا۔ سارا مرض جاتا رہا۔ وہ نسخہ پھر لکھ دو۔ حکیم صاحب نے کہا، نسخہ دکھاؤ۔ پٹھان نے حکیم صاحب کو حیرت سے دیکھا اور کہا کہ خواسے تو ہم نے گھوٹ چھان کر پی لیا۔ (۸)

بلند شہر کے کسی دیہات سے ایک کسان چل کر دلی پہنچا۔ حکیم صاحب کے

مطب میں حاضر ہوا۔ کھدر کی پگڑی کے کونے کو کھول کر ایک اٹھنی نکالی اور حکیم صاحب کے سامنے اچھال دی۔ حکیم صاحب نے اٹھنی واپس کر دی کہ ہم مریض سے فیس نہیں لیا کرتے۔ کسان نے یہ سوچ کر کہ بڑا حکیم ہے، اٹھنی فیس کم ہے، پگڑی کا دوسرا کونہ کھول کر دوسری اٹھنی نکالی اور دو اٹھنیاں حکیم صاحب کی طرف اچھال دیں۔ حکیم صاحب نے دونوں اٹھنیاں پھر اسی عذر کے ساتھ واپس کر دیں کہ ہم مریض سے فیس نہیں لیا کرتے ہم تمہارا علاج مفت کریں گے۔ مرد دہقان بگڑ گیا۔ کہا کہ ہم علاج نہیں کرائیں گے۔

شاگردوں نے دہقان کو سمجھایا کہ تم پہ موقوف نہیں حکیم صاحب مطب میں آنے والے کسی مریض سے فیس نہیں لیتے۔ اس پر چکرایا، کہا کہ یہ نیا حکیم نکلا ہے کہ فیس نہیں لیتا۔ میں اپنی بستی کے حکیم جی کو فیس میں ایک سیر گیہوں دیتا ہوں۔ وہ تو لے لیتے ہیں۔ پھر بولا، اچھا علاج تو کرو تم دلی کے حکیم ہو۔ بڑی فیس مانگتے ہو۔ میں اچھا ہو گیا تو ایک من گیہوں لے کے آؤں گا اور تمہاری کوٹھی میں بھر دوں گا۔ (۹)

سی ایف اینڈریوز نے مطب کا یہ نقشہ دیکھا تو حیران رہ گئے، یہ نقشہ دیکھ کر اس پادری کے تصور میں وہ نقشہ کھنچ گیا جو انجیل میں بیان ہوا ہے ''جب شام ہوئی تو اس کے پاس بستی کے ان سب بیماروں، لاغروں کو لایا گیا جو موت کے روگ میں مبتلا تھے اور اس نے ان سب کو شفا بخشی۔'' پادری اس نقشہ کو دیکھ کر نقش حیرت بن گیا۔ ''جب میں حکیم صاحب کے گرد غربا اور مساکین کا ہجوم دیکھتا تھا تو مسیح علیہ السلام میری نظروں میں پھر جاتے تھے۔'' (۱۰)

مگر اب صرف مسیحائی کی داستانیں رہ گئی تھیں۔ مسیحا جا چکا تھا۔ جو داستانیں کہانیاں وہ پیچھے چھوڑ گیا تھا وہ اس رنگ کی تھیں جو جنم لینے کے لیئے لمبا وقت مانگتی ہیں۔ قبول عام کی سند پانے والی کسی شخصیت کو گزرے جب ایک پورا زمانہ بیت جاتا ہے اور جب اس کے واقعی خدوخال طور اطوار اور حالات و واقعات ماضی کے دھندلکوں میں تحلیل ہو جاتے ہیں تب کہیں جا کر اس کی صفات اور اس کے کارنامے خلقت کے تخیل کی مدد سے ان دھندلکوں کے بیچ سے ایک داستان بن کر بر آمد ہوتے ہیں۔ شخصیتیں صدیوں کے عمل میں لیجنڈ بنتی ہیں۔ مگر مسیح الملک کے ساتھ یہ عمل

ان کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔

آدمی مجبور ہے اور دکھی ہے۔ اس کے دکھوں میں ایک بڑا دکھ اس کے جسم کے روگ ہیں۔ روگوں سے نجات روگی انسانیت کا ایک خواب چلا آتا ہے ایسے شخص کا تصور جو اسے اس کی مجبوریوں سے اس کے دکھوں سے، اس کے روگوں سے اسے نجات دلا دے۔ نجات دہندہ کا تصور ہمارے اجتماعی تصور میں بسا ہوا ہے۔ دکھ بیماری سے نجات دلانے والا ہمارے تصور میں مسیحا ہے۔ زمانے کے بعد جب کوئی ایسا چارہ گر ظاہر ہوتا ہے جو روگی خلقت کے خواب کی تعبیر بنتا نظر آئے تو وہ اسے اپنا مسیحا جان کر اپنا خواب اس کی تحویل میں دے دیتی ہے۔ کتنے زمانے کے بعد روگوں کی دھرتی ہندوستان میں ایک ایسا چارہ گر ظاہر ہوا تھا جس نے دیکھتے دیکھتے مسیحا کا روپ دھار لیا۔ قریب اور دور کی بستیوں سے، کالے کوسوں سے سرحد پار دیسوں سے روگی چل کر آتے، اس سے دوا لیتے، شفا پاتے اور اس کی حکمت کا کلمہ پڑھتے واپس جاتے۔ حکیم اجمل خاں جلدی ہی خلقت کے لیئے جسم کے روگوں پر غلبہ کی علامت بن گئے۔ یہ خیال اس کے دل و دماغ میں راسخ ہوتا چلا گیا کہ کوئی مرض اب لا علاج نہیں ہے، کہ ہر مرض کی دوا مسیح الملک کے پاس ہے۔

حکیم صاحب کی موت کے ساتھ خلقت اپنے مسیحا سے محروم ہو گئی۔ اچھا بڑے حکیم صاحب مر گئے۔ دلی والا حکیم دنیا سے اٹھ گیا۔ اچھا؟ واقعی؟ لوگوں کو اس موت پر صدمے کے ساتھ اچنبھا بھی بہت ہوا۔ مسیحا کا مرنا صدمے سے زیادہ حیرت کا تجربہ ہوتا ہے۔ حیرت اور صدمے سے دوچار خلقت نے اپنے حافظہ اور تخیل کی مدد سے مسیحا کو واپس لانے کی کوشش کی۔ جب صبح ہوتی تو شہر کے بیمار اور شہر سے دور والی بستیوں کے روگی، مایوس العلاج مریض، موت کے منتظر بیمار قطار اندر قطار اس کوچے میں آتے اور مطب شریفی پر دستک دیتے۔ وہ حکیم درد مندی سے انہیں دیکھتا، دوا کرتا، کسی کو چٹکی دے کر، کسی کو قیمتی خمیرے کھلا کر شفا کی نعمت سے مالا مال کر دیتا۔ لوگوں نے ان گزری صبحوں کو ایسے یاد کیا جیسے عیسیٰ مسیح کی شاموں کو یاد کیا گیا تھا۔ شفا پانے والوں نے اپنے شفا پانے کے واقعات یاد کئے جو اب معجزے نظر آتے تھے۔ علاج اور شفا کے واقعات معجزوں اور کہانیوں کی صورت پھیلتے چلے گئے۔ حکیم صاحب کے گرد داستانی

شخصیت کا سا ہالہ ترتیب پاتا چلا گیا۔

پھر لوگوں نے اس شخص کی دردمندی کو یاد کیا۔ اس کی خدا ترسی اور غربا پروری کے قصے بیان ہونے لگے۔ معتبر لوگوں نے ان قصوں کی تصدیق کی۔ علامہ راشد الخیری کو یاد آیا کہ ان کی تربیت گاہ میں حکیم صاحب سال میں تین چار پھیرے لگاتے اور یتیم بچیوں کے سر پہ کمال شفقت سے ہاتھ پھیرتے۔ مولانا کفایت اللہ نے بیان کیا کہ "کتنی بیواؤں اور یتیموں کے ماہانہ وظائف اور کتنے ہی غریبوں اور حاجت مندوں کی یکمشت عطیات سے دستگیری ہمیشہ جاری رہتی تھی اور اس میں ماہانہ بڑی گراں قدر رقم خرچ ہو جاتی تھی، مگر سوائے ان کے معتمد کارکنوں یا ان لوگوں کے جو مستفید ہوتے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ (۱۱)

رامپور میں ایک عطار تھے معشوق علی۔ حکیم صاحب سے آ کر اپنی مشکل بیان کی کہ جوان بیٹی گھر میں بیٹھی ہے، رشتہ بھی موجود ہے مگر ہاتھ پیلے کیسے کروں گھر میں دمڑی نہیں۔ حکیم صاحب نے تامل کیا، پھر پوچھا کہ تم نے بارش کا پانی تو جمع کر رکھا ہوگا۔ بولے کہ ہاں وہ تو دوکان پہ موجود ہے کہا کہ اب میں نسخہ میں آب الٰہی لکھا کروں گا۔ اس سے مراد یہی پانی ہوگا۔ سو اس روز سے معشوق علی عطار کی دوکان پر حکیم صاحب کا لکھا ہوا نسخہ پہنچتا اس میں آب الٰہی لکھا ہوتا۔ آب الٰہی نسخوں میں اتنا چلا اور اتنا گراں بکا کہ بیٹی کا پورا جہیز تیار ہو گیا۔ (۱۲)

قاری سرفراز حسین کے بیٹے قاری عباس نے بیان کیا کہ قاری سرفراز حسین حکیم صاحب کے پاس پہنچے، کہا کہ رسالہ نکال رہا ہوں امداد کا طالب ہوں۔ حکیم صاحب خاموشی سے اٹھ کر اندر گئے۔ تھوڑی دیر میں ایک پوٹلی قاری صاحب کو نذر کی۔ قاری صاحب نے گھر آ کر پوٹلی کھولی تو اس میں سے دو ہزار روپے کی رقم نکلی۔

غریب بیماروں کا علاج مفت ہوتا۔ ایسے کسی بیمار کو گھر دیکھنے جاتے اور گھر کا نقشہ دگرگوں نظر آتا تو کہتے کہ نسخہ مطب میں جا کر لکھوں گا۔ کوئی میرے ساتھ چلے۔ مریض کا وارث ہمراہ مطب میں پہنچتا۔ وہاں نسخہ کے ساتھ ساتھ بند لفافہ بھی حوالے کرتے جس میں اچھی خاصی رقم ہوتی۔

خاندان والوں کے ساتھ سلوک اس طرح ہوتا کہ کوئی گزر جاتا تو سب سے

پہلے اس گھر پہ پہنچتے اور سو روپے نذر کرتے۔ عید بقر عید پر خاندان کے ہر فرد کے گھر پہنچتے۔ پوچھتے کہ کیا کپڑے بنائے ہیں۔ کسی نے کپڑے نہ بنائے ہوتے تو چلتے چلتے تکئے کے نیچے کچھ رکھ کر چلے آتے۔ بعد میں جب تکیہ اٹھایا جاتا وہاں سے رقم برآمد ہوتی۔

دوست دشمن میں کوئی امتیاز نہیں تھا، جو اپنی ضرورت لے کر آگیا اس کی ضرورت کسی نہ کسی طور پر پوری کر دی۔ ایک صاحب ان کے خلاف مضمون لکھتے رہتے تھے۔ اتفاقاً ایک دفعہ انہیں حکیم صاحب سے کام پڑ گیا حکیم صاحب نے ان کا کام کر دیا۔ رخصت کرتے وقت کہا کہ میں نے آپ کا کام تو کر دیا ہے، مگر آپ میرے خلاف لکھنے میں کوتاہی نہ کریں۔

۱۹۱۹ء کے ہنگامہ میں ایک سی آئی ڈی انسپکٹر جو حکیم صاحب پر مامور تھا مظاہرین کے ہاتھوں مجروح ہوا اور ہسپتال میں داخل ہوگیا۔ حکیم صاحب روز اس انسپکٹر کی مزاج پرسی کے لیئے جاتے۔ یہ انسپکٹر اپنی اسی نااہلیت کی بنا پر محکمہ سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے شریف منزل کا آستانہ پکڑ لیا۔ جب کئی مہینے حاضری دیتے گزر گئے تو حکیم صاحب نے ایک روز خاموشی سے اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھما دیا۔ اس لفافہ میں رقم تھی جس سے اس نے کاروبار شروع کیا اور نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کی۔

امداد کا ایک طریقہ یہ نکالا تھا کہ کوئی قیمتی دوا تیار کرنے لگتے تو خاندان والوں سے کہتے کہ اس میں حصہ ڈالو، جو جتنا حصہ ڈالتا اس حساب سے منافع ملتا۔

رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے۔ لگتا تھا کہ دلی کی ساری تہذیب سمٹ سمٹا کر اس ایک آدمی میں آ گئی ہے۔ کیا شائستگی تھی کہ زندگی بھر کبھی اونچی آواز سے نہیں بولے۔ قہقہہ لگا کر ہنسے نہیں۔ محفل میں کیا کیا ہنسوڑ بیٹھا رہتا اور کیا قہقہے لگتے مگر یہاں ہونٹوں پر ایک ہلکا تبسم آیا اور بس، یہی شائستگی بچوں کو سکھاتے تھے۔ حکیم محمد نبی خاں نے بیان کیا کہ میرا بچپن تھا۔ برابر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ منہ سے چپڑ چپڑ کی آواز نکل رہی تھی حکیم صاحب نے کیا کیا کہ میرے کان کے قریب منہ لا کر نوالہ چبایا اور پوچھا کہ یہ آواز تمہیں اچھی لگتی ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ کہا کہ پھر ایسی آواز منہ سے مت نکالا کرو۔ مگر بچے ان کے لیئے بچے نہیں تھے۔ وہ شائستہ آدمی جس رکھ رکھاؤ اور ادب آداب سے بڑوں سے ملتا تھا اسی رکھ رکھاؤ اور ادب آداب سے چھوٹوں سے ملتا

تھا۔ عید بقر عید پر سب عزیزوں کے گھر خود جاتے بغیر اس امتیاز کے کہ کون عمر میں بڑا ہے اور کون چھوٹا ہے، جو چھوٹا ہوتا وہ شرمندہ ہوتا اور کہتا کہ سلام کے لیئے تو مجھے حاضر ہونا تھا کہ میں چھوٹا ہوں۔ جواب دیتے کہ ارے بھائی مرنے کے بعد کون چھوٹا کون بڑا۔ دو لڑکے شریف خاں اور محمود خاں ماں کا پیغام لے کر حکیم صاحب کے پاس گئے کہ کل آپ ہمارے گھر تشریف لائیں۔ جس وقت دیوان خانے میں پہنچے اس وقت وہاں چند والیان ریاست بیٹھے تھے۔ لڑکوں کو دیکھ کر حکیم صاحب کھڑے ہوگئے۔ والیان ریاست بھی شرما حضوری کھڑے ہوگئے۔ حکیم صاحب نے معزز مہمانوں سے لڑکوں کا تعارف کرایا۔ بیچارے لڑکوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ گھر جا کر انہوں نے ماں سے یہ واقعہ بیان کیا۔ دوسرے دن ماں نے حکیم صاحب کے آنے پر ان سے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا۔ بیچارے بچے شرم سے پانی پانی ہوگئے۔ بولے کہ آج میں نے ان لڑکوں کی عزت نہ کی تو کل دوسرے بھی ان کی عزت نہیں کریں گے۔

خیال خاطر احباب اور خیال خاطر اعزا میں کبھی کوتاہی نہیں ہوئی۔ کبھی کسی آبگینہ کو اس شائستہ شخص نے ٹھیس نہیں لگائی۔ ٹھیس کیسے لگتی کہ نہ کبھی غصہ آتا نہ کبھی اونچا بولتے تھے، نہ کبھی لہجہ میں تلخی آتی تھی۔ حکیم سعید خاں ایک غصیلے آدمی، زبان کے ایسے پھوہڑ کہ جس سے بگڑتے اسے گالیاں سناتے۔ شہر میں جرنیل کہلاتے تھے۔ یہ جرنیل صاحب حکیم صاحب کے ملازموں کو بے نقط سناتے۔ مگر کیا مجال کہ حکیم صاحب کے دل پر میل آ جائے۔ ۱۹۱۹ء میں شہر میں ہنگامہ ہوا۔ مارے جانے والوں کی لاشیں شرفی منزل میں آئیں تو جرنیل صاحب اس روز حکیم صاحب پر بھی گرم ہوگئے۔ غصے میں چلائے اور بولے کہ ہتھیار پاس نہیں۔ چلے ہیں انگریز سے مقابلہ کرنے۔ حکیم صاحب نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ ''سعید خاں، تھوڑا ہوش کرو۔''

ملازموں اور نوکروں کے ساتھ بھی سلوک مختلف نہیں تھا۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ رات گئے صحبت تمام ہونے پر دیوان خانے سے نکل کر خواب گاہ کی طرف چلے اندھیرا ہونے کی وجہ سے راہ میں بچھے ایک پلنگ سے ٹکرائے۔ اس پلنگ پر کوئی نوکر سو رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور معافی مانگنے لگا کہ غلطی ہوگئی۔ میں نے پلنگ رستے میں بچھا لیا تھا۔ حکیم صاحب نے ملائمت سے کہا کہ نہیں نہیں پلنگ تو ٹھیک بچھا ہوا تھا بس میں

ہی دیکھ کر نہیں چلا۔ (۱۳)

یہ ضبط، یہ شائستگی، یہ رکھ رکھاؤ۔ بقول میر

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

دلی کی تہذیب اپنی جگہ حکیم صاحب نے اہل عشق کی بھی تو صحبت اٹھائی تھی۔ شروع جوانی میں میاں منور علی شاہ چشتی نظامی سے بیعت ہوئے کہ یہ بزرگ دلی کے نواح میں مرجع خاص و عام بنے ہوئے تھے۔ نواب فیض احمد خاں بھی انہیں سے بیعت تھے۔ دونوں دوست مل کر ان کے آستانے پر حاضری دیتے۔ مگر یہ بزرگ جلد ہی دنیا سے اٹھ گئے مگر جوئندہ یابندہ۔ اہل اللہ کا پتہ پاتے رہے اور فیض حاصل کرتے رہے۔ نواب وقار الملک سے سنا کہ اسلام آباد (چاٹگام) میں ایک اہل طریقت ہیں مولانا سید شاہ عبدالحیٔ کہ خانقاہ سے قدم نہیں نکالتے۔ ایک زمانے سے خانقاہ میں بند بیٹھے ہیں اور مرجع خلق بنے ہوئے ہیں جس پر نظر پڑ گئی اس کی کایا پلٹ ہوگئی۔ حکیم صاحب نے یہ احوال سنا اور اس بزرگ کے معتقد ہوگئے۔ ایک منظوم عریضہ لکھ کر روانہ خدمت کیا۔

طوطی آزاد بودم در قفس انداختند
از فراز آسماں گویا فتادم برزمیں
جادہ گم کردم ز بدبختی دریں تاریک شب
راہبر از من جدا او راہزن اندر کمیں
چوں گناہِ خویش آرم در جہاں اندر حساب
از ندامت بر کشم بردیدہ و رخ آستیں
دل ہمی دارم بہ بر لیکن چہ دل خوار و فگار
جاں ہمی دارم بہ تن لیکن چہ جاں زار وحزیں
اے مسیحائے زماں درد دلم را چارۂ
یافتم تاب و تواں در پنجۂ دیو لعیں
از تو می پرسم بفرما منزل سلمٰی کجا ست
یاز انگشت شہادت یا ز چشم سر مگیں
چارۂ شک چوں بجویم از تو در شبہائے تار

زانکہ برافروختی از بہر ماشمع یقیں
چوں زحال من کسے پرسد بگویم در جواب
از وصال یار دورم رقیباں ہم نشیں

ادھر عریضہ کا جواب آیا کہ اے عزیز ہمارے پاس آنے کی نیت ترک کر کہ مبادا یہاں آ کر تیرا دل دنیا سے پھر جائے اور وہ کام جو تجھے انجام دینے ہیں رہ جائیں، ہم تیرے لیئے دعا کریں گے۔ سو حکیم صاحب نے حاضری کا ارادہ ترک کیا۔ مگر دور بیٹھے بیٹھے قلبی تعلق اتنا بڑھا کہ شاہ صاحب خوابوں میں آنے لگے۔ کہتے تھے کہ "جب میں رات کو بستر پہ لیٹتا ہوں تو حضرت کی صورت میرے سامنے ہوتی ہے" اور جو شکل و صورت اور حلیہ بیان کرتے وہ عین مین وہی ہوتا جو شاہ صاحب کا تھا۔ (۱۴) ایک دفعہ رنگون سے واپس ہوتے ہوئے سنا کہ شاہ صاحب علیل ہیں۔ جی چاہا کہ خدمت میں حاضری دیں۔ بذریعہ تار اجازت طلب کی ادھر سے جواب آیا کہ میں اچھا ہوں۔ تیرے سامنے بہت کام ہے۔ ابھی یہاں آنے کا ارادہ مت کر۔ حکیم صاحب نے ادھر جانے کا ارادہ ترک کیا اور دلی چلے آئے۔ دلی سے ایک منظوم عریضہ ارسال کیا۔

ترے نور جبیں سے ہے طلوع صبح نورانی
گریزاں ہے سب بختوں کی جس سے شام ظلمانی
تجھے شاہ جہانگیر اہل دل تسلیم کرتے ہیں
کہ اک عالم کی تونے کی جہانگیری جہانبانی
وجود پاک ہے تیرا وہ محور جس پہ روز و شب
دوائر سات اقلیموں کے پھرتے ہیں با آسانی
تجھے وہ خاص رتبہ عالم بالا میں حاصل ہے
کہ رہتے ہیں ملک ہر لحظہ سر گرم ثنا خوانی
تباہی میں ہے کشتی قوم کی اے ناخدا ہمت
اندھیری رات ہے اور موج پر ہے باد طغیانی
تجھے وقت کرم ہرگز گوارا ہو نہیں سکتا
کہ خادم سب ترے آزاد ہوں اور ایک زندانی

یہ ۱۹۱۹ء تھا اور ترکی دشمنوں کے نرغے میں تھا۔

اس بزرگ نے ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔ جب حکیم صاحب کی خبر ملی تو "روتے روتے گاؤ تکئے پر گر پڑے اور اتنا روئے کہ گاؤ تکیہ تر ہو گیا۔" (۱۵)

فقیروں اور درویشوں سے اس رشتہ نے طبیعت میں گداز پیدا کر دیا تھا۔ ایک نابینا گداگر خواجہ میر درد کی غزل گاتا ہوا شریف منزل میں آ نکلا۔ گرمی کے دن، رات کا سماں، صحن میں تخت بچھے تھے محفل جمی تھی۔ نابینا گداگر کی درد بھری آواز اور میر درد کی درد بھری غزل۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیئے آئے تھے اور کیا کر چلے

حکیم صاحب پر عجب اثر ہوا کہ آنکھ بھر آئی۔ جب نابینا اس شعر پر آیا

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

تو ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا اور بھری محفل میں اس رکھ رکھاؤ والے شخص پر رقت طاری ہو گئی۔ احباب نے یہ کیفیت دیکھی اور گداگر کو دے دلا کر فوراً رخصت کر دیا۔ (۱۶)

شاید یہ بھی اہل اللہ کی صحبت کا اثر تھا کہ دل غنی تھا اور طبیعت سخی پائی تھی۔ سوال کرنے والا کبھی اس در سے خالی ہاتھ نہیں پھرا۔ یتیموں اور بیواؤں کا ماہانہ بندھا ہوا تھا۔ دواؤں کا صندوقچہ تو خیر کیا امیر کیا غریب سب ہی کے لیئے کھلتا تھا۔ اس صندوقچہ کی دوا کے ساتھ قیمت کا تصور وابستہ نہیں تھا۔ مگر غریب مریضوں میں ایسے بھی بہت تھے کہ نسخہ لے کر ہندوستانی دواخانے جاتے اور دوائیں مفت پاتے۔ ہاں فقیروں اور درویشوں کے علاج معالجہ کے سلسلہ میں یہ تخصیص تھی کہ ان کی دوا دارو کا بوجھ دواخانے پر نہیں پڑتا تھا۔ وہ حکیم صاحب اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ پنجاب کے ضلع گجرات میں آوان کے مقام پر ایک بزرگ قاضی سلطان محمود تھے۔ ان کے علاج کے لیئے حکیم صاحب کو بلایا گیا۔ سراپا عقیدت بن کر وہاں پہنچے۔ نہ آنے جانے کا کرایہ لیا نہ دیکھنے کی فیس لی۔ واپس آ کر قیمتی دوائیں اپنی جیب سے خرید کر انہیں

بھیجتے رہے۔ پیش کاروں نے گزارش کی کہ ہندوستانی دوا خانے میں جو ایک مدا مدادی دواؤں کی ہے اس مد میں اس خرچ کو ڈال دیا جائے۔ جواب دیا کہ یہ نہیں ہوگا۔ میں بزرگوں کی خدمت کو سعادت عظمٰی سمجھتا ہوں۔ (۱۷) صوبہ سرحد کے مقتدر درویش بابا مانکی صاحب کے بیمار پڑنے پر ان کے عقیدت مندوں کے بلاوے پر وہاں پہنچے۔ ہفتے بھر تک قیام کیا۔ اس بزرگ کے عقیدت مندوں میں رؤسا بھی تھے۔ انہوں نے فیس پیش کی۔ حکیم صاحب نے کہا کہ خدمت میں میرا بھی تو حصہ ہونا چاہیے۔ مجھے آپ اس سعادت سے کیوں محروم کرتے ہیں۔ (۱۸)

اس طور کو سمجھنے کے لیئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ حکیم اجمل خاں حکیم تھے، ڈاکٹر نہیں تھے۔ ڈاکٹر ہمارے یہاں مغرب سے آیا اور اس وقت آیا جب وہاں صنعتی زندگی فروغ پا رہی تھی۔ صنعتی عمل Dehumanization کا عمل ہے۔ اس عمل میں انسانی سرگرمیوں اور مشغلوں سے انسانی حرارت خارج ہوتی چلی جاتی ہے اور ایک میکانکیت آتی چلی جاتی ہے۔ پیشوں کے ساتھ جب یہ عمل گزرا تو ان سے انسانی رنگ خارج ہوگیا۔ وہ محض اور صرف پیشے رہ گئے انسانی حرارت سے عاری، تاجرانہ رنگ میں رچے ہوئے۔ یونانی طب نے اس تہذیب میں نشوونما کی تھی جس میں انسانی رشتے مقدم حیثیت رکھتے تھے۔ اس کی وجہ سے پیشے محض پیشے نہیں رہے تھے بلکہ ہر پیشہ ایک تہذیبی ادارہ بن گیا تھا۔ ہند اسلامی تہذیب میں مختلف پیشوں کی بالعموم یہی صورت تھی۔ اس تہذیب میں طبابت محض ایک پیشہ نہیں تھی، بلکہ انسانی درد مندی کا بھی ایک رنگ اس میں شامل تھا۔ اس پیشہ میں خاندان شریفی اپنی مخصوص روایات کے ساتھ داخل ہوا۔ خاندان شریفی اصلاً اہل درد کا خاندان تھا۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار تھے کہ اہل اللہ میں سے تھے۔ اولاد نسلوں تک اپنے جد کے مسلک پر قائم رہی۔ رفتہ رفتہ طبابت کا پیشہ اختیار کیا مگر اپنی جدی روایت کے تحت یہاں بھی خدمت خلق کے مقصد کو اپنائے رکھا۔ اس خاندان نے آگے چل کر نامی گرامی طبیب پیدا کئے مگر صورت بالعموم یہ رہی کہ ایک پاؤں مطب میں تھا تو دوسرا پاؤں خانقاہ میں۔ حکیم محمود خاں دلی کے کوچوں میں کبھی گھوڑے پہ سوار نظر آتے کبھی فٹن میں سوار دکھائی پڑتے اور یہی حکیم محمود خاں سہارنپور جا کر کھیسن شاہ

کی ہمسفری میں دنوں اور ہفتوں پیادہ پا چلتے۔ دن میں مطب اور شطرنج، رات کو اوراد اور وظائف۔ رات کے دو بجے بیدار ہو کر تہجد پڑھتے، پھر وظائف میں مشغول ہو جاتے، فجر کی نماز کے بعد گھوڑے پہ سوار ہو کر سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین کی درگاہ میں حاضری دیتے۔

حکیم اجمل خاں آخر اسی باپ کے بیٹے تھے۔ حکیم محمود خاں میں یوں رنگین مزاجی کی بھی ایک لہر تھی۔ مگر بیٹوں میں اس لہر کو حکیم واصل خاں نے سمیٹ لیا اور داشتہ تو حکیم عبدالمجید خاں کی بھی تھی۔ حکیم اجمل خاں نے باپ سے ورثے میں صرف پرہیز گاری پائی۔ مزاج میں رنگینی تھی تو بس اتنی کہ موتی جان سے غزل سن لی۔ باقی تو نیک پاک آدمی ہی تھے۔ نہ پینے پلانے کا شوق، نہ شطرنج، نہ گنجفہ۔ شوق تھے تو ایسے جن سے کوئی اخلاقی برائی وابستہ نہیں۔ جیسے پہلوانی، لکڑی، بلیرڈ۔ جوانی دیوانی کہلاتی ہے مگر یہاں جوانی کا نقشہ یہ تھا کہ مطب سے اٹھے تو مسجد میں اور مسجد سے نکلے تو مطب میں۔ حافظ قرآن تھے۔ نماز روزے کے پابند۔ آگے چل کر دل کے مرض نے روزے رکھنے کے قابل نہ رکھا۔ گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے نماز میں بھی وہ پابندی اوقات نہیں رہی تھی، مگر ملازموں کو ہدایت تھی کہ مصلے ساتھ رکھو اور جب نماز کا وقت آئے سامنے آ کھڑے ہو۔ زکوٰۃ باقاعدہ دیتے تھے۔ بہت سی خیرات روزوں کی قضا کے کفارہ کے طور پر ہوتی تھی۔

طبابت ایسے شخص کے ہاتھوں میں آ کر خالی پیشہ تو نہیں رہ سکتی تھی۔ اس پیشہ میں انسانی دردمندی کا جو رنگ شامل تھا اس پر اصرار بڑھتا چلا گیا۔ باپ دادا کے اس اصول کو گرہ میں باندھا کہ غریبوں کا علاج مفت کرو۔ سو غریبوں کا علاج ہمیشہ مفت کیا۔ بستی والوں سے یہ وضعداری برتی کہ نہ مطب میں دیکھنے کی فیس نہ گھر پر جا کر دیکھنے کی فیس۔ باہر والوں میں جو صاحب حیثیت ہیں وہ فیس ادا کریں اور بلا لیں، جو حیثیت نہیں رکھتے وہ دلی آئیں اور علاج کرا لیں۔ اس طور حکیم اجمل خاں کے یہاں آ کر طبابت علاج معالجہ کے پیشہ سے بڑھ کر انسانی درد مندی کی ایک روایت بن گئی اور دلی کی فضا میں رچ بس کر اس نے ایک تہذیبی ادارے کی شکل اختیار کر لی۔ حکیم اجمل خاں طبیب ہونے کے ساتھ تہذیبی شخصیت بھی تھے۔ اپنی نفاست، اپنی وضعداری، اپنی

وسیع القلبی کی بنا پر وہ اپنی ذات میں ایک تہذیب نظر آتے تھے۔ دلی کی سیر کرنے والوں کو خواجہ حسن نظامی کا مشورہ تھا کہ حکیم اجمل خاں کو بھی دیکھو کہ دلی جن چیزوں سے عبارت ہے ان میں وہ بھی ہیں، مگر صاحب نظر سیر کرنے والے حکیم صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر پوری دلی کی سیر کر لیتے۔ ایسی شخصیتیں بھی تو ہوتی ہیں کہ پورے شہر کو اپنے اندر سمیٹ کر خود ایک شہر بن جاتی ہیں۔ حکیم اجمل خاں اپنی ذات میں دلی شہر تھے۔

اس تذکرے میں ہم آپ نے دلی شہر کو جس طرح جانا اور سمجھا ہے اس طرح وہ ہند اسلامی تہذیب کا ایک مثالی نمونہ ٹھہرتی ہے۔ حکیم اجمل خاں اصل میں اس تہذیب کی پیداوار تھے۔ بقول پروفیسر مجیب وہ "ہر اعتبار سے ہندی مسلمانوں کی بہترین تہذیبی روایتوں اور آدرشوں کا حاصل تھے۔" (۳۰) ہند اسلامی تہذیب آج کی مغربی تہذیب کے برخلاف شخصیت کی ہمہ جہت نشو و نما کی قائل تھی۔ آج کی مغربی تہذیب کا وصف یہ ہے کہ اس کے تحت یک رخی نشوونما ہوتی ہے۔ علمی روایت میں پہنچ کر اس وصف نے متخصصین کو جنم دیا۔ ارتگا گیزیے نے اپنی کتاب "Revolt of the masses" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "متخصصین اپنے چھوٹے سے دائرے کے اندر سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر اس دائرے سے باہر جاہل مطلق ہوتے ہیں۔ اس غیر متوازن تخصیص کا فوری نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ آج سائنس دان تو اتنے ہوگئے ہیں کہ پہلے کبھی نہیں تھے لیکن تہذیب یافتہ لوگ پہلے کے مقابلہ میں مثلاً ۱۷۵۰ء کے مقابلہ میں بہت کم رہ گئے ہیں۔" حکیم اجمل خاں کالج کے پڑھے ہوئے نہیں تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت اس پرانے طریق پر ہوئی تھی جو اسلامی تہذیب کی تعلیمی روایت کے تحت وضع ہوا تھا۔ حکیم صاحب نے یہ تعلیم پائی اور طبیب بنے مگر محض طبیب نہیں۔ وہ بڑے طبیب تھے مگر سپیشلسٹ طبیب نہیں تھے۔ وہ بیماری کا علاج نہیں کرتے تھے، بیمار کا علاج کرتے تھے یعنی طب کے میدان میں بھی وہ سپیشلسٹ نہیں تھے کہ ایک روگ کا علاج کر رہے ہیں اور دوسرے روگوں پر دھیان ہی نہیں۔

طب میں وہ علم کا دریا تھے، مگر یہ دریا ان حدود سے باہر بھی بہتا تھا حکیم صاحب کا یہ طریقہ چلا آتا تھا کہ جس شہر جاتے اس شہر کے کتب خانوں کو جا کر ضرور

دیکھتے اور وہاں جا کر وہ صرف طب کی کتابیں نہیں دیکھتے تھے مثلاً جتنا شغف طب سے تھا کم و بیش اتنا ہی شغف فقہ و حدیث سے تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے ایک خطبہ میں حکیم صاحب کی سیرت اور شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے ایک بات یہ کہی کہ "حکیم صاحب کی ذہنی جڑیں مسلمانوں کے علمی اور فنی ماضی میں بہت گہری پیوست تھیں اور ان کی نظر حال کی ترقیوں اور امکانات کو اس طرح صاف دیکھتی تھی جیسے شاید ہی کوئی نام نہاد جدید تعلیم یافتہ دیکھ سکتا ہو۔ ہم نے ان سے قدیم اور جدید کے ہم آہنگ بنانے اور سمونے کا سبق سیکھا۔" (۲۱)

ان کی نظر حال کی ترقیوں اور امکانات کو کس طرح دیکھ رہی تھی اور ان امکانات سے انہوں نے کس طرح عہدا برا ہونے کی کوشش کی اس کا تجزیہ بار بیرا مٹکاف نے اپنے مقالہ حکیم اجمل خاں رئیس آف دہلی اینڈ مسلم لیڈر میں کیا ہے۔ (۲۲) اس نے حکیم صاحب کی اس تحریر کا حوالہ دیا ہے جو کتب خانہ رامپور کی فہرست کتب کے دیباچہ کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اس میں حکیم صاحب نے لکھا تھا کہ "مشرقی علوم و فنون کا سورج اپنے وقت میں خوب چڑھا۔ کتنی قوموں نے اس کی تابانیوں سے اکتساب کیا۔ اب وہ سورج غروب ہو چکا ہے اور جیسا کہ زمانے کا طور چلا آتا ہے اس نے ایک نئے سورج کو جنم دیا ہے۔ اس زمانے کے لوگوں کے تقاضے یہ سورج پورے کر رہا ہے۔ زمانے نے جب بھی ایسا پلٹا کھایا قوموں کو اس کے نتائج بھگتنا پڑے۔ اب اس قسم کے نتائج کو ہمیں بھگتنا ہے۔ وہ جو ہم نے زمانہ سابق میں عظمت حاصل کی تھی اس کے تحفظ کی اگر ہم نے فکر نہ کی تو اس کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

بار بیرا مٹکاف کا کہنا ہے کہ حکیم صاحب نے ساری عمر جو جدوجہد کی وہ یہ تھی کہ طب کے میدان میں پلٹا کھانے کے اس عمل کی روک تھام کی جائے اور یہ خالی ایک پیشہ، ایک فن یا ایک علمی روایت کو بچانے کا معاملہ نہیں تھا۔ بار بیرا مٹکاف کا کہنا ہے کہ یونانی طب کا علاقہ مذہب سے تو بیشک نہیں تھا لیکن وہ مسلمانوں کی ثقافت کا مظہر اور مسلمانوں کے فخر کا نشان ضرور تھی۔ "تو حکیم صاحب نے اپنے پیشہ کے تحفظ کے لیئے جو کوششیں کیں ان کا گہرا تعلق ان کی ان کوششوں سے تھا جو مسلمانوں کی حیثیت کے تحفظ کے لیئے کی جا رہی تھیں (۲۳) مگر تحفظ کیسے ہو۔ علوم و فنون کا سورج تو اب

مغرب کے آسمان پر چمک رہا تھا۔ طب کے میدان میں بھی یہاں تحقیق رکی ہوئی تھی وہاں تحقیق کا عمل روز افزوں تھا۔ نئے نئے علاج دریافت ہو رہے تھے۔ حکیم صاحب نے اس سب کچھ کو دیکھ کر یہ جانا تھا کہ مغرب میں ہونے والی جدید طبی تحقیق کو یونانی طب میں سمو کر ہی اس طبی ادارے کو بچایا جاسکتا ہے۔ طبیہ کالج سے وہ یہی کام لینا چاہتے تھے۔

طبیہ کالج کس احساس کے تحت وجود میں آیا، اس پر بھی باربیرا مٹکاف نے بحث کی ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ دو ادارے خاص طور پر سرکاری سرپرستی سے محروم ہوئے۔ موسیقی اور یونانی طب، اور دونوں نے اپنے وقار کو بچانے اور اپنی مقبولیت کو برقرار رکھنے کے لیئے خاندان کے ادارے کا سہارا لیا۔ اس طرح موسیقی کے گھرانے وجود میں آئے۔ اسی پس منظر میں خاندان شریفی نے اہمیت حاصل کی مگر حکیم عبدالمجید خاں کے آتے آتے اس خاندان کو جلد یہ احساس ہوگیا کہ مغربی طب کی طرف سے جو چیلنج آیا ہے اس سے محض خاندان کے بل پر عہدہ برا نہیں ہوا جاسکتا۔ خاندان کے دائرے سے نکل کر کچھ اور کرنے کی ضرورت ہے اس احساس نے ایک نئی راہ سجھائی۔ علی گڑھ کالج کی مثال کو سامنے رکھ کر طبیہ کالج قائم کیا گیا۔ یوں طب خاندان کے دائرے سے نکلی اور اس کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ اکمل الاخبار اور مجلّہ طبیہ کے اجراء کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ آگے چل کر ۱۹۰۸ء میں طبیہ کالج میں ایک شعبہ نسواں بھی قائم ہوگیا۔ نئے زمانے کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے یہ ایک اور اہم قدم تھا اور جس کا تعلق ہم تحریک آزادی نسواں سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔

تو دنیائے طب میں نئے تقاضوں کے شعور نے خاندان شریفی میں جنم لیا اور رفتہ رفتہ حکیم اجمل خاں اس نئے شعور کے نمائندے بن گئے۔ انہوں نے نئی طبی تحریک کا رشتہ قومی تحریکوں سے جوڑ دیا۔

زبان ادب، اور فنون لطیفہ سے حکیم صاحب کا شغف بھی اپنی ایک معنویت رکھتا ہے اور ان کے ایک رچی ہوئی تہذیبی شخصیت ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ عربی زبان اور ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ عربی میں نثر اور نظم دونوں میں طبیعت رواں تھی۔

شاعری تین زبانوں میں کی۔ عربی، فارسی اور اردو۔ تخلص شیدا تھا۔ خم خانۂ جاوید کے مصنف لالہ سری رام کے لفظوں میں "زود گو اور جدت پسند طبیعت پائی تھی۔ نبض شناس معانی تھے۔ شعر کے حسن و قبح کو خوب پرکھتے تھے۔" (۲۴)

وہ خواب ناز میں تھے مرا دیدۂ نیاز
دیکھا کیا اور ان کی بلائیں لیا کیا
گم کردہ راہ آتے ہیں وہ آج میرے گھر
اے میری آہ نیم شبی تو نے کیا کیا

اگر عرض تمنا کا کسی دن امتحاں ہو گا
جبیں ہوگی کسی کی اور کسی کا آستاں ہو گا
آخر لبوں تک آ ہی گئی آرزوئے دل
کھو بیٹھے آج ہاتھ سے ہم آبروئے دل

شعر و شاعری سے مخصوص شغف تو اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائل دہلوی ان کی محفل شب کے رکن رکین تھے۔ باقی دوسرے شاعر اپنی جگہ۔ اور خالی شعر و شاعری نہیں آخر میر باقر علی داستان گو بھی تو یہاں آکر اپنی داستان کا طلسم باندھتے تھے اور پھر ایک گانے والی بھی اس محفل کی زینت ہوتی تھی۔ (۲۵) آخر حکیم صاحب کو موسیقی سے بھی تو لگاؤ تھا اور ایسا ویسا لگاؤ۔ غیر ممالک جاتے تو وہاں بھی موسیقی کی تقریبوں میں شرکت کے لیئے ضرور وقت نکالتے۔ پیرس گئے تو وہاں کے میوزیم اور آرٹ گیلریوں کو بھی خوب دیکھا بھالا اور تھیٹر میں بھی جھانکا۔ یعنی خالی موسیقی نہیں ہر فن کے لیئے ذوق موجود تھا اور موسیقی سے شغف کا شہر میں رہتے ہوئے احوال یہ تھا کہ دلی میں برس کے برس اہل ہنود کے انتظام میں ایک موسیقی کانفرنس ہوا کرتی تھی۔ وہاں کس شوق سے جاتے تھے۔ نہ جا سکتے تو چندہ تو بہرحال دیتے تھے۔ منتظمین کی طرف سے صدارت کی فرمائش ہوتی تو خود صدارت نہ کرسکتے تو کسی کو اپنی طرف سے نامزد کر دیتے۔ ادھر منتظمین بھی اتنے وضعدار تھے کہ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد اسی خلوص سے حکیم جمیل خاں کی خدمت میں حاضر ہوتے، کانفرنس کے لیئے چندہ لیتے

اور جسے وہ نامزد کر دیتے اس سے صدارت کراتے۔ ایک دفعہ حکیم محمد نبی خاں نامزد ہوئے۔ سو انہوں نے کانفرنس کی صدارت کی۔ (۲۶)

زبان سے دلچسپی کا احوال بھی سن لیجئے۔ مولوی سید احمد دہلوی بتاتے ہیں کہ حکیم صاحب نے ان کی فرہنگ آصفیہ کے واسطے والیانِ ریاست سے زور دار سفارشیں کیں۔ پھر کہیں ایسا ہوا کہ سید احمد دہلوی کے گھر میں آگ لگ گئی۔ اس آگ نے ان کی کی کرائی محنت پر پانی پھیر دیا۔ لغت کی تازہ چھپی ہوئی جلدیں دم کے دم میں جل کر راکھ ہو گئیں۔ آگے کیا ہوا۔ مولوی سید احمد دہلوی سے سنئے۔

"فرہنگ آصفیہ کی ازسر نو طبع ثانی کے واسطے آپ نے سفارش سے دریغ نہ کیا۔ آتش زدگی کے موقع پر آپ نے ہمدردی فرما کر مولف کی ڈھارس بندھائی۔ یہ جناب حاذق الملک بہادر ہی کی توجہ خاص کا نتیجہ ہے کہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے پھر اس کی معقول دستگیری فرمائی....

اے حاذق الملک تم صرف خطاب کے ہی حاذق الملک نہیں ہو تمہاری رفاہیت پر سارے جہاں کی جان قربان ہے۔ تمہاری خداقت اور دوراندیشی پر سب کا صاد ہے۔ تم صرف نباضِ امراض ہی نہیں ہو، بلکہ نبض شناسِ زمانہ بھی ہو۔" (۲۷)

سوچو کہ ایسے ہمہ رنگ شخص کی محفل کس رنگ کی ہوتی ہو گی۔ مریضوں اور سیاستدانوں سے ملاقاتیں دن دن تک تھیں۔ سیاستدانوں سے بے قاعدہ اور مریضوں سے باقاعدہ۔ اس طرح کہ ساڑھے نو بجے صبح سے دو بجے تک مطب۔ پھر اندر آ کر کھانا کھانا۔ شریف منزل کے باقی لوگ تو دس بجے ہی کھانے سے فارغ ہو لیتے تھے۔ حکیم صاحب دو بجے اکیلے کھانا کھاتے۔ کسی بچے کو شامل کر لیتے جو بالعموم ان کے پوتے محمد نبی خاں ہوتے تھے۔ دو بجے کے بعد قیلولہ۔ چار بجے تک آرام کیا۔ اس کے بعد پھر مطب۔ صبح کے اوقات میں اگر گاؤ تکئے کے سہارے بیٹھے نبض دیکھ رہے تھے تو اب مونڈھے پر یا کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ پر مریض قطار اندر قطار۔ دوسرے ہاتھ پر نسخہ لکھنے والے پانچ سات کی تعداد میں۔ ان میں سے دو باقاعدہ، باقی طبیہ کالج کے فارغ التحصیل جنہیں نسخہ لکھنے کی تعلیم دینی مقصود ہوتی۔ بعد میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ

انہیں سمجھانا کہ کونسا نسخہ کیوں لکھا گیا۔ نشست بیچ کے درمین ہوتی اس مقصد سے کہ خاتون مریضوں کی ڈولیاں قریب رکھی جاسکیں اور بیٹھے بیٹھے ان کی نبض دیکھی جاسکے۔ پیچیدہ مریض ہوا تو اپنے زیر علاج رکھا۔ لمبے علاج کا مستحق ہوا تو حکیم بھورے میاں کی طرف بھیج دیا کہ وہ مریض کی بہت دلجوئی کرتے تھے اور ایسے مریضوں کے لئے بہت موزوں تھے۔ ایسے مریض بھی ہوتے جن کا علاج یہ تھا کہ کوئی تیز دوا دی جائے کہ مریض شفا پا سکتا ہے تو شفا پا جائے ورنہ جو مرضی مولا۔ ایسے مریض کو حکیم محمد احمد خاں کی طرف بھیج دیتے۔ (۲۸)

لیجئے مطب کا وقت تمام ہوا۔ دن ختم ہوا۔ اب رات کی عملداری ہے۔ مطب کی گہما گہمی ختم۔ اب دیوان خانے میں چہل پہل ہے۔ دلی میں لے دے کے اب پانچ ہی تو دیوان خانے رہ گئے تھے، یعنی ایسے دیوان خانے جو دلی کی تہذیبی زندگی کی نمائندگی کرتے تھے۔ دیوان خانہ نواب فیض احمد خاں، دیوان خانہ ننھے خاں، دیوان خانہ لالہ سری رام، دیوان خانہ لالہ پارس داس خزانچی، اور دیوان خانہ حکیم اجمل خاں۔ اس دیوان خانے کا کیا خوب نقشہ تھا۔ دیواروں پر جا بجا طغرے اور کتبے۔ بیچ بیچ میں خاندانی بزرگوں کی قلمی تصویریں چھت مین آویزاں اکا دُکا جھاڑ فانوس، پائے دانوں کے نام مرگ چھالیں بچھی ہوئیں، دروازوں پر کھاروے کے پٹاپٹی کے پردے پڑے ہوئے۔ فرش پر دری، دری پر براق سی چاندنی، چاندنی پر دائیں بائیں ایرانی قالین۔ دیواروں کے سہارے گول گول تکئے دھرے ہوئے، ان پر پھولدار غلاف چڑھے ہوئے۔ درمیان میں حقہ رکھا ہوا۔ ایک دو فالتو کلیاں۔ پان دان، پیک دان۔

لیجئے رات کے آٹھ بجنے لگے ہیں۔ محفل سجنے لگی ہے۔ کیسی کیسی شخصیت یہاں نظر آئے گی۔ نواب فیض احمد خاں، شمس العلما سید احمد امام جامع مسجد ان کے برادر خورد سید حامد بخاری، نواب سراج الدین احمد خاں سائل، نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں، شفاء الملک حکیم رضی الدین، لالہ جگل کشور وکیل، لالہ ہزاری مل جوہری۔ آنے والوں میں کوئی شاعر ہے، کوئی داستان گو ہے۔ کوئی مغنی ہے یا مغنیہ، کوئی امام مسجد ہے، کوئی جوہری، کوئی وکیل، البتہ کوئی سیاستدان اس محفل میں نظر نہیں آئے گا۔ یہ محفل شبانہ ہے۔ یہاں صرف اہل ذوق کے لئے گنجائش ہے۔ باقی کسی کے لئے

نہیں۔

رات بھیگنے لگی ہے۔ محفل میں رنگ آنے لگا ہے۔ منطق، فلسفہ، مسائل، فقہ، سب بحثیں ختم۔ اب شعر و شاعری ہو گی یا میر باقر علی داستان کا سحر پھونکیں گے یا موتی جان غزل سرا ہوں گی۔ اس دیوان خانے میں شاعری، موسیقی، داستان سرائی کے رنگ جم سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ حقہ اور پان کی تھالی گردش میں نظر آئے گی۔ چائے، قہوہ، میوے، مٹھائیاں۔ بس ایک شے کی ممانعت ہے۔ گردشِ جام کی۔ اسی باعث تو دو نامور معزز مہمانوں کو حکیم صاحب کے مہمان خانے سے حکیم بھورے میاں کے مہمان خانے میں منتقل ہونا پڑا تھا۔

سو صاحبو رات بھیگتی جا رہی ہے۔ محفل گرم ہے اور میر باقر علی کی داستان کا طلسم بندھا ہوا ہے۔ مگر یہ محفل دو بجے سے آگے نہیں چلے گی۔ ادھر قریب کھڑے گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن دو بجائے ادھر اہل ذوق نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ اور حکیم صاحب خاموشی سے دالان میں گئے، جالی کھولی اور ٹھنڈا کھانا نکال کر کھانا شروع کیا۔ باقی اور کوئی بھی سالن ہو، دال بہرحال ہو گی۔ ٹھنڈا کھانا کھایا اور سو رہے صبح سویرے اٹھنا ہے کہ نماز بھی پڑھنی ہے اور مطب بھی جلدی شروع کرنا ہے۔

تو مطلب یہ ہے کہ حکیم صاحب خالی حکیم نہیں تھے۔ ویسے طبیب دوراں تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس برصغیر میں یونانی طب کی جو روایت پروان چڑھی تھی وہ یہاں آ کر اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اب نئے زمانے کے ساتھ ایلوپیتھی نے پر پرزے نکال لئے تھے۔ مستقبل اس کا تھا۔ یونانی طب ڈوبتے سورج کی مثال نظر آ رہی تھی۔ حکیم صاحب نے بہت منصوبے بنائے کہ کسی طرح سے مغرب میں ہونے والی نئی طبی تحقیقات کو یونانی طب اور آیورویدک میں سمو لیا جائے اور ان دونوں طبوں میں نئی رُوح پھونکی جائے۔ زندگی وفا کرتی تو ممکن ہے کہ ایسی کوئی صورت نکلتی مگر وہاں تو زندگی ہی دغا دے گئی اور یونانی طب نئی ڈگر پر آتے آتے رہ گئی۔ اور حکیم اجمل خاں کی حیثیت کچھ غالب کی سی ہو گئی جہاں یوں ہوتا ہے کہ ایک پوری شعری روایت کو ایک پوری تہذیب کے بچے کھچے امکانات کو شاعر اپنے اندر سمیٹ کر ظاہر ہوتا ہے اور اس روایت کا حرف آخر بن جاتا ہے۔ یونانی طب کی روایت میں کچھ ایسا ہی مقام حکیم

اجمل خاں کا ہے۔

مگر پھر وہی بات کہ حکیم صاحب نرے حکیم نہیں تھے۔ یعنی آج کے متخصصین کی طرح نہیں تھے کہ اپنے میدان میں تو اتنا اونچے اڑے کہ آسمان کے تارے توڑ لائے۔ مگر یہ پتہ ہی نہیں کہ ان ستاروں سے آگے بھی آسمان ہیں۔ اپنے میدان میں بڑے ہیں۔ آگے قدم نکالا تو بالشتیے۔ مگر یونانی طب کی تو روایت ہی یہاں دوسرے طریقے سے چلی تھی۔ طبیب ایک طبیب کے سوا بھی بہت کچھ ہوتا تھا۔ مختلف علوم میں برابر کا درک۔ خلقت کا مرجع۔ اس طرح اس کی شخصیت میں ایک ہمہ جہتی پیدا ہو جاتی تھی۔ جب ہی تو یہ طبیب حکیم کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ اور اجمل خاں تو اپنے متقدمین سے بھی بڑھ کر ہمہ جہت نکلے۔ ان کے شوق کے دریچے کس کس طرف کھلتے تھے۔ قومی زندگی کے کتنے میدانوں میں وہ بیک وقت سرگرم عمل تھے۔ اصل میں ان کے انفرادی جوہر نے ایک تو یونانی طب کی اس ہمہ جہت روایت سے جلا پائی تھی اور اس خاندانی ماحول سے جو اس روایت میں رچا بسا تھا۔ پھر دلی کی اپنی روایت بھی تو تھی۔ وہ بھی اس ذات میں رچ بس کر اپنا اظہار کر رہی تھی۔ بقول سی ایف اینڈ ریوز جس پرانی دلی نے اپنی تہذیب و شائستگی کی روایات عظیم مغلوں سے حاصل کی تھیں اس دلی کے بچے کھچے رشتوں میں ایک حکیم اجمل خاں تھے۔ ان کے گزرنے کے ساتھ اس تہذیب کا ایک بڑا رشتہ گم ہو گیا۔ (۲۹)

قاعدے سے تو ہندوستان کے مسلمانوں کا رہنما کسی ایسی ہی شخصیت کو ہونا چاہیے تھا جس نے ہند اسلامی تہذیب کو بھی اپنے اندر سمیٹ رکھا ہو اور زمانے کے ساتھ قدم ملا کر بھی چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ تو ایسی شخصیت تو اس زمانے میں اجمل خاں ہی تھے۔ اور انہوں نے مسلمانوں کی اس وقت کی سیاست میں بیشک بڑا کردار ادا کیا۔ مگر وہ مقبول عام رہنما نہیں بن سکتے تھے۔ آخر کیوں؟ پہلے پروفیسر مجیب کی اس بات کو دھیان سے سن لیجئے کہ حکیم اجمل خاں کا معاملہ لال قلعہ کا سا تھا۔ جیسے لال قلعہ ہندوستانی مسلمانوں کے ڈومیسٹک آرکی ٹیکچر کی نمائندگی نہیں کرتا اسی طرح وہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کے عامتہ الناس کے ترجمان نہیں تھے۔ کتنے اعتبارات سے وہ ایک غیر معمولی شخصیت تھے مگر کسی بھی اعتبار سے دیکھیں وہ ہندوستانی مسلمانوں کی

بہترین تہذیبی روایتوں اور آدرشوں کا حاصل تھے۔ جو لوگ بلندی کردار اور شائستگی
میں ایمان رکھتے تھے وہ تو ان سے محبت اور ان کی عزت کرتے تھے۔ لیکن عام آدمی کو
یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس سے بہت دور ہیں۔ اس لئے کہ عام مسلمانوں کی جو
کمزوریاں تھیں ان میں وہ ان کے شریک نہیں تھے۔ اور نہ جذبات کی رو میں بہہ
جانے والے آدمی تھے۔ (۳۰) یوسف حسین خاں نے صحیح کہا کہ "مزاج کے لحاظ سے وہ
مولانا محمد علی کی ضد تھے۔ خاموش، متوازن، نہایت سنجیدہ اور متین۔" (۳۱)

تحریک خلافت نے ایک انتہائی جذباتی رویے کو جنم دیا تھا۔ یا شاید اس انتہائی
جذباتی رویے ہی نے تحریک خلافت کو جنم دیا تھا۔ پوری فضا "جان بیٹا خلافت پہ دے
دو" کے نعرے سے گونج رہی تھی۔ مگر جس شخص نے اپنے دیوان خانے میں بھی قہقہہ
نہ لگایا ہو اور اپنے مطب میں بیٹھ کر بھی اونچی آواز میں نہ بولا ہو وہ مجمع میں آ کر نعرہ
کیسے لگا سکتا تھا۔ نہ تو نعرہ لگا سکتا تھا نہ شعلہ فشاں تقریر کر سکتا تھا۔ یہ شور انگیزی
مولانا محمد علی کے حصے میں آئی تھی جو ان دنوں شعلہ جوالہ بنے ہوئے تھے۔ وہ ہندی
مسلمانوں کے جذبات کی بھرپور نمائندگی کر رہے تھے اور جائز طور پر ان کے قائداعظم
بنے ہوئے تھے۔ اجمل خاں مسلمانوں کی نمائندگی کسی دوسری سطح پر کر رہے تھے۔
ہندی مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تہذیبی تاریخ نے جس مزاج کی نشوونما کی تھی وہ اس
کے ترجمان تھے۔ اس مزاج کے زیر اثر وہ جذبات کے اس طوفان میں اعتدال کی
حدیں قائم کر رہے تھے۔ ان کا یہ کردار اس موقعہ سے بڑھ کر اس وقت زیادہ نمایاں
ہوا جب تحریک کا زور ٹوٹا اور اس کے نتیجہ میں ہندو مسلمانوں مین افتراق پیدا ہو گیا۔

اصل میں تحریک خلافت حکیم صاحب کے لئے اپنے جلو میں ایک بڑی کامیابی
بھی لے کر آئی اور اتنی ہی بڑی ناکامی بھی۔ ہندو مسلم اتحاد مین ان کا ایمان بقول
پروفیسر مجیب کسی پالیسی کسی مصلحت کا تقاضا نہیں تھا۔ یہ ان کے خون میں تھا۔ تو ہوا
کیا۔ تحریک خلافت ہی کے واسطے سے یہ خواب پروان چڑھا اور تحریک خلافت ہی کے
اثرات مابعد کے تحت وہ پارہ پارہ ہوا۔ کم از کم دلی کی حد تک جو ہندو مسلم اتحاد کا
مظاہرہ ہوا اور ذبیحہ گاؤ جس طرح نہ ہونے کی حد تک پہنچ گیا اسے تو حکیم صاحب کی
ذاتی کامیابی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس جذباتی فضا میں جب نعروں کے سوا کچھ سنائی نہ

دیتا تھا اس دھیمے لہجہ میں متانت سے بات کرنے والے شخص نے دلی کے مسلمانوں کو ذبیحہ گاؤ سے حتی الامکان اجتناب کا مشورہ دیا اور دلی والوں نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ مولانا محمد علی کی منطق یہ تھی کہ گائے کا گوشت سستا ہونے کی وجہ سے غریب غربا کی غذا ہے۔ بکری کا گوشت کسی صورت سستا ہو تو گائے کی جان چھوٹے۔ مگر دلی میں بکری کا گوشت سستا نہیں ہوا۔ پھر بھی غریب غربا نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا۔ نرائنی گپتا کے تحقیق کردہ اعداد و شمار کو دیکھو کہ ۱۹۱۹ء میں دلی میں ۲۵۰ گائیں ذبح ہوئی تھیں۔ ۱۹۲۰ء میں کل ۲۹ گائیں ذبح ہوئیں۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ تحریک خلافت ہی کا آوا بیٹھ گیا۔ اس وقت تو سارا ہندو مسلم اتحاد اسی تحریک کے دم سے تھا۔ تحریک ٹھنڈی ہوئی تو جوشِ اتحاد بھی ٹھنڈا ہوتا چلا گیا۔ اور صرف ٹھنڈا ہی نہیں ہوا۔ اس کے نتیجہ میں ایک اور ہی مورچہ گرم ہو گیا۔ اصل میں اس اتحاد نے دو گروہوں کو بیک وقت خوفزدہ کیا۔ انگریزوں کو اب اندازہ ہوا کہ ہندو مسلمان متحد ہو جائیں تو کتنی بڑی طاقت بن سکتے ہیں اور ان کے لئے کتنی مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر عجب ہوا کہ ہندو خود اس اتحاد سے ڈر گئے۔ ان کے اس نئے ڈر کا ایک تاریخی پس منظر تھا۔ آخر یہ تحریک خلافت کے نام پر چلی تھی۔ جس کا مرکز ترکی میں تھا۔ ساتھ ہی مسلمان رہنماؤں نے یہ منصوبے باندھنے شروع کر دیئے تھے کہ افغانستان اور ترکی کی مدد آزادی کی تحریک کے لئے حاصل کی جائے۔ ان کے ان ارادوں نے ہندوؤں کے اندر سوئے ہوئے اس تاریخی تجربے کو زندہ کر دیا کہ ان علاقوں سے اولوالعزم جنگجو نکلتے تھے اور ہندوستان پر حملہ آور ہوتے تھے۔ بس اس یاد کے ساتھ ان کے اندر وسوسے اور اندیشے پیدا ہوتے چلے گئے۔ لالہ لاجپت رائے نے اپنے مذکورہ خط میں سی آر داس کو یہی تو لکھا تھا کہ ''میں ہندوستان کے سات کڑور مسلمانوں سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ لیکن اگر ان سات کروڑ کے ساتھ افغانستان وسطی ایشیا، عرب، عراق اور ترکی کے مسلح لشکر بھی شامل ہو جائیں تو پھر ان کا مقابلہ مشکل ہوگا۔'' قسمت کی خوبی دیکھئے کہ ان اندیشوں میں گھرے ہوئے لالہ چپت رائے کا انہیں دنوں ترکی جانا نکل آیا۔ استنبول میں ان کی ملاقات مولانا عبیداللہ سندھی سے ہوئی۔ مولانا نے انہیں وہ منصوبہ جس پر وہ بہت کام کر چکے تھے بتایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ تحریک

آزادی کے لئے افغانستان کے راستے انڈین نیشنل کانگریس کو روسی مدد پہنچائی جائے افغانستان کے نام پر لالہ جپت رائے بھڑک اٹھے ظفر حسن ایبک کی روایت کے مطابق مولانا کا قیاس یہ تھا کہ لالہ جپت رائے نے ہندوستان جا کر اس کا ذکر مدن موہن مالویہ سے کیا جس سے ہندو مسلم تعلقات میں خرابی پیدا ہوتی چلی گئی۔ (۳۲)

اصل میں تحریک خلافت کے قائدین نے اپنی ساری دانائی کے باوجود دو عوامل کو بالکل نظر انداز کیا۔ ایک تو انہوں نے ترکی کے اندرونی معاملات اور مسائل کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ تو انہوں نے تاریخی پس منظر میں یہ سمجھنے کی کوئی کوشش کی کہ خلافت کا ادارہ صدیوں کے عمل میں کیا سے کیا بن چکا ہے نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ ترکی کے اندر معاملات کی کیا نوعیت ہے اور نئی سوچ موجودہ خلیفہ اور خود خلافت کے بارے میں کیا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ نوجوان ترکوں سے رابطہ کے باوجود انہیں یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ خلافت کے بارے میں ان کی کیا سوچ ہے۔ مثلاً عصمت انونو سے حکیم صاحب کی باقاعدہ خط و کتابت رہی ہے۔ (۳۳)

اندرون ملک مسلمان رہنماؤں نے ایک بڑی حقیقت کو فراموش کیا۔ وہ آزادی کے لئے ترکی اور افغانستان سے امداد حاصل کرنے کے خیالی پلاؤ پکاتے رہے اور ہندوؤں کے نفسیاتی مسئلہ کو انہوں نے سرے سے جانا ہی نہیں۔ ادھر یہ حضرات افغانستان اور ترکی سے امداد کے منصوبے بناتے رہے جس میں ان ملکوں کے ایما کو کم اور ان کی اپنی خوش فہمی کو زیادہ دخل تھا۔ ادھر وسوسے اور اندیشے تقویت پکڑتے چلے گئے جن سے نئے شگوفے پھوٹے۔ شدھی، سنگھٹن اور اس کے جواب میں تبلیغ کی مہم۔

ان دونوں معاملات مین دو مسلمان رہنماؤں کا رویہ عمومی رویے سے مختلف نظر آتا ہے۔ اول الذکر معاملہ میں زیادہ واضح رویہ محمد علی جناح کا تھا جنہوں نے پہلے ہی مرحلہ میں خلافتی رہنماؤں سے اختلاف کیا اور تحریک میں شامل ہونے سے انکار کردیا۔ پھر وہ ترکی اور افغانستان سے امداد حاصل کرنے کے خیالی پلاؤ پکانے والوں کی ہمنوائی کرتے بھی نظر نہیں آتے۔ ہندو مسلم مناقشات رونما ہونے پر بھی ان کا ردِ عمل مولانا محمد علی شوکت علی کے جذباتی رد عمل سے مختلف نظر آتا ہے۔

حکیم صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ تحریک خلافت مین وہ بہت جوش سے شامل ہوئے۔ لیکن جب ترکوں نے خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر ڈالا تو ان کا رویہ اس جذباتی رویے سے مختلف نظر آتا ہے جس کا مظاہرہ علی برداران نے کیا۔ انہوں نے نہ تو مصطفیٰ کمال پاشا کو ملحد اور بے دین کہا نہ نئی حکومت کی مذمت پر آمادہ ہوئے۔ مولانا محمد علی کے رویے کے برخلاف ان کا موقف یہ تھا کہ ترکی کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے احتراز کیا جائے۔ ہاں ایک وفد بھیجا جائے جو وہاں جا کر ترکی کے حالات کا مطالعہ کرے۔ نئے رہنماؤں کے نقطہ نظر کو معلوم کرے اور اپنا نقطہ نظر انہیں سمجھانے کی کوشش کرے۔

ہندو مسلم اختلافات رونما ہونے پر بھی ان کا رویہ دوسرے مسلم رہنماؤں سے جو جذبات کی رو میں بہہ رہے تھے مختلف نظر آتا ہے۔ عمومی صورتِ حال تو یہ تھی کہ ادھر سے ڈاکٹر مونجے نے ڈنڈے کی بات کی تو ادھر سے مولانا ظفر علی خاں ڈنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔ ادھر مدن موہن مالویہ اور ایسے دوسروں نے الٹی سیدھی کی تو ادھر سے مولانا محمد علی نے اعلان کیا کہ جو تم ہم سے سیدھم سادھم سودھم تو ہم بھی تم سے سیدھم سادھم اور سودم اور جو تم ہم سے ٹینکر، ٹانکر تو ہم بھی تم سے۔

تو یہ تھی اس وقت کی فضا۔ اینٹ کا جواب اینٹ سے، پتھر کا جواب پتھر سے۔ مگر اس رنگ سے جواب اجمل خان نہیں دے سکتے تھے۔ پھر کیا کیا جائے۔ یہی ان کا مسئلہ تھا۔ ۱۹۲۶ء کا سال تھا۔ ہندو مسلمانوں میں بہت تناتنی تھی۔ فساد آج یہاں کل وہاں۔ خلافت کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ حکیم صاحب نے ایک عجب سوال اٹھایا۔ اگر ہندوؤں کی طرف سے زیادتی ہو تو کیا کیا جائے۔ خاموشی سے برداشت کیا جائے یا جواب دیا جائے۔ یہ سوال حکیم اجمل خاں ہی کر سکتے تھے۔ یہ ایک تذبذب مین مبتلا روح کا سوال ہے۔ بلکہ اس پردے میں پوری ایک تہذیب بول رہی ہے، وہ تہذیب جس نے رواداری اور تہذیبی میل جول سے رس اور جس حاصل کیا تھا۔ یہ تہذیب اس شخص کے اندر سانس لے رہی تھی۔ "اس شخص کا مذہب، اس کا کلچر سیاسی منڈی کا مال نہیں تھے۔ ہندو مسلم اتحاد میں اس کا ایمان کسی پالیسی کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ اس کی گھٹی مین تھا۔ اس کے خون مین تھا۔ جب اس نے ان دو گروہوں کو ایک دوسرے سے دُور

ہوتے دیکھا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ شخص اتنا حساس تھا کہ ایسے لوگوں کے درمیان زیادہ دن گزارہ نہیں کر سکتا تھا۔" (۳۴)

سو اس نے رخت سفر باندھا۔ ادھر گوہاٹی میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ کانگریس کے رہنماؤں کا رُخ اس طرف تھا۔ مگر کانگریس کا یہ مایوس رہنما، یہ تھکا ہوا شخص کسی اور سفر پر جا رہا تھا۔ جاتے جاتے اس نے کانگریس کو پیغام بھیجا۔ "اگر کانگریس ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوئی راہ نہیں نکال سکتی تو میں آپ لوگوں سے صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ کے سارے پروگرام خواہ کتنے ہی اچھے ہوں، بے سود ہیں۔"

یہ پیغام گوہاٹی بھیجا۔ خود رامپور کی راہ لی۔ پھر سب سے منہ موڑا اور دنیا سے سدھار گیا۔

حواشی

۱۔ سیر دہلی کی معلومات۔ صفحہ ۱۵
۲۔ تذکرہ مسیح الملک (بیان حکیم فرید احمد عباسی) صفحہ ۹۳
۳۔ تذکرہ مسیح الملک (بیان حکیم فرید احمد عباسی) صفحہ ۹۱
۴۔ حیات اجمل، مرتبہ حکیم رشید احمد خاں صفحہ ۱۴۳
۵۔ حیات اجمل، مرتبہ حکیم رشید احمد خاں صفحہ ۴۰۔۱۳۸
۶۔ ہندوستان کے مشہور اطبا، مرتبہ حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن صفحہ ۱۲۸
۷۔ تذکرہ مسیح الملک، مرتبہ محمد حسن قرشی صفحہ ۱۰۸
۸۔ تذکرہ مسیح الملک، مرتبہ محمد حسن قرشی صفحہ ۹۵
۹۔ تذکرہ مسیح الملک (بیان حکیم سید ظفریاب علی) صفحہ ۹۵
۱۰۔ حیات اجمل، مرتبہ قاضی عبدالغفار صفحہ ۵۲۷
۱۱۔ تذکرہ مسیح الملک صفحہ ۴۷
۱۲۔ بروایت کلب علی خاں فائق۔
۱۳۔ بیان بیگم حکیم محمد نبی خاں۔

۱۴- حیات اجمل، مرتبہ حکیم عبدالرشید خاں صفحہ ۳۸
۱۵- حیات اجمل، مرتبہ حکیم عبدالرشید خان صفحہ ۳۹-
۱۶- حیات اجمل، مرتبہ حکیم رشید احمد خان صفحہ ۴۰
۱۷- حیات اجمل، مرتبہ حکیم رشید احمد خاں صفحہ ۳۴
۱۸- حیات اجمل، مرتبہ حکیم رشید احمد خاں صفحہ ۳۴
۱۹- حیات اجمل، مرتبہ حکیم رشید احمد خاں صفحہ ۳۴
۲۰- انڈین مسلمز- صفحہ ۵۳۶
۲۱- بحوالہ یادوں کی دنیا- از یوسف حسین خاں صفحہ ۸۵
۲۲- یہ مقالہ دہلی تھرو دی ایجز" مرتبہ فرائیکن برگ میں شامل ہے-
۲۳- دہلی تھرو دی ایجز- صفحہ ۱۸۷
۲۴- خم خانہ جاوید، از لالہ سری رام- جلد پنجم صفحہ ۱۴۰
۲۵- بروایت حکیم محمد نبی خاں-
۲۶- بروایت حکیم محمد نبی خاں-
۲۷- فرہنگ آصفیہ (جلد اول) صفحہ ۴۳
۲۸- حکیم محمد نبی خاں کا بیان-
۲۹- ذکاء اللہ آف دہلی از سی ایف اینڈریوز صفحہ ۴۵
۳۰- انڈین مسلمز" پروفیسر مجیب-
۳۱- یادوں کی دنیا، یوسف حسین خاں صفحہ ۸۲-
۳۲- خاطرات (آپ بیتی) از ظفر الحسن ایبک صفحہ ۲۸۷
۳۳- ان خطوط کے بارے میں میرے استفسار پر حکیم محمد نبی خاں نے بتایا کہ یہ خطوط حکیم صاحب کے دوسرے کاغذات کے ساتھ قاضی عبدالغفار کو دے دیئے گئے تھے- ان کی غفلت سے جہاں دوسرے کاغذات ضائع ہوئے یہ خطوط بھی ضائع ہوگئے-
۳۴- انڈین مسلمز" پروفیسر مجیب

کتابیات

۱۔ عودِ ہندی (غالب) — مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل

۲۔ اُردوئے معلّٰی (غالب) — مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل

۳۔ دستنبو (غالب) — ترجمہ مخمور سعیدی بحوالہ پروفیسر معین الرحمٰن

۴۔ آثار الصنادید — تصنیف سر سید احمد خاں

۵۔ تذکرہ اہل دہلی — تصنیف سر سید احمد خاں

۶۔ واقعات دارالحکومت دہلی — بشیرالدین احمد

۷۔ یادگارِ دلی — سید احمد ولی اللہی

۸۔ میرے زمانے کی دلی — ملا واحدی

۹۔ سیر دہلی — خواجہ حسن نظامی

۱۰۔ یہ دلی ہے — یوسف بخاری

۱۱۔ داستان غدر — ظہیر دہلوی

۱۲۔ بزمِ آخر — منشی فیض الدین

۱۳۔ بزمِ رفتگان — علامہ راشد الخیری

۱۴۔ مضامین فراق — فراق دہلوی

۱۵۔ مقاماتِ ناصری — تصنیف میر ناصر علی

۱۶۔ مضامین فرحت — تصنیف مرزا فرحت اللہ بیگ

۱۷۔ دلی کی سزا — تصنیف غلام حسین

۱۸۔ کلیاتِ نثرحالی — مرتبہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی

۱۹۔ حیاتِ شبلی — تصنیف سید سلیمان

۲۰- باقیاتِ شبلی — مرتبہ

۲۱- مولوی نذیر احمد احوال و آثار — تصنیف ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

۲۲- حیات النذیر — تصنیف افتخار عالم مارہروی

۲۳- گنجینہ گوہر — تصنیف شاہد احمد دہلوی

۲۴- بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد — تصنیف رئیس احمد جعفری

۲۵- اخبار الصنادید — تصنیف نجم الغنی

۲۶- مکاتیب اقبال (بنام گرامی) — مرتبہ عبداللہ قریشی

۲۷- گفتار اقبال — مرتبہ عبداللہ قریشی

۲۸- ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں — تصنیف ڈاکٹر عابد حسین

۲۹- مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی — تصنیف محمد مرزا دہلوی

۳۰- مسلمانوں کا روشن مستقبل — تصنیف محمد طفیل احمد منگوری

۳۱- سیاست ملیہ — تصنیف محمد امین زبیری

۳۲- تذکرہ علمائے ہند — تصنیف مولوی رحمٰن علی

۳۳- نقش حیات — تصنیف مولانا حسین احمد مدنی

۳۴- کابل میں سات سال — تصنیف، مولانا عبداللہ سندھی

۳۵- آپ بیتی — تصنیف ظفر الحسن ایبک

۳۶- خاطرات (ظفر الحسن ایبک کی آپ بیتی) — مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

۳۷- تاریخ کانگریس — تصنیف، ڈاکٹر ستیار میہ

۳۸- تحریک خلافت — تصنیف قاضی محمد عدیل عباسی

۳۹- مضامین محمد علی — مرتبہ پروفیسر محمد سرور

۴۰- محمد علی (ذاتی ڈائری کے چند ورق) — تصنیف، مولانا عبدالماجد دریابادی

۴۱- علی برادران — مرتبہ، رئیس احمد جعفری

۴۲- اوراق گم گشتہ — دو،

۴۲- مارشل لا سے مارشل لا تک — تصنیف، میر نور احمد

۴۴۔ شاہرہ پاکستان — تصنیف چوہدری خلیق الزماں
۴۵۔ اطبائے عہد مغلیہ — تصنیف حکیم علی کوثر چاند پوری
۴۶۔ ہندوستان کے مشہور اطبا — تصنیف حکیم حافظ حبیب الرحمٰن
۴۷۔ سیرت اجمل — مرتبہ ہندوستانی دواخانہ دہلی
۴۸۔ تذکرہ مسیح الملک — تصنیف حکیم محمد حسن قریشی
۴۹۔ حیاتِ اجمل — تصنیف حکیم رشید احمد خاں
۵۰۔ حیاتِ اجمل — تصنیف قاضی عبدالغفار
۵۱۔ فرہنگ آصفیہ — مرتبہ، سید احمد دہلوی
۵۲۔ خم خانۂ جاوید — تصنیف، لالہ سری رام
۵۳۔ یادوں کی دنیا — تصنیف، یوسف حسین خاں

رسائل و اخبارات

۱۔ کرزن گزٹ کے مختلف شمارے
۲۔ دلی کالج میگزین کا دلی نمبر
۳۔ ساقی کراچی کا شاہد احمد دہلوی نمبر
۴۔ رسالہ جامعہ دہلی (ماہ جنوری ۱۹۴۷ء)
۵۔ رسالہ گفتگو، بمبئی (جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۸ء
۶۔ برہان دہلی (جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۴۹ء)
۷۔ خیال لاہور کا سن ستاون نمبر
۸۔ مشیر الاطبا، لاہور کا مسیح الملک نمبر

شخصیات

۱۔ منی بیگم (حکیم اجمل خاں کی سالی کی بیٹی)
۲۔ حکیم محمد نبی خان جمال سویدا
۳۔ مولانا ابو الخیر مودودی
۴۔ کلب علی خاں فائق
۵۔ ملا واحدی
۶۔ بیگم حکیم محمد نبی خان

Bibliography (English)

1. Mahabharata (Adi Parab)
   English translation by Pratab Chand Roy
2. Delhi, A Historical Sketch
   Percival Spear
3. Zakaullah of Delhi
   C.F. Andrews
4. Indian Muslims
   Prof. Mohammad Mujeeb
5. Indian Muslims
   Ram Gopal
6. Rise and Growth of Congress in India
   C.F. Andrews and Gurya Mukerji
7. Sixty Years of Congress
   Satyapal & Probadh Mukerji
8. Mahatma Gandhi, His own Story
   Edited by C.F. Andrews
9. Mahatma Gandhi's Ideas
   C.F. Andrews
10. At the feet of Mahatma Gandhi
    Dr. Rajendra Prashad
11. Autobiography
    Dr. Rajendra Prashad
12. Reflections and Ramblings
    W.H. Saleeman
13. Foundations of Pakistan
    Compiled by Pirzada Sharifuddin

14. Pathway to Pakistan
Ch. Kaaliquzzaman
15. Life and Times of Mohammad Ali
Afzal Iqbal
16. Writings and Speeches of Mohammad Ali
Compiled by Afzal Iqbal
17. Delhi Through the Ages
Compiled by Friakenburg
18. Hakim Ajmal Khan
Żafar Ahmad Nizami
19. Delhi, Between two Empires
Narayani Gupta
20. Imperial Coronation Darbar
(2nd Vol)
Govt. of India's Publication

کتاب	مصنف
قائد اعظم (بے مثال شخصیت درخشاں کردار کی جھلکیاں)	تحقیق و ترتیب سلیم چودھری
ہمارے قائد اعظم (بانی پاکستان محمد علی جناح)	اعجاز احمد
قیام پاکستان کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر	سمیع اللہ قریشی
قائد اعظم کی شگفتہ مزاجی اور طنز و مزاح	سمیع اللہ قریشی
پاکستان کی سیاسی جماعتیں	پروفیسر محمد عثمان / مسعود اشعر
اکابرین تحریک پاکستان	محمد علی چراغ
مطالعہ پاکستان	محمد علی چراغ
قائد اعظم کے مہ و سال	محمد علی چراغ
پاکستان منزل بہ منزل	محمد علی چراغ
قرار داد پاکستان ایک مطالعہ	محمد علی چراغ
پاکستان - تاریخ - جمہوریت - سیاست - آئین	محمد علی چراغ
تاریخ پاکستان	محمد علی چراغ
پاکستان کا آئین (تعارف و تجزیہ)	احمد شجاع پاشا
تاریخ پاکستان (قدیم عہد)	یحیٰی امجد
تاریخ پاکستان (وسطی دور)	یحیٰی امجد
قائد اعظم محمد علی جناح معمار پاکستان	سجاد باقر رضوی
قائد اعظم کے ابتدائی حالات	انتظار حسین
پاکستان جمہوریت اور انتخابات	اسد سلیم شیخ
پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں	ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی
پاکستانی مسلمانوں کے رسم و رواج	شاہد حسین رزاقی
پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء - ۱۴ اگست ۱۹۹۷	رضی الدین رضی / شاکر حسین شاکر
مفکر پاکستان	محمد حنیف شاہد
ارض پاکستان کی تاریخ	رشید اختر ندوی

RS: 225.00

www.sang-e-meel.com